
NOVEMBER
2016
ماڈل: نینا بتول
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی: موسیٰ رضا

# ردا ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ
ردا ڈائجسٹ
۱۳۱-ڈی-بلاک ۲
پی ای سی ایچ ایس
کراچی





# مستقل سلسلے


| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ردائے جنت | صالحہ محمود | ۷ | سندیسے | صالحہ محمود | ۲۴۸ |
| ردا کی ڈائری | صدف سعد | ۲۳۵ | کچن | ثریا اقبال | ۲۵۴ |
| ذرا پھر سے کہنا | شہلا مشائق | ۲۴۵ | سنگھار | شہلا مشائق | ۲۵۷ |
| خوشبو | نورین ملک | ۲۴۲ | اشعار | نورین ملک | ۲۳۷ |
| اس ماہ میں | نورین ملک | ۲۳۹ | دوستوں کے نام پیغام | ادارہ | ۲۵۲ |




# گوشہ

ہر چشم گریاں منتظر ہے بہار موسم کی، جہاں پھول کھلے ہوں اور موسم کی کوئی بھیگی ہوئی رُت آئے اور زمین پر یوں برس جائے کہ محبتوں کے چشمے پھوٹ پڑیں۔ سایہ محبت کے تناور درختوں کے نیچے آنے والی فصل سایۂ شجر میں آباد رہے۔ خواب دیکھنا ایک اچھی عادت ہے اچھے خواب مجھے ہمیشہ نظر آتے ہیں۔ برے خواب شیطان کی علامت لیکن بلانا گہانی کو آپ ٹال بھی نہیں سکتے۔ اچھا سوچیے اچھا ہوگا۔ ہمیشہ خوش اور آباد رہنے کے لیے کینہ پروری اور حسد کو نکالنا ہوگا۔ سایۂ شجر کی آبیاری میں دور تک محبتوں کے پھول کھلتے ہیں جب ہم کسی کو کچھ دیتے ہیں تو واپسی پر ہم بھی خالی ہاتھ نہیں ہوتے۔ یہاں سوال پوری زندگی کا ہے۔ جس نے ہمیں آغوش مدرسے اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا اور ہم سایۂ شجر میں آباد ہو گئے۔ انسان کو بھی تو زادِ سفر کے لیے کچھ دینا پڑے گا تو ہمارے ساتھ بھی زادِ سفر ساتھ ہوگا۔ اللہ کی ذات بے نیاز ہے بلاشبہ انسان بندہ بشر ہے۔ ہم کچھ نہیں پھر بھی سانس لیتے ہیں۔ سانس لینے کا حق تو ادا کرنا پڑے گا۔ یعنی رب باری تعالیٰ کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ زندگی کا مقصد یہی یاد رکھنا ہے۔ انسان بلا تکلف انسان کی غیر موجودگی میں پیٹھ پیچھے جسے ڈسکیشن کہتے ہیں وہ غیبت ہے۔ غیبت ہمارے سارے اچھے عمل کا ایک ایسا جزو ہے جس سے بھائی کے گوشت کی بو آتی ہے۔

”اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے کہ انسان بدگوئی پر زبان نہ کھولے الا یہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔“ (النساء: 148)

غیبت انسانی خوبیوں کی عمارت کو معدوم کر دیتی ہے اور اخلاق کے سارے سوتوں کو خشک کر دیتی ہے۔ معاشرے کے ہولناک اثرات میں یہ بھی ہے کہ افراد میں باہم بغض اور عداوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور ہم پھر طبقات میں بٹ کر خود مسلمان ایک دوسرے کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ یہ تربیت ہمارے ماحول ہمارے ارد گرد بسنے والے دیتے ہیں لیکن باکردار باصلاحیت ایک بچی جب ماں کے روپ میں آتی ہے تو اس کو اپنی پرورش میں سے اس چیز کو نکال دینا چاہیے چھوٹی چھوٹی باتیں اگر گرہ میں باندھ لی جائیں تو آنے والے وقت میں ہم ایک اچھے معاشرے کو جنم دے سکتے ہیں اور پھر سایۂ شجر میں بسنے والے کبھی دھوپ میں نہ جلیں گے۔

بس یہی ایک چھوٹی سی بات تھی جو میں آپ سے شیئر کر چلی۔ نفرت کو جنم نہ دیں بچوں سے گلے شکوے ماں باپ بہن بھائیوں کے نہ لے کر بیٹھیں ان کے ذہنوں پر اچھے اثرات چھوڑیں یہ میرا بھی ایک عمل تھا سو میں ذکر کر چلی۔

نئے لکھنے والے تعاون جاری رکھیں، ہم انہیں ایک موقع ضرور دیتے ہیں۔ ردا کے ساتھ رہیے سندیسہ ضرور لکھیے۔ ہماری رہنمائی کا ذریعہ آپ کا سندیسہ۔

آپی

صالحہ محمود

# ردائے شرم

''یقیناً! مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں، مطیع فرمان مرد اور مطیع فرمان عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، اللہ کے آگے جھکنے والے مرد اور اللہ کے آگے جھکنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔''

(سورۃ الاحزاب آیت نمبر 35)

''اور ان عورتوں کے ساتھ حسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی گزارو اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم کوئی چیز ناپسند کرو اور اللہ اس میں خیر کثیر رکھ دے۔'' (النساء: 91)

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:
''عورتوں کو ان کا حقِ مہر خوشی سے ادا کرو اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ حصہ تمہیں معاف کردیں تو اس کو خوشی اور مزے سے کھاؤ۔''
(النساء: 4)

عورت کا نان ونفقہ ہر حالت میں مرد کے ذمہ ہے۔ اگر بیٹی ہے تو باپ کے ذمہ۔ بہن ہے تو بھائی کے ذمہ، بیوی ہے تو شوہر پر اس کا نان ونفقہ واجب کردیا گیا اور اگر ماں ہے تو اس کے اخراجات اس کے بیٹے کے ذمہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ خوشحال آدمی اپنی استطاعت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی توفیق کے مطابق معروف طریقے سے نفقہ دے۔'' (سورۃ البقرہ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دنیا کل کی کل مال ومتاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔'' (سنن النسائی)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
''جو عورت پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہو، ماہ رمضان کے روزے رکھتی ہو، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرتی ہو اور اپنے شوہر کی اطاعت کرتی ہو، اس سے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہو جنت میں داخل ہو جاؤ۔''
(رواہ احمد)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ بہترین عورت کون سی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ عورت جب اس کا خاوند اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کردے اور جب

شوہر اس کو کوئی حکم کرے تو وہ اس کو بجا لائے اور اپنی ذات اور اپنے مال میں اس کے خلاف کوئی ایسی بات نہ کرے جس کو وہ پسند نہ کرتا ہو۔" (سنن النسائی)

حکیم بن معاویہ قشیری اپنے والد سے نقل کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے کسی کی بیوی کا اس کے شوہر پر کیا حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ کہ جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، جب تم پہنو تو اس کو بھی پہناؤ اور اس کے چہرے پر مت مارو، نہ اس کو برا کہو اور نہ یہ کہو کہ اللہ تیرا برا کرے اور اس سے صرف گھر کے اندر ہی علیحدگی اختیار کرو۔" (مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عورتوں کے حق میں بھلائی کی وصیت قبول کرو، اس لیے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، جو ٹیڑھی ہے اور سب سے زیادہ ٹیڑھا پن اس پسلی میں ہے جو اوپر کی ہے۔ لہٰذا اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اس کو توڑ دو گے اور اگر پسلی کو اپنے حال پر چھوڑ دو تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے گی۔ اس لیے عورتوں کے حق میں بھلائی کی وصیت قبول کرو۔" (الجامع للالبانی)

حضرت ابوہریرہؓ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس شخص کے نکاح میں دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل و برابری نہ کرتا ہو تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ ساقط ہوگا۔" (مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن زمعہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی شخص اپنی بیوی کو غلام کی طرح نہ مارے۔" (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی ان کو تعلیم تربیت دی، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ (بعد میں بھی) حسنِ سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔" (ابوداؤد)

بیویوں کے حقوق کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: "لوگو! عورتوں کے بارے میں میری وصیت قبول کرو وہ تمہاری زیرِ نگین ہیں تم نے ان کو اللہ کے عہد پر اپنی رفاقت میں لیا ہے اور ان کے جسموں کو اللہ ہی کے قانون کے تحت اپنے تصرف میں لیا ہے تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ گھر میں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کا آنا تمہیں ناگوار ہے اگر ایسا کریں تو تم ان کو ہلکی مار مار سکتے ہو اور تم پر ان کو کھانا کھلانا اور پلانا فرض ہے۔" (صحیح مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے بہترین ثابت ہو اور خود میں اپنے اہل و عیال کے لیے تم سب سے بہتر ہو۔" (مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس شخص کی لڑکی ہو وہ نہ تو اسے زندہ درگور کرے اور نہ اس کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔" (ابوداؤد)

عورت کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے مشورہ نہ لیا جائے اور کنواری عورت کا نکاح بھی اس کی اجازت حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے۔ (مشکوٰۃ)

......☆......

شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلے وار ناول

قسط نمبر 5

# زندگی پھول، محبت خوشبو

"ہاں یہ تو میں بھی سوچتی ہوں۔" رمضہ نے بھی تائیدی کہا۔ رمضہ نے جان کے امی کو نہیں بتایا اسپتال میں اس نے کسی لڑکے کو دیکھا تھا جو شہریل سے مل رہا تھا، بچپن اور جوانی کے خدوخال پھر بھی مل ہی جاتے ہیں



انسان بدلتا ضرور ہے مگر کچھ نقوش ویسے ہی رہتے ہیں۔ جیسے شہزیل بھائی کی کھڑی ناک تھی اور آنکھوں میں ایک چمک تھی وہ سب کچھ اس نے اس انسان میں دیکھا تھا۔

''اچھا آپ اتنی اداس نا ہوں۔'' رمضہ نے خود ہی ان کی اداسی کو ختم کرنے کو کہا۔

''ایسا کرو تم سو جاؤ پھر صبح جانا ہوگا۔''

''جی سو جاؤں گی، آپ بھی پریشان اور اداس ہونا چھوڑیں، میں بھی شہزیل بھائی کی طرح ہوں آپ سب کا خیال رکھنے والی۔''

''اگر وہ ہمارا خیال کرتا تو ایسے جاتا؟''

''امی بچپن کا دور نا سمجھی کا دور ہوتا ہے، وقتی جذباتیت ہوتی ہے، مجھے یقین ہے وہ بھی ہمیں یاد کرتے ہوں گے۔''

''پتہ نہیں۔''



امی گھٹنے پر ہاتھ رکھ کے کھڑی ہو گئیں۔ رمشہ بھی تکیہ سیدھا کر کے بیٹھ گئی۔ ابو نے وہ مکان بیچ دیا تھا، انہیں دکان کرنی تھی، چھوٹا سا مکان خرید لیا تھا اور ایک دکان بھی تھی جو ابو کی بیماری کے بعد سے بند ہی پڑی تھی۔

رمشہ نے بھی سوچ لیا تھا وہ بھی اپنے بھائی کو ڈھونڈے گی۔

''مگر کیسے، کوئی اتا پتا ہو تو ڈھونڈے۔''

پھر خود ہی مایوس بھی ہو گئی۔

دل اندر سے کہہ رہا تھا کاش وہ شخص اس کا بھائی ہوتا۔

''کاش کاش.....'' آنکھیں بند کر کے وہ تصور ہی کئے جا رہی تھی۔

☆......☆

حنین کو بے چینی تھی کہ آریکہ کے رشتے والے آئے تھے، آخر معاملہ کہاں تک پہنچا مگر امی سے پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''بھائی آپ کی جاب کیسی ہے؟'' حسن نے سیل پر گیم کھیلتے ہوئے پوچھا۔

''اچھی ہے، میرے مطلب کا کام ہے، سارا کام گرافک کا ہے جو میں آسانی سے کر لیتا ہوں یہ تو تم جانتے ہو۔''

''بھائی آپ کی سیلری ملے گی تو میں دو سوٹ لوں گی۔'' حرا کو بھی اپنی فرمائش یاد آئی۔

''ہر وقت سوٹ کپڑے جوتے......اسی کی پڑی رہتی ہے۔'' امی نے اسے ڈپٹ کے ہی کہا۔

''ارے امی لڑکیوں کا شوق ہی یہ ہوتا ہے، پھر ہماری تو بہن بھی ایک ہی ہے جو بھی اس کے لئے کریں کم ہے۔'' حنین نے پیار بھری نظروں کے حصار میں حرا کو لیا جو منہ بسورے ہوئے تھی امی کی ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ سے۔

''ہاں ایک ہے، سر پر بٹھا لو لڑکیوں کو پرائے گھر جانا ہوتا ہے۔''

''یہ خوب ہے ڈرامے دیکھو یا فلمیں لڑکیوں کو کہا جاتا ہے پرائے گھر جانا ہوتا ہے اور جب وہ پرائے گھر چلی جاتی ہے وہاں جا کے بھی وہ پرایا گھر اسے اپنا نہیں بناتا، ساس نندیں، ان کا ہولڈ، لڑکی اپنا گھر کہے تو کسے کہے۔'' حرا نے بھی جل کہا۔

حسن اور حنین کی ہنسی چھوٹ گئی، امی کی خشمگیں نگاہوں نے اسے خاصی ناگواری سے دیکھا تھا۔

''مجھے نہیں جانا پرائے گھر، مجھے یہیں اسی اپنے گھر میں رہنا ہے۔''

''کیسی زبان چل رہی ہے، وہ بھی بھائیوں کے سامنے۔ ذرا لحاظ شرم نہیں ہے۔''

''ارے امی ابھی بچی ہے، سنبھل جائے گی۔''

''میٹرک میں ہے، اتنی بھی بچی نہیں ہے، آج اتنی زبان چل رہی ہے، کل کو تو یہ ہم سب پر چڑھ کے بولے گی۔ اسی طرح ہی لڑکیاں بدلحاظ اور بے شرم ہو جاتی ہیں، چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں رہتی۔''

امی کو ہر وقت اپنے بچوں کی اچھی تربیت کی بھی فکر رہتی تھی اور یہ سچ تھا انہوں نے شوہر کی وفات کے بعد اپنے بچوں کی اچھی ہی تربیت کی تھی۔

''سوری امی۔''

حرا کو بھی شاید اپنے لہجے اور باتوں کا اندازہ ہو گیا تھا، وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے لگی۔

"دیکھیں یہ ہے آپ کی اچھی تربیت ہے کہ اس نے فوراً آپ سے سوری بھی کر لی۔"
حنین کو حرا بہت پیاری لگی جو امی سے معافی مانگ رہی تھی۔
"بیٹا! بیٹیوں کو بہت سنبھال کے رکھنا پڑتا ہے اگر ان کی یہی زبان کھل جائے تو ان میں غرور اور انا آجاتی ہے۔غرور اور انا ہمیشہ انسان کو رسوا ہی کرواتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کوئی میری بیٹی کو برے القاب سے یا بری باتوں سے بھی نوازے، اتنی زبان دراز ہے یا منہ پھٹ ہے، اسے ہی دیکھ لو، آریکہ کو، ثمرہ کو، کتنی تحمل مزاج بچیاں ہیں، کبھی جو میں نے ان دونوں کی اونچی آواز بھی سنی ہو۔" امی نے آریکہ اور ثمرہ کی تعریفیں شروع کر دی تھیں۔
اور یہ سچ بھی تھا دونوں ہی ادب و لحاظ والی لڑکیاں تھیں۔
"امی! آریکہ باجی کے رشتے کا کیا بنا؟"
حرا کو ایک دم ہی یاد آیا، حنین کے کان کھڑے ہو گئے۔
"ابھی بات چل ہی رہی ہے۔" انہوں نے بتایا۔
حنین نے پہلو بدلا، نگاہ اس کی ٹی وی اسکرین پر تھی مگر اندر کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔
"آریکہ باجی کو پسند تو کر گئے ہیں۔"
"ہاں پسند تو کر گئے ہیں مگر دس معاملے ہوتے ہیں وہ دیکھتے ہیں لڑکے والے۔" انہوں نے بتایا۔
حسن کی نگاہوں کا زاویہ حنین پر فٹ ہو گیا، وہ جیسے کچھ الجھا ہوا ہو، حسن نے مسکراہٹ لئے اسے پھر دیکھا تھا۔

☆......☆

فہر کی بھی کوششیں رنگ لائی تھیں اور وہ کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ نیل فر نے کال جانے کس احساس میں ریسیو کر لی تھی۔
"تم کیا سمجھ رہی تھیں مجھ سے پیچھا چھڑا لو گی۔"
"آخر آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔" وہ جھنجلائی کھسیانی بے زاری بول رہی تھی۔
"اس لئے کہ مجھے ایک لڑکی پہلی اور آخری دفعہ پسند آئی ہے، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" فہر کے لہجے میں معنی خیزی اور شوخی تھی۔
"دیکھئے موصوف میں ایسی باتیں بالکل پسند نہیں کرتی ہوں، آپ اپنے معیار کی لڑکی تلاش کریں کیونکہ میں کسی بھی لڑکے کو نہ پسند کرتی ہوں اور نہ کروں گی۔" آواز میں مضبوطی اور یقین تھا۔
"رہنے دیں یہ بات تو، رہی میرے معیار کی تو وہ تو تم ہو، تم چاہے اکڑ دو یا انکار کرو تمہارے علاوہ کوئی نہیں، سیدھی طرح مجھ سے مل لو۔" وہ رعب اور دھونس سے بولا۔
"شٹ اپ۔" نیل فر دھاڑی۔
"دیکھ لو پھر، میں ڈائریکٹ تمہارے ماموں سے بھی بات کر سکتا ہوں۔"
"کیوں آپ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" وہ روہانسی ہو گئی، اتنے دنوں بعد اس نے سم سیل میں لگائی تھی، شکیل احمد کا اس سے رابطہ جو نہیں ہو رہا تھا اور پھر آج کل نمبر کا پتہ لگانا کون سا مشکل کام تھا، یہ دوسری سم لگائے گی وہ نمبر بھی حاصل کر لے گا۔

''میں پیچھے نہیں پڑا ہوں، صرف مل کے بات کرنا چاہتا ہوں، سیدھے طریقے سے اپنا رشتہ بھیجوں گا، بس ڈیٹ اٹ۔''

''میں ایک ڈرائیور کی بھانجی ہوں پھر بھی؟'' نیل فر نے حیرانگی سے کہا۔

''بھانجی ہو، کوئی گناہ نہیں۔''

فہر کے لہجے میں اطمینان تھا۔ نیل فر اسے کیسے بتائے وہ اس کے ماموں کی بیٹی ہے اور وہ یہ سب شاید ساری زندگی کسی کو بھی نہیں بتا سکے گی۔

''یہ تو آپ کہہ رہے ہیں لیکن میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔'' نیل فر نے لائن کٹ کر دی۔

وہ عجیب الجھن کا شکار تھی کیا کرے، شکیل احمد آنے والے تھے، وہ اسے گاڑی دلانے والے تھے، گاڑی تو خرید لی تھی بس نیل فر کو دکھانی تھی۔

''ارے یہ کیا تم ایسی ہی بیٹھی ہو، انکل آنے والے ہوں گے۔'' شہوار نے اسے حیرانگی سے ایسے ہی بیٹھے دیکھا۔

''شہوار شہوار....'' نیل فر نے اس کا ہاتھ پکڑا اور فہر کی ساری گفتگو اسے بتا دی۔

''واؤ.....اس نے تجھے پرپوز بھی کر دیا، ویسے ہینڈسم کتنا ہے اور سب سے اچھی بات تیری پھپھو کا بیٹا ہے۔'' شہوار کو تو مزا آنے لگا۔

''چپ کرو یہاں میری جان نکلی جا رہی ہے اور تمہیں شرارت اور مزے سوجھ رہے ہیں۔'' نیل فر نے خاصے غصے سے کہا۔

''ایسا کرتے ہیں، انکل کو بتا دو۔''

''دماغ خراب نہیں ہے میرا جو بتا دوں، ابو جانے کیا سوچیں گے، میں کب سے ان چکروں میں ہوں۔'' اسے اسی بات کی تو فکر تھی۔

''اچھا ابھی تو اسے سوچو نہیں، کوئی تو حل تلاش کریں گے، انکل کی کال آئی تھی میرے سیل پر، تمہارا نمبر بزی تھا، جلدی سے تیار ہو جاؤ وہ آنے والے ہیں۔''

نیل فر کا اس وقت گھر سے نکلنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر کچھ کام دل کے منافی بھی کرنے پڑتے ہیں اور اسے یہی سب کرنا پڑ رہا تھا۔ فہر کے بارے میں وہ کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ اس کی زندگی تو بے مصرف ہی گزر رہی تھی، کب تک وہ چھپی رہے گی، کب وہ آزادی سے سانس لے سکے گی، کب..... پنک کاٹن کے اسٹائلش کپڑوں میں خاصی دلکش اور نمایاں لگ رہی تھی۔

☆......☆

فہر کے لب مسکرا رہے تھے کیونکہ اس نے نیل فر کو اچھا خاصا زچ کر دیا تھا۔

''بڑی مسکراہٹیں آ رہی ہیں، کس سے بات کر رہے تھے۔''

''تھی ایک۔'' فہر کے منہ سے روانی میں ہی نکلا۔

''تھی ایک بھلی لڑکی میرے بھائی کو کوئی پسند آ گئی۔'' کنول نے چونک کے سنا اور خوش ہی ہو گئیں۔

''وہ.....وہ میرا مطلب ہے کہ......'' اس سے جواب بھی نہیں بن پڑا تھا۔

''فہر! تم کچھ بھی کر لو پکڑے گئے۔''

کنول ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھیں۔ فہر آفس سے واپسی میں ان کے گھر آ گیا تھا کیونکہ اس سے ان کی ناراضی جو چل رہی تھی۔

''آپی! ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

اس نے پلاؤ کو اپنی پلیٹ میں ڈالا کیونکہ خوشبو ہی اشتہا انگیز اٹھ رہی تھی۔

''یعنی آگے چل کے ایسی کوئی بات ہونے کا قوی امکان ہے۔''

کنول تو خوشی سے چیئر کھسکا کے بیٹھ گئیں۔

''آپ کیا سمجھ رہی ہیں۔''

فہر تو گڑبڑا ہی گیا، اس سے تو کوئی جواب بھی نہیں بن پڑا تھا۔

''وہی جو تم سمجھ کے بھی سمجھنا نہیں چاہتے، وہ بھی میرے سامنے۔'' انہوں نے مسکرا کے معنی خیزی سے آنکھیں گھمائیں۔

''وہ جو میں سمجھ کے بھی سمجھنا نہیں چاہتا آپ بالکل ہی غلط سمجھ رہی ہیں۔''

''تم پکڑے گئے ہو، زیادہ مجھے چلانے کی ضرورت نہیں ہے، اگر تم ہوشیار ہو تو میں بھی تمہاری بڑی بہن ہوں۔ جلدی بکو کہاں ملی تھی، کیسی ہے اور کیا چل رہا ہے۔'' انہوں نے تو فہر کا کان ہی پکڑ لیا اور فہر کو اپنی بے وقوفی پر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔

''یار کان تو چھوڑیے، آپ کے بچوں نے دیکھ لیا تو میرا ریکارڈ لگا دیں گے۔'' اس نے اپنا کان چھڑایا۔

''جلدی جلدی بتاؤ۔''

''یار! قسم سے آپی آپ تو بالکل پولیس والوں کی طرح لاٹھی لے کے میرے سر پر مسلط ہو گئی ہیں، یہ اتنا کچھ جو آپ نے بنایا ہے کھانے تو دیں۔'' اس نے بڑے روہانسے لہجے میں مسکین سی شکل بنا کے کہا۔

''ٹھیک ہے تم کھاؤ، میں بچوں کو بھی بلا لوں۔''

وہ عفان اور ریان کو بلانے چلی گئی تھیں، اتنے میں شعیب بھائی بھی فریش ہو کے آ گئے تھے۔

''آج تمہاری شکل دیکھنے کو ملی ہے۔''

''آپ تو کام جانتے ہیں کیسا ہے، جلدی فارغ ہو گیا تو ادھر نکل آیا۔''

وہ انہیں پلاؤ کی ڈش اٹھا کے دینے لگا۔

''بہت ہی بدتمیز ہوتے جا رہے ہیں ہر وقت گیم گیم پھر ان کی مار کٹائی۔'' کنول دونوں کو زبردستی ڈانٹ ڈپٹ کے لائی تھیں۔

''پاپا! مما بہت مارنے لگی ہیں۔'' عفان نے منہ بسورتے بتایا۔

''کنول! میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا ہے بچوں کو ہاتھ نہیں لگایا کرو، پیار سے سمجھایا کرو۔'' شعیب کے تو آگ ہی لگ جاتی تھی، کنول جب بھی بچوں کو مارتی تھیں۔

''یہ آپ کی وجہ سے اتنے سر چڑھتے جا رہے ہیں۔''

''آپی بچے ہیں، پیار سے بھی ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔''

فہر نے بھی ریان کو اپنی ساتھ والی چیئر پر بٹھایا۔

''ہاں دیکھوں گی تمہیں بھی، تمہاری بیوی جب مار لگا کے سنبھالے گی۔''

''مجھے سخت چڑ ہے بچوں کو مارنے سے۔'' فہر نے ناگواری سے کہا۔

''آپ مردوں کو یہی چڑ ہوتی ہے، جب بچے حد سے زیادہ بدتمیزی کرتے ہیں تو ماؤں کو ایسے ہی ہینڈل کرنا پڑتا ہے، ماں کوئی دشمن نہیں ہوتی ہے۔'' کنول نے بھی تیز لہجے میں کہا۔

''اچھا سب چھوڑو، یہ سبزی تو لے کے آؤ، مزیدار بنائی ہے۔''

شعیب نے خالی ڈونگے کی سمت اشارہ کیا، کنول نے دوپہر میں مکس سبزی بنائی تھی۔

''ہاں شعیب بھائی سبزی مزیدار ہے۔'' فہر نے بھی تائید کی۔

''اور یہ پلاؤ...''

''یہ تو ہے ہی مزیدار مگر سبزی کم ہی کسی کے ہاتھ کی اچھی لگتی ہے۔'' فہر نے ساتھ ہی وضاحت بھی دی۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد کنول نے تو فہر کا پھر پیچھا لے لیا، شعیب کی کوئی آن لائن کال آ گئی تھی وہ اسٹڈی روم میں چلے گئے تھے۔ عفان اور ریان پھر کارٹون میں لگ گئے تھے۔

''ابھی میری کوئی بات نہیں ہوئی ہے، صرف بات کرنے پر راضی کر رہا ہوں۔''

''مطلب، تمہاری کوئی فرینڈشپ بھی نہیں ہے؟'' کنول نے حیرانگی ظاہر کی۔

''آپی ایک بات بتاؤں، وہ مجھے لگتا ہے اس لئے بھی مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی، وہ شکیل ماموں کے ڈرائیور کی بھانجی ہے۔ وہ سوچ رہی ہوگی کہ یہ رشتہ سوٹ نہیں کرتا۔''

''ارے بھانجی ہے تو کیا ہوا، کوئی گناہ کی بات ہے۔''

''سچ آپ کو اعتراض نہیں۔'' فہر کو یہ جان کے خوشی ہوئی۔

''مگر فہر! امی اور ابو کا پتہ نہیں ہے، وہ مانیں یا نہ مانیں۔''

''ان لوگوں کو منانا آپ کا کام ہوگا اور ابھی آپ نے کسی سے بھی ذکر نہیں کرنا، سمجھیں۔'' اس نے کنول کو سختی سے کہا۔

''نہیں کہوں گی، مگر مجھے ایک دفعہ دکھا تو دو، نام بھی کتنا خوبصورت ہے، نیل فر۔'' وہ تو اس کے نام کے سحر میں ہی کھو گئیں۔

''تم ایسا کرنا میری بھی بات کروانا، شاید راضی ہو جائے۔''

''راضی میں خود کر لوں گا مگر ذرا احتیاط سے۔'' وہ ہنسا۔

فہر کافی دیر تک بیٹھا رہا تھا، کنول خوش ہو گئی تھیں، اتنے عرصے بعد ان کے بھائی نے ان کے لئے وقت نکالا تھا، امی کی کال آئی تو فہر اٹھ گیا تھا۔

☆......☆

آج پھر وہ اس دروازے کے آگے کھڑا تھا اور شش و پنج میں مبتلا تھا۔ دروازے پر دستک دے، یہی پوچھے یہاں جو پہلے رہتے تھے وہ کدھر گئے۔ اسکائی بلیو شرٹ کی آستین فولڈ کی بلیک پینٹ میں وہ ڈیسنٹ لگ رہا تھا۔

ناک اس نے کر ہی دیا تھا، اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہا تھا۔

''جی۔'' دروازے پر ایک نوعمر لڑکا تھا۔

''آپ کے گھر میں کوئی بڑا ہو تو مجھے ان سے بات کرنی ہے۔''

شہزیل نے جھجکتے ہوئے اپنا مدعا بیان کر دیا کیونکہ لڑکا چھوٹا تھا اور اسے شاید اتنا کچھ معلوم بھی نہ ہو۔
''جی کہیے کون ہیں؟''
اب کوئی خاتون دوپٹہ سر پر لیے دروازے کے ایک طرف کھڑی ہو کے حیرانگی سے پوچھنے لگی تھیں۔
''اس گھر میں پہلے نوید احمد کی فیملی رہتی تھی، وہ اب کدھر گئے ہیں۔'' اس نے رک رک کے پوچھا۔
''یہ تو ہمیں نہیں پتا مگر اتنا پتا ہے نا گن چورنگی پر کہیں گھر لیا ہے۔''
''آپ کے پاس مکمل ایڈریس ہوگا؟''
شہزیل کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی، اسے مبہم سی آس وامید نظر آئی۔
''مکمل ایڈریس تو نہیں پتا، پر میرے شوہر کو پتا ہوگا۔'' انہوں نے کہا۔
''آپ میری مدد کر سکتی ہیں ان کا ایڈریس دینے میں۔'' وہ بے تاب تھا۔
''ٹھیک ہے، میرے شوہر جب بھی گھر آئیں گے میں پوچھ کے بتا دوں گی۔''
''میں پھر کب آؤں؟'' شہزیل نے پھر پوچھا۔
''آجانا ایک دو دن میں۔''
یہ کہہ کر خاتون نے دروازہ بند کر لیا، شاید وہ گھبرا گئی تھیں جیسے حالات ہو گئے تھے ہر ایک پر بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں تھا۔
شہزیل کو یہی کافی تھا اس کے گھر والے یہیں آس پاس ہی ہیں، وہ سرشار اور خوش گاڑی میں بیٹھ گیا۔
آج کتنے دنوں بعد وہ خوش خوش اندر آیا تھا۔
ہال کمرے میں بڑی اسکرین پر فیشن شو تینوں ہی دیکھتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ ماہا نے اسے دیکھ کر پہلو بدلا تھا۔
''آپ لوگ آواز تو آہستہ کر لیں، بہری تو آپ میں سے کوئی بھی نہیں ہے شاید۔''
شہزیل نے ریموٹ سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کے آواز سلو کر دی۔
''کیا ہے شہزیل بھائی، اتنی سلو آواز۔'' صبا نے تڑپ کے دہائی دی کیونکہ اسے ہی زیادہ آواز میں دیکھنا پسند تھا، میوزک بھی اتنا فاسٹ تھا، ایسا لگ رہا تھا در و دیوار ہل رہے ہوں۔
''لگتا ہے دادی جان سو رہی ہیں یا پھر تم لوگوں نے انہیں لاک کر دیا ہے۔''
''یہ تم آج اتنا چہک کیوں رہے ہو ورنہ تو ایسی توجہ سے بھی بات نہیں کی....'' ماہا نے طنزیہ اور استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔
''ماہا! تم تو شہزیل بھائی کے پیچھے پڑ جاتی ہو ہر بات میں طنز کرتی ہو۔'' صنوبر نے شہزیل کی صورت دیکھ لی تھی جو جز بز ہو رہا تھا۔
''تم چپ رہو۔'' اس نے صنوبر کو ڈانٹ دیا۔
''میرے خیال میں آپ لوگ یہ شو دیکھیں۔'' شہزیل نے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔
''توبہ ہے یہ لڑکی تو ہر بات پر بے دھڑک بول دیتی ہے۔'' شہزیل نے روم میں آ کے لمبا سانس بھرا۔
وہ مطمئن اور خوش تھا۔ آج کے دن چاہے مبہم سی آس وامید نظر تو آئی تھی
''خدا کرے گھر بھی مل جائے۔'' وہ بیڈ پر دراز ہو گیا تھا۔

''رمضہ، امجد، ثمرہ تینوں بڑے اور سمجھ دار ہو گئے ہوں گے۔''

''شہیر کے ہوسٹل میں جو لڑکی تھی بار بار مجھے کیوں دیکھ رہی تھی، جانے کیوں مجھے اس میں رمضہ کی شبیہہ کیوں لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی کوئی مجھے لگی بھی نہیں۔''

''ابو! مجھے معاف کر دینا، میری نا سمجھی کی وجہ سے میں آپ سے ناراض ہو کے گھر سے نکلا تھا اور دیکھیں آج میں آپ سب کے لئے ترس رہا ہوں، یہ مجھے سزا ملی ہے میرے کیے کی۔''

وہ آنکھیں بند کر کے وہ لمحے اور دن یاد کرنے لگا جب وہ گھر سے نکلا تھا۔

''شہزیل، شہزیل بیٹا۔'' بشریٰ کی آواز پر وہ سنبھل گیا۔

''جی آنٹی آ جائیے۔'' اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

''بیٹا آتے ہی کمرے میں گھس گئے، کھانا وغیرہ بھی نہیں کھایا، تمہارے انکل بتا رہے تھے تم شام سے ضروری کام سے نکلے ہوئے تھے۔''

بشریٰ اس کا بھی بالکل اپنے بچوں کی طرح خیال رکھتی تھیں۔

''جی اپنے پرانے محلے گیا تھا۔''

وہ ان سے جھوٹ نہیں بولتا تھا، ہر بات سچ ہی بتاتا تھا، وہ بالکل ماں ہی کی طرح اس کی فکر بھی تو کرتی تھیں۔

ماہا دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی تھی، اس نے ماہا کو اگنور کر دیا تھا۔

''پھر کچھ پتا چلا۔''

''دعا کریں پتا چل جائے۔'' وہ بیڈ کے سرے پر ٹک گیا تھا۔

ماہا بھی اندر آ گئی تھی۔

''امی! اس سے یہ بھی پوچھیں میری کال کیوں کاٹ رہا تھا۔''

''ماہا! تمیز سے بولا کرو، تم سے بڑا ہے۔'' بشریٰ نے اسے ٹوکنے کے ساتھ سرزنش بھی کی تھی۔

''بڑا ہے تو کیا سر پر بٹھا کے آپ آپ کرتی رہوں۔''

ماہا کے مزاج میں حد سے زیادہ لاابالی پن تھا جو شہزیل کو زچ ہی کر دیتا تھا۔

''اس لڑکی کا کچھ نہیں ہوگا، یہ اسی طرح میرے پیچھے پڑی رہے گی۔'' وہ ناگواری سے سوچ کے رہ گیا۔

''فضول باتیں تو تم سے کروا لو، تم جاؤ یہاں سے۔''

''امی! آپ اس شخص کے سامنے مجھے اتنا ڈانٹتی کیوں ہیں۔'' وہ برا مان کے گویا ہوئی۔

شہزیل کو اس لمحے ماہا کی موجودگی گراں گزر رہی تھی۔ جتنا وہ اس سے بچتا تھا وہ اتنا ہی اس کے پیچھے سائے کی طرح لگی رہتی تھی۔

''تم فضول ہانکتی رہو میں کچھ نہیں کہوں، جاؤ تم یہاں سے۔''

وہ جان کے اسے یہاں سے بھیجنا چاہتی تھیں کیونکہ ماہا کے معاملے میں بہت محتاط ہو گئی تھیں جب سے ان کی ساس نے ناگواری ظاہر کی تھی۔ ماہا ہر وقت شہزیل کے پیچھے پڑی رہتی ہے اس وقت تو انہیں یہ بات بری لگی تھی مگر اب انہوں نے بھی نوٹ کر لیا تھا، ماہا شہزیل کے پیچھے پیچھے رہتی تھی جبکہ شہزیل اسے رسپانس نہیں دیتا تھا۔


Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !
i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.
All Done
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

"شہزیل کھانا کھاؤ گے۔"

بشریٰ نے زبردستی گھورتی نگاہوں سے ماہا کو جانے کو کہہ دیا۔

"آنٹی ابھی تو بھوک نہیں ہے، جب لگے گی میں خود نکال کے کھالوں گا۔"

وہ کوشش کرتا تھا اپنی وجہ سے انہیں تکلیف نہ دے۔

"امی! کھانا مائیکرو ویو میں گرم کردیا ہے۔" ماہا کی آواز آئی تو دونوں ہی چونک گئے۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ، اس کی فکر کرنے کے لئے میں موجود ہوں۔"

بشریٰ اس کی آمد سے عاجز آگئی تھیں۔

شہزیل سب سمجھ رہا تھا بشریٰ کی ناگواریت۔

"آنٹی میں فریش ہونے واش روم جارہا ہوں۔"

اس نے یہی مناسب سمجھا، منظر سے ہٹ جائے تو زیادہ اچھا ہے۔

"وہ ٹھیک ہے کھانا کھانے آجانا۔"

وہ ماہا کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتی ہوئی روم سے نکل گئی تھیں۔

ماہا شاید کچھ سمجھنا نہیں چاہتی تھی یا پھر سمجھ کے بھی نا سمجھ تھی۔

☆......☆

شکیل احمد نے آج آدھے سے زیادہ وقت نیل فر کے ساتھ گزارا تھا، ڈنر بھی باہر ہی کیا تھا، نیل فر کو نئی گاڑی میں انہوں نے گھمایا تھا۔ رات گیارہ بجے وہ گھر آئے تھے، ثریا کی تفتیشی اور جانچتی نگاہیں ان پر تھیں جوان سے کپ چائے کی فرمائش کر کے خود لاؤنج میں ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئے تھے۔

ضیاء بھی وہیں لیپ ٹاپ پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اس نے پورا آفس سنبھالا ہوا تھا۔ اس نے ایک نگاہ شکیل احمد پر بھی ڈالی۔

"ابو! اکاؤنٹس کے سہیل خان کہہ رہے تھے آپ نے پندرہ لاکھ روپے نکلوائے تھے، خیریت تو ہے۔"

ضیاء کو پوچھنا اچھا تو نہیں لگ رہا تھا مگر وہ پوچھے بغیر بھی نہیں رہ سکا۔

"ارے بیٹا کسی کو ضرورت تھی اس کے لئے نکلوائے تھے۔"

ثریا چائے لے آئی تھیں، انہوں نے کپ ٹرے سے اٹھایا۔

"لاسٹ ٹائم تو آپ نے حمزہ کو اسپورٹس بائیک دلائی تھی، میں سمجھا اس دفعہ پھر حمزہ کو کوئی گفٹ دینے والے ہیں۔" ضیاء نے مسکرا کے کہا اور لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

"تم ماں بیٹوں میں شک کی روح گھس گئی ہے۔"

شکیل احمد کو اس کا یہ انداز اچھا نہیں لگا، وہ باپ تھے بیٹے کی باتوں کا مطلب بھی نہ سمجھتے جو بات کو گھما پھرا کے پوچھنا ہی چاہتا تھا انہوں نے پندرہ لاکھ کا کیا کیا۔

"نہیں ابو ایسی کوئی بات نہیں ہے، اصل میں، میں اس لئے کہہ رہا تھا حمزہ کو خوش فہمی ہو رہی ہے۔"

ضیاء خفیف سا ہو گیا تھا، شکیل احمد کا چہرہ خاصا سنجیدہ ہو گیا تھا، ثریا ان کے سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھی بیچی نگاہیں کسے سوچوں میں الجھی ہوئی تھیں۔

"رہنے دو، اتنی عمر گزاری ہے میں نے میری اولادیں مجھے چلا رہی ہیں۔"

چائے کا کپ ساسر میں پٹخ کے رکھا اور ٹیبل پر رکھ دیا، انہیں خاصا غصہ آ گیا تھا۔
"ابو! آپ میری بات کا غلط مطلب لے رہے ہیں۔" ضیاء تو گڑبڑا گیا۔
"ارے آپ تو ایسے ہی اتنی سی باتوں پر غصہ ہونے لگے ہیں۔"
"یہ سب آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے، کبھی آپ نے مجھ پر شک نہیں کیا، اس عمر میں مجھ پر شک کرتی ہیں میری مرضی میں پندرہ لاکھ نکالوں یا پندرہ کروڑ، اپنا پیسہ نکالتا ہوں، اگر کسی کی مدد کر دی تو آپ ماں بیٹوں کو اعتراض ہونے لگا۔ میں نے ایسا تو کبھی آپ لوگوں پر پابندی نہیں لگائی کہ آپ لوگ پیسے میری مرضی سے خرچ کریں۔" وہ تو غضبناک انداز میں کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔
ضیاء اچھا خاصا سٹپٹا گیا کیونکہ شکیل احمد کا غصہ ثریا پر جو گر رہا تھا اور وہ دم سادھے بیٹھی ہوئی تھیں۔
"ابو! ایم سوسوری..." وہ ندامت میں گھرا قدرے توقف کے بعد گویا ہوا۔
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے بیٹا۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے روم کی طرف بڑھ گئے۔
ثریا نے تو اپنا سر تھام لیا اور ضیاء کو اپنی بے وقوفی پر غصہ آنے لگا، اس نے بولا ہی کیوں۔
"امی! آپ رو رہی ہیں۔" ضیاء ان کے پاس آ کے بیٹھا۔
"نہیں تو۔" آنچل سے آنکھوں کی نمی صاف کی۔
"بیٹا! آئندہ تم اپنے ابو سے کسی بھی بات پر باز پرس نہیں کرو گے، وہ تمہارے باپ ہیں، اچھا نہیں لگتا تم ان سے ایسے پوچھو۔" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے گویا ہوئیں۔
"ہوں۔"
اس نے سر ہلایا، وہ انہیں یہ بتا کے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، شکیل احمد واقعی میں جانتے تھے، یہ بھی ایک دن سلام ڈرائیور کے منہ سے نکل گیا تھا اس دن سے ضیاء جانے کیوں شکیل احمد کو نوٹ کرنے لگا تھا۔
ثریا بھی اداس اور افسردہ سی اپنے روم کی طرف بڑھ گئی تھیں مگر ضیاء کی سوچوں کا رخ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔

☆......☆

رمشہ کو جاب جوائن کیے مہینہ ہو گیا تھا، جب سیلری اسے ملی تو وہ بہت خوش ہوئی، کتنے دنوں بعد وہ اتنی خوش ہوئی تھی، ورنہ لگتا تھا اس گھر میں فکروں اور پریشانیوں نے راستہ دیکھ لیا ہو۔ امی نے آج اسے بہت دنوں بعد اتنا خوش دیکھا تھا۔
"آپی! سردیاں آنے والی ہیں، آپ نے میرا نیا اپر لے کے دینا ہو گا۔" اسجد کو اپنی فرمائش یاد آئی۔
"ہاں پتہ ہے سب کی چیزیں آ جائیں گی۔" رمشہ نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا۔
"رمشہ بیٹا! پہلے گھر کا راشن پورا کر دو اس دفعہ دکان کا کرایہ بھی نہیں آیا ہے۔"
"کیوں، کرایہ کیوں نہیں آیا۔" وہ چونک گئی۔
"پتہ نہیں کہہ رہا تھا رفیق اس دفعہ نہیں دے سکے گا۔ اس کی بیوی کے میکے میں کوئی تقریب ہے وہاں لینا دینا کرنا ہے۔"
"ارے امی یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، دکان کو کرائے پر دیئے ابھی تین مہینے ہی ہوئے ہیں اور وہ ایسے کر رہا ہے۔" رمشہ کو فکر سوار ہو گئی۔

''ارے بیٹا تم فکر نہیں کرو سب ہو جائے گا۔'' انہوں نے رمضہ کو اطمینان دلایا۔
''ایک تو امی ہر ایک کی باتوں میں آجاتی ہیں، ذرا سختی سے کہتیں کہ ہمارا تقریب سے کوئی واسطہ نہیں، ہمارے کرائے کے پیسے دے دو۔'' اسجد نے بھی کہا۔
''کسی کی مجبوریوں کا خیال کرو تو اللہ بھی ساتھ دیتا ہے۔''
''امی اللہ نے ہمارا یہ ذریعہ بنایا ہے رزق کا۔'' رمضہ نے ان کی بات کاٹی۔
''اس دفعہ نصیب میں نہیں تھا، تم یہ بھی تو دیکھو اللہ نے وہ کمی تمہاری تنخواہ سے پوری کر دی بلکہ ڈبل کر دی۔ دکان کا کرایہ دس ہزار آتا ہے اور تمہاری تنخواہ بیس ہزار ملی ہے۔ ورنہ تو اٹھارہ کی بات ہوئی تھی، تمہیں بیس ملی ہے۔''
''میں نے چھٹیاں بھی تو نہیں کی ہیں اور اوور ٹائم بھی لگایا ہے۔'' رمضہ نے انہیں بتایا۔
''شکر ادا کرو اور ملال اور دکھ نہیں کرو۔ ایسے کرتے ہیں سپر اسٹور چلتے ہیں، راشن تو لے آئیں۔'' امی نے اس کی سوچوں کا رخ بدلا۔
''جی اچھا، اسجد تم ساتھ چلنا۔'' ساتھ ہی رمضہ نے اسجد کو بھی ہدایت دی۔
''آپی میں بھی چلوں گی۔'' نمرہ بھی جلدی سے اندر آئی۔
''ابو کے پاس تم رکنا وہ اکیلے رہیں گے۔''
''امی! میرا بھی دل چاہ رہا ہے۔'' وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔
''امی! آپ اسے اور اسجد کو لے جائیں، میں ویسے بھی تھکی ہوئی ہوں، میں رک جاؤں گی۔'' اس نے خود ہی منع کر دیا۔
''بیٹا! یہ دونوں میرا دماغ خراب کرتے ہیں، الٹی سیدھی فضول چیزیں اٹھا لیتے ہیں، بل بھی اتنا بن جاتا ہے۔'' امی قطعی نمرہ کو تو لے جانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔
مجبوراً پھر رمضہ کو ہی جانا پڑا تھا، واپسی میں ٹریفک کا کافی رش تھا، کوئی رکشہ بھی نہیں مل رہا تھا، سامان کے شاپرز بھی اچھے خاصے تھے۔
''اسجد آگے جا کے لے آو رکشہ، یہاں تو کوئی رک ہی نہیں رہا۔''
رمضہ نے دوپٹہ اچھی طرح شانوں پر پھیلایا۔
''آپی! یہ ساتھ میں ہوسپٹل ہے، اس کے پارکنگ تک چلتے ہیں وہاں سے مل جائے گا۔''
سپر اسٹور کے ساتھ ہی ہوسپٹل بھی تھا۔
''یہ شاپرز کیسے اٹھاؤں۔''
رمضہ سے اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ امی بھی دو شاپرز تو پکڑے ہوئے تھیں۔
''ایسا کریں آپ لوگ یہیں رکیں میں آگے جا کے لاتا ہوں۔''
''میں کیا کہہ رہی تھی، یہی تو کہہ رہی تھی آگے جا کے لے آو۔'' اس نے اسجد کی پشت پر دھپ لگائی۔
ابھی رمضہ اور اسجد شاپرز اٹھانے جھکے ہی تھے وائٹ گاڑی ان کے آگے رکی۔
رمضہ نے حیرانگی سے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شہیر کو دیکھا۔
''سر آپ....''

"لگتا ہے شاپنگ پر نکلے ہیں آپ لوگ۔" اس نے ان کے ہاتھوں میں شاپرز دیکھے۔
"جی سر! وہ بس..." رمضہ کچھ ہچکچا بھی رہی تھی یوں اچانک سے ان کے سامنے آنے پر۔
امی کو رمضہ بتانے لگی۔ "یہ ڈاکٹر شہیر ہیں۔"
"آیئے میں ڈراپ کردوں۔"
"نہیں تھینکس سر!"
رمضہ ایسا کچھ ان کا احسان نہیں چاہتی تھی، ویسے ہی ایک جاب کا احسان تو بہت بڑا تھا۔
"اے بیٹا تم تو فرشتہ ثابت ہوئے، میری تو ٹانگوں سے چلا بھی نہیں جارہا۔"
"آیئے آیئے دیر نہیں کریں۔" شہیر نے اپنی خدمات جھٹ پیش کی تھیں۔
امجد تو فوراً شاپرز پیچھے کی سیٹ پر رکھنے لگا۔
رمضہ کو اسے یوں گھر لے جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر گاڑی رکوائی تھی۔
شہیر، رمضہ کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔
"میری ڈیوٹی ادھر ہی ہوسپٹل میں لگی تھی، وہی کرنے جارہا تھا کہ آپ لوگ نظر آگئے۔" اس نے بتایا۔
"بیٹا اندر آتے۔"
"آنٹی! پھر کبھی، ابھی میں جلدی میں ہوں۔"
وہ سمجھ گیا تھا رمضہ نہیں چاہتی کہ وہ اندر آئے اور وہ محتاط انداز میں رہنے والی لڑکی تھی، شہیر اس کی حد بندیوں کو پھلانگنا بھی نہیں تھا۔

☆......☆

آریکہ نے جب سے یہ رشتہ ختم ہوا تھا، سکھ کا سانس لیا تھا۔ کتنی دعائیں نمازوں میں مانگی تھیں، شکر ہے قبول ہوگئی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنے آس پاس حسنین کو ہی دیکھا تھا مگر حسنین کا سرد اور اکھڑ مزاج اسے اداس اور غمگین کردیتا تھا۔ جب سے رشتے کی بات چل رہی تھی اس نے نیچے جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔
"ابو کو تو بہت فکر ہورہی ہے آپ کی۔" ثمرہ نے روٹیاں بناتے ہوئے کہا، وہ سالن بھون رہی تھی۔
"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"
آریکہ نے دوپٹہ شانوں پر برابر کیا اور بھونتے ہوئے قیمے میں کٹے ہوئے آلو ڈالے۔
"لڑکے کا تو دماغ نہیں، اس کی اماں جان کے بہت دماغ تھے، بیٹا گورنمنٹ جاب کیا کررہا ہے سمجھ رہی تھیں بیٹا ولایتی کرسی پر بیٹھا ہو لڑکی انہیں ایل ایل بی پاس چاہیے۔"
"دفع کرو ایسے لوگوں کو جو اس طرح کرتے ہیں، انہیں بھی لڑکی ایسی ملتی ہے کہ ان کا دماغ ٹھکانے لگادے۔"
آریکہ نے قیمے میں پانی ڈالا اور ڈھکنا بند کردیا۔
"ایسی ہی کیسی گورنمنٹ جاب والی؟" ثمرہ نے برجستہ قہقہہ لگا کے کہا۔
"مطلب میرا یہ ہے کہ حسین پریاں اور گوری گوری ڈھونڈتے تو ہیں بعد میں انہی میں کیڑے نکلتے ہیں جہاں کوئی کھٹ پھٹ یا چپقلش ہوئی۔" آریکہ نے کہا۔
"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ شادی اتنے چاؤ سے اور تعریفوں کے پل باندھ کے کی جاتی ہے، لڑکی اتنی

اچھی ہے اور اس کے گھر والے بھی بہت اچھے، پھر یہ اچھے بعد میں برے کیوں ہو جاتے ہیں؟"

"اور لڑکے والے بھی بعد میں اچھے سے برے کیوں ہو جاتے ہیں؟" آریکہ نے بھی سوال میں سے سوال نکالا۔

ثمرہ نے روٹی پکا کے ہاٹ پاٹ میں لپیٹی اور آریکہ نے بھی قیمہ آلو تیار کر لیا تھا۔

"تم دونوں کی زبانیں کتنی چلنے لگی ہیں۔"

ناہید ان دونوں کو دیکھنے کچن میں آئی تھیں کیونکہ وہ آریکہ کو دو تین آوازیں دے چکی تھیں، وہ آئی نہیں تو انہیں اٹھنا پڑا۔

"وہ..... وہ امی ہم تو....." آریکہ تو گڑبڑا گئی جبکہ ثمرہ نے لب بھینچ لئے۔

"ابھی تمہارے ابو کا گزر یہاں سے ہو جائے تو کتنی شرم کی بات ہے ان کی بیٹیاں کیسے منہ پھاڑ کے بول رہی ہیں۔"

"سوری امی! وہ تو بات میں نے شروع کی تھی، آپی کے رشتے والے جو آئے تھے۔"

"ختم کرو یہ بات، وہ لوگ میری بیٹی کے قابل ہی نہیں تھے۔" ناہید نے خود ہی بات کو ختم کرنا چاہا۔

آریکہ کے چہرے پر ایک دم اداسی اور سنجیدگی آ گئی تھی۔

"امی! آپ تو ہر رشتے والوں سے آس کیوں لگا کے بیٹھ جاتی ہیں، آپ بھی جانتی ہیں لڑکے والے کبھی بھی پہلی ملاقات میں اپنا عندیہ نہیں دیتے۔" ثمرہ نے کہا۔

"بیٹی کی مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اچھا تم لوگ باہر نکلو، اور ہاں نیچے لگ رہا ہے، ایمہ بہن کی طبیعت خراب ہے، حنین کے ساتھ وہ ڈاکٹر کے پاس سے آئی ہیں، تمہارے ابو بتا رہے تھے۔ میں دیکھ کر آتی ہوں، تم جب تک اپنے ابو کو کھانا دے دو۔"

"جی اچھا۔" ثمرہ نے سر ہلایا۔

"اور ہاں آریکہ ایسا کرنا کل دوپہر میں ان کا کھانا وغیرہ بنا دینا۔"

"امی، آپی ان کی نوکر نہیں ہیں اگر ہم ان کے گھر میں رہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ان کے کام کرتے رہیں۔"

"چپ کر جاؤ بھاڑ کی طرح بولتی ہے، پڑوسیوں کے کام آنا ثواب ہے۔" انہوں نے اسے سرزنش کر دیا۔

آریکہ کے لب مسکرا دیئے، ناہید تو چلی گئی تھیں جبکہ آریکہ کا کافی دنوں سے حنین کا سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔

☆......☆

"انکل نے یہ گاڑی تمہیں سجانے کے لئے نہیں دی ہے محترمہ اسے چلاؤ بھی تو۔"

"مجھے ڈرائیو کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔" نیل فر نے نیچے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"نیل فر تم نے ڈرائیونگ پوری سیکھ لی ہے، ڈرنے کی تو بات ہی نہیں ہے۔ میں نے کیا دیکھا نہیں ہے تم گاڑی اچھی ڈرائیو کر لیتی ہو۔" شہوار اس کی بے دلی طبیعت سے سخت نالاں تھی۔

شکیل احمد نے اسے مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا گاڑی لے کے دے دی تھی جبکہ ڈرائیونگ کورس انہوں نے پہلے اسے زبردستی اپنی ہی نگرانی میں کروایا تھا۔ اس کے لئے بھی وہ کب راضی تھی۔

"یہ تو تم کہہ رہی ہو، لوگ ویسے بھی کہتے ہیں خواتین اچھی ڈرائیونگ نہیں کرتی ہیں۔" اس نے مسکراتے

جیسے توجیہہ ہی پیش کی۔
"لوگ تو پاگل ہیں، ضروری ہے ساری خواتین ایسی ہی ہوں جبکہ تم جانتی ہو انکل کے ساتھ تم جب بھی ڈرائیو کرتی ہو کتنے محتاط انداز میں کرتی ہو۔"
"وہ تو ابو ساتھ ہوتے ہیں تو ہمت رہتی ہے۔"
"چل بکواس نہ کر، اٹھ باہر کا چکر لگاتے ہیں۔" شہوار نے زبردستی اسے اٹھایا۔
"تم دونوں کی چائے یہیں لے آؤں۔" خالہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔
"امی میں اسے باہر لے کے جارہی ہوں، گاڑی کو کھڑے کھڑے زنگ لگائے گی۔"
"اچھا، اچھا ٹھیک ہے، پھر آ کے پی لینا۔" انہوں نے کہا۔
شہوار نے ایسی جلدی مچائی کہ اسے ماننتے ہی بنی۔ پارکنگ ایریے میں آئی نیو ماڈل کار سب ہی رشک سے دیکھتے تھے۔
"ابو کو بھی پتا نہیں کیا ضرورت پڑی تھی مجھے یہ دلانے کی۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر کچھ کھسیا کے بولی۔
شہوار فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔
اندر بیٹھتے ہی اے سی کولنگ میں وہ مست ہوگئی۔
"تمہاری بہت عادتیں خراب ہوتی جارہی ہیں۔"
نیل فر گاڑی بڑی احتیاط سے پارکنگ ایریا سے نکال کے باہر مین روڈ پر لے آئی تھی۔
گاڑی چلانے میں وہ پرفیکٹ ہوگئی تھی مگر وہ جان بوجھ کے چلانا نہیں چاہتی تھی۔
"کیا کروں انکل نے ہی عادتیں ایسی ڈال دی ہیں۔"
وہ باہر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔
"میں نے ابو سے کہہ دیا ہے دوسرا اے سی لگانے کو۔"
"اور جیو یارا....." شہوار خوش ہوگئی۔
"ابو کہہ رہے تھے پورے فلیٹ کو وہ دو ٹن کا اے سی کور کرے گا۔"
"نیل فر، نیل فر آرام سے۔"
نیل فر نے بروقت بریک لگائے ورنہ گاڑی فٹ پاتھ پر کھڑے آدمی پر چڑھ سکتی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا آندھی طوفان کی طرح ونڈو گلاس بجانے لگا۔
نیل فر نے شیشہ نیچے کیا اور خود حواس باختہ ہی ہوگئی تھی
"آپ......" سامنے والا تو حیرانگی سے جھٹکا ہی کھا کے رہ گیا۔
شہوار اور نیل فر بھی اسے دیکھ کر سکتے میں آگئیں۔
"اوہ..... تو آپ گاڑی بھی چلاتی ہیں، اب تو بالکل بھی ڈر نہیں لگتا ہوگا، اس دن موٹر بائیک دیکھ کر چیخ ماری محترمہ آپ میں وہ آپ کا ڈرامہ سمجھوں یا یہ ڈرامہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اتنی مہنگی گاڑی پچیس لاکھ سے کم کی تو ہے نہیں جو آپ چلا رہی ہیں۔ ضرور کسی لین لارڈ کی اولاد ہیں۔" حمزہ کی زبان نان اسٹاپ چل پڑی تھی۔
اور نیل فر شرمندگی سے لب بھینچ کے رہ گئی جبکہ شہوار کو غصہ آنے لگا۔

(جاری ہے)

"تو ثانی کہاں تھے ہم؟" وہ کھویا کھویا سا پوچھنے لگا۔ تم مجھے میسنر اور وانڈا کے بارے میں بتا رہے تھے؟" اس نے فوراً یاددہانی کروائی۔ کلاس کی پہلی بینچ پر موجود اس بریلینٹ اسٹوڈنٹ کی طرح جو کسی غائب دماغ پروفیسر کو ہر بار اس کی چند بھولی بسری باتوں کی یاددہانی کرواتا ہے۔

"میسنر اپنے زمانے میں دنیا کا مشہور کوہ پیما تھا وہ شخص کوہ پیمائی کی دنیا کے لیے کسی معجزے کسی سونامی یا کسی عجوبے سے کسی طور پر کم نہیں تھا۔ اطالیہ کا سب سے پھرتیلا کوہ پیما جس نے دنیا بھر کی تقریباً سبھی بلند ترین چوٹیوں کو اپنے قدموں تلے روندھا تھا۔ اس عظیم کوہ پیما کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ ہر ایکسپی ڈیشن پر اکیلا ہی نکل جایا کرتا تھا تن تنہا بنا کسی آکسیجن ماسک کے کیونکہ قدرت نے اس کے پھیپھڑوں میں ایسی گنجائش رکھی تھی کہ وہ دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی بنا کسی آکسیجن ماسک کے پہنچا اور پلٹا تھا۔ وہ عام لوگوں سے منفرد تھا۔ میں نے انٹرنیٹ پر اس کی بہت ساری ویڈیوز فوٹیج سرچ کر لی ہیں۔ اسے پی ٹی وی پر بلایا گیا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ میں ایک بہادر کوہ پیما نہیں ہوں کیونکہ پہاڑوں میں بہادری دکھانے والا کوہ ایک مردہ کوہ پیما ہو سکتا ہے مگر بہادر

## مکمل ناول

# کوہ عشق

### ثناء ناز

ہرگز نہیں کوہ پیماؤں کو ہمیشہ احتیاط پسند ہونا چاہیے بلکہ حکمت اسی میں ہے اسے ضرورت سے زیادہ احتیاط پسند ہونا چاہیے۔ اطالیہ کے اس سونامی کوہ پیما کا کہنا ہے پاکستان کے شمالی علاقے میرے پسندیدہ ترین علاقے ہیں اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان تمام علاقوں کو محفوظ شدہ علاقے قرار دے دیتا اور ان کے اندر ماڈرن زندگی کو کبھی سرائیت نہ کرنے دیتا۔ صرف اس لیے کہ اگر آج سے سیکڑوں برس بعد جب دنیا فیکٹریوں کے دھوئیں کی زد میں ہو گی اور انسان مکمل طور پر ایک مشین بن چکا ہو گا۔ تب اگر کوئی بچہ اپنے باپ سے کہے گا کہ ابو اوپر والے نے جب دنیا تخلیق کی تھی تو یہ کیسی تھی تب وہ باپ بیٹے کی انگلی تھام کر اسے پاکستان کے ان شاندار علاقوں میں لے آئے گا اور کہے گا۔ بیٹا یہ دنیا ایسی تھی۔ تن تنہا، حسین، پاک، ان چھوئی مکمل دلفریب خاموشی میں ڈوبی ہوئی۔"

وہ شخص ذرا ہٹ کے تھا۔ کچھ پیچیدہ کچھ الجھا سا، یہی وجہ ہے پاکستانی کوہ پیما اشرف امان کے بعد میں میسنر کو اپنا ہیرو مانتا ہوں۔" وہ سانس لینے کی غرض سے رکا تو سروش کے قلم کی تیز گام اسپیڈ کو بھی یک دم بریک لگی تھی۔

"اور وانڈا کا کیا کہنا تھا ان حسین وادیوں کے بارے میں؟" 11 دسمبر آنے کو تھا اور اسے ماؤنٹین ڈے کے حوالے سے ایک رپورٹ تیار کرنی تھی جبھی وہ گلمان سکندر سے ملکی اور غیر ملکی کوہ پیماؤں کے بارے میں ڈسکس کر رہی تھی۔

"ثانی! آپ مجھ سے ہر وقت میرے ایڈونچر کے بارے میں کیوں پوچھتی رہتی ہیں؟" وہ متجسس ہوا۔

"یہ میری جاب ہے ویسے بھی تمہاری باتیں مجھے نیچر کے قریب لے جاتی ہیں۔" حقیقت میں وہ کہنا چاہتی تھی کہ یہی وہ باتیں ہیں جو مجھے تمہارے قریب لے جاتی ہیں۔"



"آپ خود کیوں نہیں چلتی میرے ساتھ اتنا لیکچر سن کر کیا کریں گی۔"

"میں ایک سفرنامہ لکھوں گی اور رہی بات تمہارے ساتھ چلنے کی تو میں کوشش کروں گی کہ تمہارے اگلے ٹرپ پر میں بھی جا سکوں۔" وہ نیلے افق پر لہراتے سفید بالوں کی اڑان دیکھ کر آہستگی سے بولی۔

"آپ مجھ سے پوچھ پوچھ کر سفرنامہ لکھیں گی، ہاں نانی! یہ تو چیٹنگ ہے بھئی۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"کوئی چیٹنگ ویٹنگ نہیں ہے مسٹر گلمان سکندر۔" اصل میں وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں تم سے پوچھ پوچھ کر کوئی سفرنامہ نہیں لکھ رہی بلکہ تمہاری ذات پر ایک کتاب لکھ رہی ہوں۔ وہ کتاب جس کے صرف دو ہی کردار ہوں گے ایک سروش اور ایک گلمان اور بس۔"

گلمان کی آواز نے اسے سوچوں کے گہرے سمندر سے باہر نکالا تھا۔

"تم نہیں بتانا چاہ رہے تو مت بتاؤ میں جا رہی ہوں۔" وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے باقاعدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا نا بیٹھ جائیں بتاتا ہوں، چلیں آج میں آپ کو فیری میڈوز کے بارے میں بتاتا ہوں۔"

"وہی فیری میڈوز جہاں پریاں اترتی ہیں۔" وہ چہکی تھی۔

"جی نانی! وہی فیری میڈوز جہاں پریاں اترتی ہیں۔ بالکل آپ جیسی۔" اس نے آہستگی سے کہا تو وہ خوش ہو کر واپس اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ جب کہ گلمان اسے پریوں کے دیس کے قصے سنانے لگا تھا۔

☆......☆

اس ویک اینڈ پر گلمان اور اس کے باقی فیلوز اسکردو جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ وہ یونیورسٹی میں پروجیکٹ سب مٹ کروانے کے بعد تقریباً فارغ ہی تھی کہ اسے ڈریم ایڈونچر سرکل کی جانب سے ایک ای میل موصول ہوئی۔ ای میل میں اسے اسکردو پر ایک رپورٹ اور ڈاکومنٹری تیار کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ سو وہ بھی اس موقع کو غنیمت جان کر NGO کے کچھ بچوں کو لیے ان کے ساتھ چلی آئی۔

اس وقت وہ اداسی اور گہرے سکوت میں ڈوبے بلند و بالا خوابناک پہاڑی سلسلوں کے بیچ ایک پتھر پر بیٹھی ارد گرد کے مناظر میں کھوئی ہوئی تھی۔ کیمرہ اس کے ہاتھ میں تھا نوٹ پیڈ اس نے گود میں رکھا ہوا تھا۔ جب کہ دوسرے ہاتھ سے بال پوائنٹ تمام تر دانتوں تلے دبائے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آتی تھی بلاشبہ اداسی و ویرانی میں لپٹے کسی بھی ہریالی سے محروم وہ وسیع پہاڑ بالکل بنجر تھے مگر ان عظیم پہاڑوں کی عظمت اور عالیشان بناوٹ انہیں دوسرے کسی بے حد حسین قدرتی مناظر سے کہیں زیادہ فیسی نیٹ بنا رہی تھی۔

"حسن چاہے کوئی بھی ہو دھڑکنیں ایک پل کے لیے مس ضرور ہوتی ہیں اور جب بات ہو قدرتی حسن کی تو دل آپ ہی آپ ایک الگ لے پر دھڑک اٹھتا ہے۔" اس نے فلسفانہ انداز میں سوچا وہاں اور بھی لوگ تھے جن میں سے کچھ تو ٹوگرافر تھے۔ کچھ مقامی باشندے تھے جب کہ کچھ ان کی طرح محض ایڈونچر کے مزے لوٹنے آئے ہوئے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے جھیل کا بہترین منظر تھا۔ پوری جھیل صبح کی سفیدی کو جذب کیے اپنے کناروں سے الگ ہو چکی تھی۔ زردی اور ہریالی کا لبادہ پہنے چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے درمیان نیلگوں شفاف پانی سے لبالب قدرتی حسن کی عکاسی کرتی اسکردو کی شان وہ ایک بے حد حسین جھیل تھی جس کے کنارے تانبے کی سی رنگت اوڑھے دہک رہے تھے۔ وہ ایک چھوٹا تھی اس کے پانی میں ایک خاص ٹھہراؤ موجود تھا اور وہ ٹھہراؤ اس لمحے ٹوٹتا تھا جب کوئی مچھلی اچھل کر باہر آتی تھی اور پھر پانی میں گر کر پانی ہو جاتی تھی۔ پانیوں کا منظر صبح کی روشنیوں کو مات دے رہا تھا۔ اس جھیل کے بیچ گندم کے خوشوں کی مانند چمکتا دمکتا ایک بڑا سنہری مائل پتھر موجود

تھا۔ کتنے ہی گھنٹے وہ اس سحر انگیز طلسم میں گرفتار سامنے پڑے پتھر پر نظریں منجمد کیے ساکت بیٹھی رہی۔ بالکل ویسے جیسے پارے کا ذرہ کسی سیاہ شیشے کی سطح پر ساکن رہتا ہے۔ شفاف پانی کے ٹھہراؤ میں ایک پل کے لیے ہلچل ہوئی تو اس نے تھک ہار کر اپنی نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔ اس کے سامنے چہکتے کھلکھلاتے اٹھکیلیاں کرتے آگے پیچھے دوڑتے ننھے منے بچے موجود تھے۔ جواب تک گلمان کے جگری دوست بن چکے تھے اور وہ ہر شے سے بے نیاز ان ننھے فرشتوں میں گھرا بیٹھا تھا۔

''سوچ ہے آپ کی بچے پانچ منٹ میں مجھ سے فری ہو جاتے ہیں چاہے کتنے ہی ضدی کیوں نہ ہوں۔'' کان میں ایک سرگوشی ہوئی تھی۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' اس نے زیر لب کہا۔ وہ جہاں جاتا تھا ہر ایک کو اپنا اسیر کر لیتا تھا۔

''گلمان سکندر ایک عظیم کوہ پیا کسی کے دل تک رسائی حاصل کرنا اس شخص کے لیے کبھی مشکل نہیں رہا ہوگا۔'' وہ لمبا سانس بھرتے ہوئے قدرے بے بسی سے مسکرائی۔ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ ہنستا مسکراتا بچوں میں کینڈیز بانٹتا اس کے پاس چلا آیا۔

''ثانی۔'' وہ اس کے ساتھ پڑے پتھر پر آبیٹھا تھا۔ وہ بے خیالی میں بولی۔

''ہوں کیا ہوتا ہے۔ جی کہتے ہیں۔''

''جی۔'' اس نے بڑا ضبط دکھایا تھا۔

''جی کیا ہوتا ہے۔ جی گلمان کہتے ہیں۔''

''جی گلمان۔'' وہ بحث کے موڈ میں نہیں تھی۔

''گڈ اب ٹھیک ہے۔'' وہ مطمئن ہوا۔

وہ خاموش رہی۔ اس نے ایک بار پھر پکارا۔

''ہوں۔'' اس کے منہ سے پھسلا ''جی'' وہ بڑبڑائی۔ ''جی گلمان۔'' اس نے فوراً تصیح کی۔

''میں سیلفش نہیں ہوں ثانی۔''

''ہم سارے زمانے کو خوش نہیں رکھ سکتے ایسا تم ہی کہتے ہو۔'' سروش نے اس کے الفاظ دہرائے تھے۔

''کہتا ہوں پر ایک دوسرے کا خیال اور احساس تو کر سکتے ہیں نہ کیا پتہ دوسرا کتنی مشکل میں ہو۔'' وہ سر جھکاتا ہوا کہہ گیا۔

''محبت کسی کے لیے آسان نہیں ہوتی گلمان سکندر۔'' وہ بے دردسا مسکرائی۔

''ثانی کیسے ہو گئی آپ کو محبت؟ کیسے؟ جانتے تھے نہ میں کیسا بندہ ہوں۔ کیا ماضی ہے میرا، کون ہے آگے پیچھے پھر بھی سروش درانی آپ...... میرا نفس خوش ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ پر ثانی ضمیر ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے کہ گلمان یار یہ تو کیا کر رہا ہے اس کے ساتھ وہ اچھی لڑکی ہے معصوم ہے۔ تو غلط مت کر، میں لڑتا رہتا ہوں۔ ثانی خود سے کچھ سمجھ نہیں آتا کس کی سنوں نفس کی یا ضمیر کی۔ میں آپ کا آنچل خوشیوں سے بھرنا چاہتا ہوں مگر میں ویسا نہیں کر سکتا جیسا آپ چاہتی ہیں۔ میں خود کے لیے آپ کی زندگی برباد ہونے نہیں دے سکتا۔ آپ بھی ایسا مت کریں آپ خود کو برباد مت کریں وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیے جسے آپ سے محبت ہے ہی نہیں۔'' وہ عجیب کشمکش کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

''تم بھی تو یہی کر رہے ہو خود کو برباد وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیے جسے تم سے محبت ہے ہی نہیں۔'' وہ الٹا

سراپا سوال ہوئی تھی۔
"ثانی! میرا اب اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے اگر وہ واپس بھی آجائے تو میں اسے کبھی قبول نہیں کروں گا، میں اپنی زندگی کی کتاب سے محبت کا چیپٹر ہمیشہ کے لیے نکال چکا ہوں مجھے آپ سے یا کسی اور سے اب کبھی محبت نہیں ہوسکتی۔" وہ دل پر پتھر رکھ کر جبراً اسے ہر طرح سے یہ قائل کروانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کا خیال دل سے نکال دے۔
"کسی کی چاہت کے بدلے میں اسے ٹوٹ کر چاہنا اور پھر محبت محبت کہتے پھرنا در حقیقت محبت نہیں نفع کا سودا ہے اور ایسا سودا تو ہر کوئی کرسکتا ہے مگر میں محبت میں کاروبار نہیں کرتی۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہوئی اسے چونکا گئی تھی۔
"آپ کو تو میں پسند بھی نہیں تھا۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پایا۔
"گلمان جانتے ہو۔ محبت میں کبھی دہرائے کا امکان نہیں ہوتا۔ یہ ہوتی ہے تو ہوتی ہے نہیں ہوتی تو جتنے بھی جتن کرلو نہیں ہوتی۔ کوئی اچھا لگ جائے تو سب خامیاں اس کی اچانک خوبیوں کی اوڑھنی میں چھپ سی جاتی ہیں۔"
"ثانی پلیز بھول جائیں سب۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی تھی۔

ہر ظلم تیرا یاد ہے میں بھولا تو نہیں ہوں
اے وعدۂ فراموش میں تجھ سا تو نہیں ہوں

درد میں ڈوبی اس سنگر کی آواز نے ایک بار پھر اس کے دل کو دھڑکایا تھا۔
"گلمان! شروع شروع میں تم مجھے کبھی یاد نہیں آئے۔ بالکل بھی نہیں معمولی سا بھی نہیں پھر میں لاہور چلی گئی۔ تمہارے ٹیکسٹ آئے مگر میرا دل نہیں کیا تم سے بات کرنے کو۔ لاہور سے آنے کے بعد بھی مجھے تم کبھی یاد نہیں آئے پھر Mids ہوئے ان میں بھی تمہاری یاد نہیں آئی۔ پھر فائنل ٹرم آگئے اور فائنل ٹرم کے بعد مجھے تمہارے سوا کچھ یاد نہیں رہا۔ میں کیسے سمجھاؤں کچھ بھی میرے بس میں نہیں ہے۔ میں تھک چکی ہوں۔ میرا دل دماغ کے فیصلوں کو ماننے سے عاری ہے۔" اس کا ایک ایک لفظ حقیقت میں ڈوبا ہوا تھا۔
"پتا نہیں اللہ نے آپ کے دل میں میرے لیے محبت کیوں ڈالی شاید یہ میرا اور آپ کا امتحان ہو۔"
"سب امتحان میرے لیے کیوں ہوتے ہیں گلمان؟" وہ نادانی میں پوچھ بیٹھی۔
"ہر کسی کو یہی لگتا ہے کہ اس کا امتحان سب سے سخت ہے پر ثانی آپ جانتے ہو ناں کسی پر اس کی برداشت سے زیادہ وزن نہیں ڈالتے آپ کو خود کو مضبوط کرنا ہوگا۔"
جواباً وہ خاموش رہی۔ اس سے بحث کرنے کا مزید کوئی فائدہ نہیں تھا اسے محبت نہیں زندگی گزارنے کے لیے بس اس کا ساتھ چاہیے تھا مگر وہ اسے قائل نہیں کرسکی تھی۔

چپ چاپ سہی مصلحتاً وقت کے ہاتھوں
مجبور سہی وقت سے ہارا تو نہیں ہوں
اے وعدہ فراموش میں تجھ سا تو نہیں ہوں

سنگر اپنی دھن میں مگن گا رہا تھا اور وہ اپنی آنکھوں کے کنارے صاف کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ واپسی کا سفر آج پھر تھکا دینے والا تھا۔

☆......☆

ساحل پہ کھڑے ہو تمہیں کیا غم چلے جانا
میں ڈوب رہا ہوں ابھی ڈوبا تو نہیں ہوں

وہ جھیل کنارے اپنے مخصوص پتھر پر بیٹھی تھی۔ پاس کہیں کوئی سنگر ہاتھ میں گٹار تھامے کچھ گنگنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گانے والے کی آواز میں درد زیادہ تھا یا اس کے دل میں کہ اس کی آنکھیں بے اختیار چھلک اٹھیں۔

''کیا حال ہے ثانی؟'' گلمان نے اس کے ساتھ پڑے پتھر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''لوگوں کی عادت ہے۔ یہ سب جان کر بھی انجان بنے رہنے کی۔'' وہ رخ پھیر کر بولی تھی۔

''اللہ! اپنے بندوں کے حال سے کبھی انجان نہیں رہا۔'' اس نے واضح حقیقت بیان کی۔

''ہم کچھ بھی کر لیں لوگوں کے لیے ہماری ذات ہمیشہ بے مول ہی رہتی ہے۔'' وہ اپنی ذات میں مگن کھوئی کھوئی سی بول رہی تھی۔

''اللہ کے نزدیک اپنا ہر بندہ انمول ہوتا ہے ثانی۔''

''میں تمہارے لیے انمول بننا چاہتی ہوں گلمان۔'' اس کی حالت قابل رحم تھی۔

''آپ میرے لیے مقدس ہیں۔''

''میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

''اللہ آپ سے 70 ماؤں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔'' وہ بڑے رسان سے کہہ رہا تھا۔

''مجھے ایک ساتھ کی ضرورت ہے۔''

''وہ ہر لمحہ آپ کے ساتھ ہے ثانی۔'' بے مروت، بے لحاظ وہ دل ہی دل میں بری طرح تلملائی۔

''آپ بددعا دیں گی اگر میں وفا نہ کر سکا تو؟'' اسے خاموش دیکھ کر وہ پھر سے مخاطب ہوا تھا۔

''بددعا......وفا۔'' وہ مسکرائی۔ ''وفا تو ادھر ہوتی ہے جدھر محبت ہو گلمان سکندر اور تمہیں تو مجھ سے محبت ہے ہی نہیں۔''

''آپ کو تو ہے ناں میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں۔'' وہ بھی کم بے بس نہیں تھا۔

''آپ کو تو نہیں ہے ناں آپ بس یہ یاد رکھیں۔'' وہ آنسو پی کر بولی۔

☆......☆

رات کا آخری پہر بھی سرکنے کو بے قرار تھا۔ جب وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پورا فلیٹ رات کے گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے بیڈ پر سے اتری اور سائیڈ لیمپ آن کرنے کے بعد ایک کے بعد ایک کمرے میں لگے سارے سوئچز آن کرتی رہی۔ فلیٹ میں جتنی تیزی سے روشنیاں جگمگا رہی تھیں اس کا دل اتنی برق رفتاری سے اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔ جانے کیوں مگر اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ سینے میں قید دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی ساری کی ساری پسلیاں توڑ کر باہر آ گرے گا۔ اس نے بے جان ہوتے قدموں سے بمشکل برف کی مانند یخ ٹھنڈے فرش پر اپنا توازن قائم کیا اور پھر یونہی کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ تقریباً لڑکھڑاتی ہوئی کچن تک آئی۔ پانی کے چند گھونٹ حلق میں انڈیل کر وہ سنک کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور رگوں میں سرائیت کرتی یخ بستہ سردی میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مار کر دل میں جاری اتھل پتھل کو کنٹرول کرنے لگی۔ گھبراہٹ اور بڑھی تو وہ اپنے کمرے کی اکلوتی باہر لان میں کھلنے والی ایک بڑی گلاس ونڈو کے قریب آ کھڑی ہوئی، سامنے سیاہ افق پر دھند کی سفید چادر میں لپٹے ماہتاب کی آب و تاب اپنی جگہ تھی۔ وہ

ازل سے حسین تھا۔ ایک بے ساختہ سی سوچ نے اس کے دل پر دستک دی تو وہ بے خود ہو کر آگے بڑھی اس نے ہاتھ بڑھا کر چاند کو تھامنا چاہا مگر ناکام رہی۔ اس کے اور چاند کے بیچ ایک ونڈو حائل تھی۔ وہ پیچھے ہٹی اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا اپنا موبائل فون اٹھایا۔ بیڈ کے نیچے پڑے گلابی جاگنگ شوز پیروں میں اڑسے اور کرسی کی پشت پر پڑی سفید گرم شال کاندھوں پر رکھتے ہوئے باہر آ گئی۔ اس نے ایک اجنبی سی نظر سامنے موجود ویران سڑکوں پر دہرائی جو اس وقت گہرے سائے کی زد میں چاپ چاپ بچھی ہوئی تھیں اور پھر میں ڈور لاک کرنے کے بعد وہ چاند کے تعاقب میں چل دی۔ چاند چھونے کی آرزو، کچھ بے خودی، کچھ بہکی سی وہ ان معصوم بچوں کی مانند تھی جو رنگ برنگی تتلیوں کے تعاقب میں چلتے ہوئے دور کہیں بہت دور نکل جاتے ہیں دل ان بزرگ ماؤں کی طرح بے چین تھا جو دور نکل جانے والے اپنے جگر گوشوں کے انتظار میں بس دروازے کی منڈیر پر بیٹھی راہ تکتی رہتی ہیں۔

اس کے قدم رنگ برنگے پھولوں کے بیچ در بیچ ہوتی بل کھاتی پگڈنڈی پر رواں دواں تھے۔ سامنے پارک تھا۔ پارک کے سینٹر میں نیلے پانیوں اور سرمئی پتھروں پر مشتمل ایک چھوٹی جھیل تھی۔ اس جھیل کے پیچھے میلوں تک پھیلے کئی واکنگ ٹریکس تھے۔ وہ جھیل کے کنارے پر پڑے پتھروں میں سے اپنے مخصوص پتھر پر آ بیٹھی۔ چاند کا عکس اب جھیل کی سطح پر چھلک رہا تھا۔ واکنگ ٹریک پر ابھرتے عکس کے قدموں کی آہٹ نے رات کے گہرے سائے میں خلل ڈالا تو وہ ایک دم سے کھل اٹھی۔ وہ اس عکس کو پہچانتی تھی۔ وہ ان قدموں کی آہٹ سے بخوبی واقف تھی۔ قدموں کی آہٹ جتنی قریب ہو رہی تھی اس کا دل اتنی رفتار سے مزید دھڑک رہا تھا۔

”ہائے ثانی گڈ مارننگ۔“ گلمان کی پر جوش آواز پر اس نے بوجھل ہوتی پلکوں کو لرزش دی تو تیزی سے دھڑکتے دل کو وقت کے اس ایک لمحے میں ایک پل کے لیے بریک لگی تھی۔

”گڈ مارننگ۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”کیسی ہیں؟“ وہ اوورکوٹ میں ہاتھ ڈالتا ہوا اس کے پاس پڑے دوسرے پتھر پر آ بیٹھا۔

”کیسی ہو سکتی ہوں؟“ وہ الٹا سراپا سوال بنی۔

”کیا ہوا ثانی؟“ وہ اس کے انہونے سوال پر چونکا تھا۔

”کچھ ہونا تھا کیا گلمان سکندر۔“ اس نے پھر سے سوال داغ دیا۔

”نہیں تو آپ اتنی صبح یہاں۔“

”ہاں میں...... اتنی صبح یہاں۔“ وہ بے دلی سے مسکرائی۔

”تم جانتے ہو ایک سوچ ہے ایک خیال ہے امید کے ٹمٹماتے ہوئے اس آخری شعلے کی مانند جسے کھونے کے خوف سے ہم پلکیں بھی نہیں جھپکاتے کہ کہیں کوئی آوارہ ہوا کا جھونکا یا کوئی بے رحم سی پھوار اس آخری کرن کو بھی گل نہ کر دے۔ ایسا خیال جو ہر بار مجھے اداسی کے گہرے سمندر سے نکال کر آسودگی کی مہکتی فضا میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ جاننا چاہو گے وہ خیال کیا ہے؟“ اس کی آواز نم تھی اور اس سے بھی کہیں زیادہ سوگوار اس کا لہجہ تھا۔

وہ کیا کس کے بارے میں بات کر رہی تھی وہ نہیں جانتا تھا جبھی سامنے کھڑے گلمان نے ناسمجھی کے عالم میں کچھ بولے بنا اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ ایک بار پھر اپنی محسور کن دنیا کے محبت نامی سحر میں گرفتار ہو گئی۔

”جب میں سوچتی ہوں تم مجھ سے بیس قدم محض بیس قدم کی دوری پر ہو، جانتے ہو میری روح تک سرشار ہونے لگتی ہے۔ جب یہ خیال آتا ہے، ہم ایک فضا میں سانس لے رہے ہیں ایک چاند کے ساتھی ہیں ایک ہی وقت میں اس سے سب راز دل کہہ رہے ہیں ایک بارش ہمیں تر کرتی ہے ایک شبنم ہمیں نم کرتی ہے۔ آبشاراتے،

ہم راز پگڈنڈیاں بیس قدم محض بیس قدم کی دوری بھی کوئی دوری ہوتی ہے کیا مگر جانتے ہو یہ جو محبت ہوتی ہے نا اس کی تو مسافتیں ہی نہیں کھلتیں، محبت زادِ راہ بنے تو بیس برس کی مسافت بھی پل بھر میں طے ہو جاتی ہے۔ محبت ساتھ نہ دے تو بیس منٹ کی مسافت تاعمر مسافت ہی رہتی ہے یہ کم ہوتی ہے نہ طے ہو پاتی ہے۔ محبت کی کیمسٹری میں مسافت ہمیشہ کانسٹنٹ رہتی ہے یہ درد ہوتا ہے جو دل کے ہر کونے میں ہر لمحہ شدت اختیار کرتا رہتا ہے۔" آنسوؤں کے انبار آنکھوں میں جمع تھے۔ وہ سال بھر سے یونہی چھلک رہے تھے مگر ان کی رفتار اور مقدار بھی محبت میں مسافت کی مانند کونسٹنٹ تھی ان میں ذرا برابر بھی کمی نہیں آئی تھی۔

آنسو کبھی کم نہیں ہوئے۔ آنکھیں کتنی امیر ہوتی ہیں۔

"آپ دنیا میں یوں ٹوٹ کر چاہنے والی شاید آخری لڑکی ہیں۔" بے رخی کے بادل چھٹے تو گلمان نے بمشکل خاموشی کا تسلسل توڑا۔

"تم اس ٹوٹ کر چاہنے والی لڑکی کو توڑنے والے یقیناً پہلے مرد ہو۔"

"میں محبت کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم سے محبت نہ کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔"

"مجھے محبت کی اذیتوں سے خوف آتا ہے۔"

"مجھے یہ اذیتیں سکون بخشنے لگی ہیں گلمان۔"

"مت کریں اتنی محبت جل جائیں گی۔ راکھ ہو جائیں گی۔ تہی داماں رہ جائیں گی۔"

"مت آزماؤ خود کو تہارہ جاؤ گے بکھر جاؤ گے تھک جاؤ گے۔"

"میں بے بس ہوں ثانی۔"

"میں بھی اپنے بس میں کہاں ہوں گلمان؟"

"آپ کو مجھ سے محبت نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"ہاں مجھے تم سے محبت نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"میرے خیال میں مجھے اب چلنا چاہیے۔" اس نے واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"ہاں تمہیں اب چلے ہی جانا چاہیے، دور بہت دور میری یادوں کے دریچوں سے پرے دور کہیں اس نگر جہاں تم صرف گلمان تھے، جہاں میرا دل صرف سروش درانی کا دل تھا۔" وہ جا چکا تھا۔ وہ سسکی تھی۔ ہوا سرد تھی اور وہ برف کی مانند منجمد تھی۔ واپس پلٹنا اس کے لیے کبھی آسان نہیں رہا تھا۔

☆......☆

"ہیلو سروش! کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟" وہ کالونی کی دور تک پھیلی ہوئی سڑکوں پر یونہی بے وجہ ٹہل رہی تھی۔ کچھ بوجھل سی کچھ اداس سی کہ ایک اجنبی مگر زندگی سے بھرپور شوخ سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"جی۔" اس نے ناسمجھی کے عالم میں سامنے کھڑے وجود پر نظر ڈالی۔ سرخ جینز اور ڈارک بلیو ٹاپ میں ملبوس وہ دھان پان سی سنہری بالوں والی جرمن لڑکی لگ بھگ اسی کی ہم عمر تھی اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں ایک مخصوص چمک تھی اور مسلسل تیز چل کر آنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہی تھی۔

"کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟" سروش نے اپنے تھکے ماندے ذہن کے گھوڑے دوڑائے مگر جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس سنہری بالوں اور ہیزل آنکھوں والی لڑکی کو نہیں جانتی تو بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"آں...... نہیں۔" وہ ہوا کے زور پر بے ترتیب ہوتی سنہری بالوں کی کچھ آزاد لٹوں کو کیچر میں قید کرتی ہوئی شائستگی سے بولی۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے گلمان کے بارے میں۔" اس کے چہرے کا رنگ تھوڑا مختلف ہوا۔ وہ شاید ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی۔

"جی کہیے۔" وہ دونوں ایک ساتھ چرمر کرتے پتوں کے تعاقب میں چلنے لگی۔

"مجھے نتالیہ گاڈفرے کہتے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"اور مجھے سروش درانی۔" وہ کشمکش کے عالم میں بولی۔

"سروش۔" وہ کچھ پل سانس لینے کی غرض سے رکی۔

"آہ میری پیاری مجھے نہیں لگتا مجھے یوں اس طرح تم دونوں کے بیچ مداخلت کرنی چاہیے یا پھر شاید کرنی چاہیے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی مگر جب بات ایک لڑکی کی ہو تو حقیقت میں، میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ مجھے ان امور پر بات کرنی چاہیے۔" اب وہ دونوں سڑک کے کنارے پر پڑے بینچ پر براجمان ہو چکی تھیں۔ ان کے سامنے پیدل چلنے والوں کا ایک بڑا ہجوم تھا۔ اس نے لوگوں کے ہجوم میں کچھ تلاش کرتی سروش کو دیکھا جس کی کیفیت اب بھی کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔

"سروش۔" وہ شاید اس کی ساری توجہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں کہیں آپ، میں سن رہی ہوں۔" وہ نظروں کا زاویہ بدلے بغیر قدرے بے رخی سے بولی تھی۔

"کچھ دن پہلے گلمان مجھ سے ملا تو وہ حقیقت میں بہت اپ سیٹ تھا۔ میرا خیال تھا وجہ کوئی اور ہو گی مگر تب اس نے غیر متوقع طور پر مجھے آپ کے بارے میں بتایا۔"

"میرے بارے میں......" وہ چونکی۔

"سروش! وہ بہت کیئرنگ اور سینسر لڑکا ہے۔ میں اسے پچھلے پانچ سالوں سے جانتی ہوں ہم ایک ساتھ کئی بار ٹریکنگ کر چکے ہیں وہ کبھی کسی کے آنسوؤں کی وجہ نہیں بننا چاہتا مگر وہ سوچتا ہے کہ وہ آپ کے آنسوؤں کی وجہ بن رہا ہے۔" نتالیہ ٹھہرے ہوئے دھیمے لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔

"اوہ...... مجھے معاف کرنا شاید میں بہت زیادہ جذباتی ہوں۔" فی الوقت اس سے صرف اتنا ہی بن پایا۔ محبت کی تذلیل وہ بھی کسی تیسرے کے ہاتھوں بے اختیار کئی دغاباز آنسو اس کے شفاف چہرے پر پھسل پڑے۔

"ہاں...... اس بارے میں بھی گلمان نے مجھے بتایا ہے، تب میں نے اسے مدد کی پیشکش کی تو اس نے کہا کہ شاید وہ میں ہوں جو آپ کو بہتر سمجھا سکوں اور میرے پاس یہاں آپ کو کہنے کے لیے صرف اور صرف ایک جملہ ہے۔ "محبت تک دسترس جب ممکن نہ رہے تو خاموشی ہم لڑکیوں پر واجب ہو جاتی ہے۔" وہ ایک بار پھر اپنے سنہری بالوں کو چہرے سے ہٹا رہی تھی۔ اس کی ہیزل آنکھیں سروش کے سپاٹ چہرے پر منجمد تھیں۔

"میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا کہ میں گلمان سکندر کے لیے پریشانی کی وجہ بنوں، خیر میں اسے مزید پریشان نہیں کروں گی، میں خاموش رہوں گی۔" وہ ایک بار پھر نفس کے ہاتھوں پھسل رہی تھی وہ جذباتی ہو رہی تھی آنسو اس کی سیاہ آنکھوں سے چھلک رہے تھے۔

"سروش! اس کے بارے میں بات کون کر رہا ہے، میں تمہارے لیے پریشان ہوں میں خود ایک لڑکی ہوں۔" اگلے کتنے ہی پل خاموشی میں سرک گئے۔

"سروش!" ثنالیہ نے اسے کئی بار مخاطب کرنا چاہا مگر وہ چپ سادھے بیٹھی رہی۔
وہ مایوس کن لہجے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ثنالیہ! میں بے بس ہوں۔" اس سے بھی زیادہ مایوس کن لہجہ سروش کا تھا۔
"میں جانتی ہوں مام جوزفینا کہتی ہیں ہر لڑکی کو محبت کرنے کا حق ہوتا ہے مگر وہ محبت اسے مل بھی جائے یہ حق قسمت اسے شاذونادر ہی بخشتی ہے۔" وہ اپنا ہاتھ سروش کے لرزتے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔
اس کے لہجے میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ ایک روانی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک اچھی مقرر تھی یا پھر شاید ہو سکتی تھی۔
"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔" سروش نے بے دلی سے کہا۔
"تم نے مجھ سے گلمان سکندر کے لیے بات کی۔" وہ آنسوؤں پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔
"میں نے آپ سے گلمان سکندر کے لیے نہیں صرف آپ کے لیے بات کی۔"
"تم مجھے نہیں جانتیں۔"
"مگر جان گئی ہوں۔"
"گلمان نے کیا کہا تھا؟"
"یہی کہ آپ اسے بے پناہ چاہتی ہیں۔"
"ثنالیہ! یہ محبت بہت مشکل ہے۔" وہ بے بس ہوئی۔
"سروش! بہت مشکل ہے میں جانتی ہوں مگر اپنی ذات کی راحت کے لیے ہم کسی کو اذیت تو نہیں دے سکتے ناں۔"
"تم...... تم پسند کرتی ہو کسی کو۔" یونہی بس دل کی تسکین کی خاطر وہ بلاوجہ پوچھ بیٹھی۔ وہ مسکرائی، اس کی مسکراہٹ میں بھی ایک درد چھپا تھا۔ جس سے سروش بھی آشنا ہوئی تھی۔
"پسند بہت چھوٹا لفظ ہے۔"
"میں اس سے بات نہیں کروں گی۔" وہ بھی مسکرائی۔
"بات نہ کرنے سے دل کا تعلق تو نہیں ٹوٹے گا مگر صبر آجائے گا۔ ایک ہفتے ایک مہینے یا پھر شاید ایک سال کے بعد۔"
"اسے کوئی فرق نہیں پڑتا پر وہ مجھے رلاتا ہے۔"
"وہ آپ کو نہیں رلاتا محبت آپ کو رلاتی ہے۔"
"وہ چاہتا تو اپنا آپ مجھے سونپ سکتا تھا مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ اسے میرے آنسوؤں سے تسکین ملتی ہے یا پھر شاید دنیا کے ہر مرد کو دنیا کی ہر عورت کے آنسوؤں سے تسکین ملتی ہے۔" وہ ایک بار پھر سسکی تھی۔
"جب وہ خود کسی کے پاس ہے تو آپ کو اپنا وجود دے کر کیا کرے۔" وہ چپ رہی اس کے پاس ثنالیہ کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔
"عورت کی ایک عظمت ہوتی ہے سروش! اور مرد کے سامنے اسے محبت میں بھی جھکنا نہیں چاہیے۔"
"محبت انسان کو جھکنا سکھا دیتی ہے ثنالیہ۔"
"محبت جھکنا سکھا دیتی ہے۔ میں جانتی ہوں مگر آپ کو اتنا ہی جھکنا چاہیے جہاں تک آپ کو لگے آپ کی عظمت قائم ہے۔"

''میں کوشش کروں گی۔'' وہ بے بسی سے بولی۔
''جانتی ہو سروش! میں نے بہت مانگا کسی کو پھر جب مجھے لگا میری محبت پر حرف آرہا ہے تو میں خاموش ہو گئی پھر اوپر والے نے یہ فیصلہ دے دیا کہ وہ میرے حق میں کبھی بہتر نہیں رہا۔''
''گلمان سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا اور یہ بات جانتی ہیں آپ۔''
''لیکن اوپر والا یہ نہیں چاہتا کہ آپ ایک وجود کے ساتھ رہیں، وہ چاہتا ہے آپ ایک روح کے ساتھ زندگی گزاریں۔ پیار والی زندگی ایک پاک روح کے ساتھ۔''
''روحیں تو سب کی پاک ہوتی ہیں ثنالیہ! یہ تو نفس ہے جو اسے داغدار بناتا ہے۔ یوں تو ہم اپنی پاک روحوں کے بھی گناہ گار ہوئے ناں۔'' سروش نے معصومیت سے کہا تھا۔
''ہاں اس میں کوئی شک نہیں وہ آپ کی وجہ سے خاصا ڈسٹرب ہے۔ وہ کہتا ہے وہ آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتا۔''
''ایسا گلمان نے کہا؟'' وہ چہکی۔
''ہاں ایسا گلمان نے کہا۔'' اس نے جواب دیا۔
''بس اتنا ہی؟'' سروش نے نیا سوال کیا۔
''ہاں بس اتنا ہی۔'' ثنالیہ تسلی سے بولی۔
''وہ کیوں ڈسٹرب ہے اسے نہیں ہونا چاہیے اس کی طرف سے کوئی بھاڑ میں جائے۔'' سروش جذباتی ہوئی تھی۔
''آپ غلط کہہ رہی ہیں۔'' ثنالیہ نے اسے سمجھانا چاہا۔
''ہاں میں غلط ہوں۔''
''وہ نہیں چاہتا آپ اس راستے سے گزریں جس سے وہ گزرا ہے یا گزر رہا ہے۔''
''اس بات سے اسے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔''
''آپ کو بھاڑ میں بھیجنا ہوتا تو وہ کب کا چھوڑ چکا ہوتا، آپ ان بے معنی دھمکیوں کی پروا نہ کریں۔''
''چھوڑ دیتا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''
''اسے فرق پڑتا ہے سروش! کیونکہ وہ نہیں چاہتا وہ کسی کی بربادی کی وجہ بنے۔''
''میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا وہ اس کے لیے بھی یہی سب کرتا۔''
''ہاں وہ اس کے لیے بھی یہی کرتا وہ کسی کی بربادی کی وجہ نہیں بننا چاہتا۔'' ثنالیہ نے لفظ کسی پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''تو کیا میں اس کے لیے کسی ہوں محض کسی؟'' سروش نے تصدیق چاہی۔
''ہاں وہ ایسا ہی ہے، بہت اچھا اور شاید اس کی کمزوری ہے کہ وہ بہت اچھا ہے ہٹ دھرم ہوتا تو آج بہت خوش ہوتا۔'' ثنالیہ نے بات بدلی۔
''وہ سب سے اچھا ہے بس وہ میرا نہیں ہے۔'' وہ پھر سے سسکی۔
''وہ کسی کا بھی نہیں ہو سکتا اب۔'' ثنالیہ چلائی۔ اس کا چلانا سروش کے دل پر چھری چلانے لگا۔
''آپ جب اسے اس سے مانگتی ہیں اور وہ دے نہیں پاتا تو اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آتا ہے۔'' ثنالیہ نے اپنا لہجہ نارمل کرتے ہوئے کہا۔
''مجھے وہ چاہیے تھا مجھے اس کی ضرورت تھی۔'' وہ سسک رہی تھی۔

''تم لوگ نہیں سمجھتے ناں تم نہ وہ نہ کوئی اور تم لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے۔'' وہ مزید سسکی۔
''شاید ہر محبت کرنے والا یہی کہتا ہے کہ اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ہر ایک محبت کرنے والا دوسرے کو سمجھ سکتا ہے میری پیاری۔''
''آپ کہو ناں اسے وہ مجھے اپنا لے۔'' وہ تم سے اچانک آپ پر آئی تھی۔
''ایک خالی وجود کے ساتھ زندگی گزار لیں گی؟''
''میں اسے خوشیوں سے بھردوں گی۔'' سروش نے پورے یقین سے کہا۔
وہ مسکرائی پھر سے وہی درد بھری مسکان۔
''بھول ہے آپ کی محبت ایک بار ہوتی ہے بار بار جو ہو وہ محبت نہیں ہوتی۔''
''آپ غلط کہتی ہیں محبت ہر موڑ پر ہوتی ہے انسان کو زندگی گزارنے کے لیے ہر موڑ پر صنفِ مخالف کی ضرورت پڑتی ہے پھر وہ چاہے نہ چاہے محبت اسے مجبور کرتی ہے شاید! محبت اپنا آپ خود منواتی ہے۔''
''وہ اپنی زندگی میں کسی کو نہیں لانا چاہتا، اتنی سی بات آپ کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔''
''اور میں اس کی زندگی میں کہیں آتی بھی نہیں ہوں۔ ثنالیہ وہ انسان ہے اور وہ اکیلا زندگی نہیں گزار سکتا۔''
''آپ جیسے چاہتی ہیں واقعی آپ ویسے نہیں ہیں اس کی لائف میں۔''
''کیوں نہیں ہوں؟'' اس نے وضاحت چاہی۔
''کیوں کہ وہ کسی اور سے عشق کرتا ہے عشق سمجھتی ہیں ناں آپ۔'' سروش خاموش رہی۔
''آپ کو کوئی کہے مجھے اپنا آپ سونپ دو سروش تو کیا آپ دے دیں گی۔'' ثنالیہ نے اسے دیکھتے ہوئے ایک نیا سوال پوچھا تھا۔
''ہاں گلمان کو بس۔'' سروش حتمی انداز میں بولی۔
''جی تو وہ بھی اپنا آپ صرف اسی کو دے گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔''
''ایسے زندگی نہیں گزرتی۔'' وہ تڑپی۔
''آپ کو میں بھی کب سے یہی سمجھا رہی ہوں ایک شخص کا روگ لیے زندگی نہیں گزرتی۔'' وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔
''میں کسی کا دل نہیں توڑتی ثنالیہ۔''
''وہ بھی نہیں توڑتا سروش۔''
''پر میرا تو توڑتا ہے۔'' اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔
''اور ہر بار توڑتا ہے۔'' وہ مزید بولی۔
''میں آپ کو خوابوں کی اس دلدل میں دھنسنے سے بچانا چاہتی ہوں جس میں سے آپ دوبارہ کبھی نہیں نکل سکتیں۔'' ثنالیہ کے چہرے پر گہری سوچیں اڈنے لگیں۔
''پتا ہے ثنالیہ ساری زندگی میں نے خود کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ جھکنے نہیں دیا پہلی بار زندگی میں پہلی بار میں نے کسی شخص کے سامنے جھکنا سیکھا تھا اور اس پہلی بار کے جھکنے نے مجھے اندر تک ویران کر دیا۔ آج پہلی بار مجھے زندگی گزارنے اور زندگی جینے میں فرق سمجھ آ رہا ہے۔ میں جانتی ہوں ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی مجھے ہی زندگی کے فیصلوں کے آگے سر خم کرنا ہے۔ قسمت کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہے مگر پھر بھی مجھے روکھی پھیکی زندگی گزارنے سے ڈر

لگتا ہے۔ میں زندگی جینا چاہتی ہوں۔ ویسی زندگی جو میں نے اس کے ساتھ پہاڑوں پر جی، ویسی زندگی جو میں نے اس کے ساتھ یونیورسٹی میں، کوریڈور میں، لائبریری میں، میری ادبی تقریبات میں، اس کے اسپورٹس فنکشن اور ایڈونچرز میں اپنے اردگرد ہر پل و ہر لمحہ اسے محسوس کرتے ہوئے جی، میں چاہوں بھی تو اپنے لمحات واپس نہیں لا سکتی، اس کے بغیر جینا میرے بس میں نہیں رہا مگر میں زندگی گزارلوں گی کسی نہ کسی طرح پگڈنڈی پر بچھے ہوئے ان خشک زرد پتوں کی مانند جن کے گہرے سکوت اور اداسی سے کبھی مجھے خوف آیا کرتا تھا۔'' آنسو نازک پلکوں کی باڑ توڑ کر اس کے گلابی گالوں پر آ پھسلے تھے اور اس نے بھی انہیں روکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ اٹھی اور دبے قدموں کے ساتھ واپس پلٹنے لگی۔ نتالیہ وہیں بیٹھی قدرے بے بسی سے اسے یوں روتا ہوا پلٹتا دیکھتی رہی۔

☆......☆

''ثانی! کیا ہوا رو کیوں رہی ہیں؟'' کالونی کے گیٹ پر ایک بار پھر وہ اس کے روبرو کھڑا دستِ سوال تھا۔ وہ کب اس کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ وہ کہاں کہاں خود کو مضبوط کرتی پھرتی۔

''کچھ نہیں۔ وہ بس ایسے ہی۔'' وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے لگتی بھی مگر اچانک بلک بلک کر رو دی۔

''ثانی...... آر یو اوکے؟''

''گلمان...... وہ...... نتالیہ......'' بہتے آنسوؤں کی شدت اس قدر تھی کہ وہ چاہ کر بھی اپنی بات پوری نہ کر پائی۔

''جی کیا ہوا نتالیہ کو اس نے آپ سے کچھ کہا۔''

''اس نے جو بھی کہا وہ ٹھیک کہا۔''

''او گاڈ! آپ رونا بند کریں اس کی باتوں پر دھیان نہ دیں وہ پاگل ہے۔ بس...... چپ...... سب لوگ دیکھ رہے ہیں آپ ادھر بیٹھیں۔'' وہ اسے لے کر قریبی بینچ پر بیٹھ گیا اور وہ باقاعدہ ہچکیاں لے کر رونے لگی اور مسلسل روتی چلی گئی۔ جب رو رو کر تھک گئی تو اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ گلمان کی نگاہیں اس کی سرخ ہوتی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ ایک پل محض اس ایک پل میں اس کے ہر احساس سے عاری پتھر دل پر ایک ضرب لگی تھی۔ بہت گہری ضرب...... بہت بے دردی۔

''ثانی میں نتالیہ کو سمجھا دوں گا وہ آئندہ آپ سے ایسی کوئی بات نہیں کرے گی میں نے اس سے یہ سب ایک مہینہ پہلے ڈسکس کیا تھا۔ میں اسے بتا دوں گا اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس اب آپ نے رونا نہیں اوکے؟'' گلمان نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا تو جواب میں سروش نے فوراً معصوم بچوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گڈ گرل۔'' اب میری بات دھیان سے سنیں میں کچھ دنوں کے لیے کے ٹو ایکسی ڈیشن پر جا رہا ہوں۔ نتالیہ اپنے بھائی کرس کے ساتھ دو مہینے کے لیے پاکستان آئی تھی۔ کرس بائیولوجسٹ ہے اور آج کل وہ فیری میڈوز کے قریب جنگلوں میں کچھ نئے پلانٹس سرچ کرنے گیا ہوا ہے۔ درحقیقت وہ ان پودوں پر ایک کتاب لکھ رہا ہے۔ وہ اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ پہلے تو میں روزانہ اسے کمپنی دے دیتا تھا مگر اب چونکہ میں یہاں نہیں ہوں گا تو پلیز آپ اسے اپنے ساتھ کچھ دنوں کے لیے ایڈجسٹ کرلیں۔ مجھے بھی فکر نہیں رہے گی اور کرس بھی آسانی سے اپنی کتاب مکمل کرلے گا۔''

''اوکے وہ چاہیں تو کل ہی مجھے جوائن کرلیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' سروش نے ایک بار پھر فراخ دلی دکھائی تھی۔

''بلکہ یہ میرے لیے خوش قسمتی کی بات ہوگی اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں۔'' وہ مزید بولی تھی۔

’’تھینک یو سوچ ثانی! اپنا خیال رکھیے گا اور اگر زندگی آپ کو کبھی دوسرا موقع دے تو جذباتی ہو کر اسے گنوائیے گا مت۔‘‘ پہلی بار اس کا چہرہ آس پاس پھیلے پتوں کی مانند سپاٹ بنا تھا۔

’’میں سمجھی نہیں گلمان۔‘‘ اور وہ واقعی اس کی بات کو نہیں سمجھی تھی۔

’’ثانی!‘‘ سرگوشی کی طرح اس کا نام گلمان کے لبوں سے کسی مقدس ورد کی مانند پھسلا تھا۔

’’میں چاہتا ہوں آپ ایک نئی زندگی کی شروعات کریں کسی ایسے کے ساتھ جو بس آپ کے لیے ہو یقین جانیے میری خوشی اسی میں ہے۔‘‘ وہ پل بھر میں جذباتی ہوا۔

’’تم......تم جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر۔‘‘ اس نے کسی ڈوبتی امید کے تحت پوچھا تھا۔

’’جی جا رہا ہوں مگر وعدہ کرتا ہوں جلد لوٹ آؤں گا میرا انتظار کیجیے گا۔‘‘ اس نے آہستگی سے کہا۔

’’کریں گی ناں؟‘‘ امید کے کئی جگنو اس کی اداس آنکھوں میں بھی ابھرے تھے۔

’’جی۔‘‘ سروش نے دل کے تلاطم میں ہلچل مچاتی موجوں کو سمجھا بجھا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆

وہ سمر ویکیشنز کی کبھی نہ ختم ہونے والی طویل چھٹیوں کا پہلا دن تھا۔ سروش درانی اسٹو پر جھکی کافی بنانے میں مگن تھی۔ اوون میں براؤنی بیک ہو رہی تھی۔ یہ ہلکا سا ناشتا نتالیہ کی من پسند ڈائٹ تھی۔ نتالیہ کے ساتھ اس کی دوستی ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید پروان چڑھ رہی تھی جبھی تو وہ علی الصبح اپنی پیاری نیند کو الوداع کہہ کر بڑے انہماک سے اس کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔

’’ہائے گڈ مارننگ۔‘‘ نتالیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے گرم جوشی سے کہا۔

’’گڈ مارننگ۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

’’آہ......تم جرمن جانتی ہو۔‘‘ وہ حیران ہوئی۔

’’ہاں مگر اس سے زیادہ نہیں۔‘‘ وہ پھر سے مسکرانے لگی۔

’’ثانی۔‘‘ نتالیہ کے یوں مخاطب کیے جانے پر اس کی ہنسی کو اچانک بریک لگی تھی۔

’’ہوں۔‘‘ وہ سر جھٹکا کر بولی۔

’’آر یو اوکے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ اس نے اپنی سرد نگاہیں نتالیہ کے سنہری چہرے پر جمائیں۔

’’پتا نہیں۔‘‘ وہ ایک بار پھر اسٹو کی طرف متوجہ ہوئی۔

’’تم اسے بھول کیوں نہیں جاتیں۔‘‘ نتالیہ نے صلاح دی۔

’’میں کوشش کروں گی۔‘‘ وہ بحث کے موڈ میں نہ تھی۔

’’سنو! یہ کوشش والی بات میرا دل رکھنے کے لیے مت کہو کوشش کرو اپنی خوشی کے لیے اور جو کام خوش ہو کر کیا جائے وہ ہمیشہ خوشی دیا کرتا ہے۔‘‘

’’تمہارے نزدیک میرے لیے گلمان کو بھلانا اتنا آسان ہے کیا؟‘‘ وہ کافی مگ میں انڈیل کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔

’’تم گلمان کو بھول سکتی ہو۔ محبت کو ایک حادثہ سمجھ کر اور حادثات بظاہر ایسے لگتے ہیں کہ کبھی بھولے نہیں جا سکتے مگر بھول جاتے ہیں ذرا سی کوشش کرنے سے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی میں کچھ بھی ناممکن

نہیں ہوتا ہر چیز کا کوئی نہ کوئی متبادل ضرور ہوتا ہے۔"
"دنیا میں کوئی بھی شخص میرے لیے گلمان سکندر کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ تم جانتی ہو گلمان نارمل نہیں ہے۔ وہ نارمل لوگوں کی طرح خودغرض اور تنگ نظر نہیں ہے۔ نارمل لوگ مطلب پرست ہوا کرتے ہیں اور ابنارمل لوگوں سے محبت نہیں عشق ہوا کرتا ہے۔ مجھے اس سے عشق ہے کیونکہ مجھے وہ بھی اس خود فریب دنیا کا باسی نہیں لگا۔" اس نے لان میں چہکتی ہوئی چڑیوں کے غول کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
"یہاں تم غلط ہو میری پیاری۔" نتالیہ نے اس کی بات کو حتمی انداز میں کہتے ہوئے کاٹا تھا۔
"نارمل لوگ بہتر ہیں، وجہ عقل ہے، عقل کہتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ لوگوں جیسے رہو، جن لوگوں کے لیے آپ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ان لوگوں کو بار بار اپنے وجود کا احساس مت دلاؤ، امید اتنی رکھو جو اذیت نہ دے رشتے اتنے بناؤ جو سنبھالے جا سکیں۔ یہاں ایک اور وجہ بھی سامنے آتی ہے اور وہ ہے تمہارا مذہب جو جنونیت کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ تمہارا مذہب اعتدال کا نام ہے اگر تم اپنے مذہب کی پیروکار ہو تو تمہیں نارمل ہونا پڑے گا فارمیلٹی کو ترجیح دینا پڑے گی۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں مگر اپنے جذبات تھوڑے ماند رکھو۔ میری پیاری تم ایک نارمل لڑکی ہو اور اگر تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم ایک نارمل لڑکی نہیں ہو تو تمہیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ابنارمل ہو کر بھی تم سکون میں نہیں ہو۔"
نتالیہ آل راؤنڈر تھی اس کے پاس دنیا کے ہر مذہب کے بارے میں کچھ نہ کچھ نالج محفوظ تھی۔ وہ کسی بھی ٹاپک پر آسانی سے بحث کر سکتی تھی جیسا کہ وہ اب کر رہی تھی۔
"تم ٹھیک کہتی ہو ابنارمل لوگ بھی سکون میں نہیں رہتے۔ جبھی وہ مارے مارے پھرتے ہیں سکون کی تلاش میں دیوانہ وار بھاگتے ہوئے خانہ بدوشوں کی طرح۔" وہ شکست تسلیم کرتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھی۔
"ذرا غور کرو ثانی! کیا اسی چیز سے تمہارا مذہب منع نہیں کرتا تمہ: مذہب وقار والی زندگی عنایت کرتا ہے۔ سکون والی زندگی۔" وہ آخری لفظ زندگی پر زور دے کر بولی تو سروش کے ذہن پر لگے قفل کھلتے چلے گئے۔

☆......☆

اس کی بجھی سیاہ آنکھوں میں کچھ دفن تھا جو انہیں کبھی چمکنے نہیں دیتا تھا۔ وہ وحشت تھی۔ فتور تھا یا کسی لاحاصل منزل کو پا لینے کی آرزو وہ اندازہ لگانے سے قاصر ہی رہتی تھی۔ کسی بھی تاثر سے بے نیاز اس کی گہری اداس آنکھیں وہ آنکھیں ویران تھیں۔ وہ آنکھیں ہر تاثر سے خالی تھیں مگر پھر بھی ان خالی آنکھوں میں اس کے لیے سب کچھ موجود ہوتا تھا۔ وہ نظریں بہت کم ملاتا تھا مگر جب بھی ملاتا تھا اس کی ویران آنکھوں سے تشنگی میں لپٹا ایک عکس جھلکتا تھا اور وہ عکس اس کا اپنا عکس ہوتا تھا۔ جسے دیکھ کر اس کی دنیا آباد ہونے لگتی تھی۔ وہ بنجارہ تھا اور وہ اکثر کہتا تھا۔
"میری راہوں میں دور دراز تک منزلوں کے نشان نہیں ہیں۔ فقط سفر ہے طویل تر کبھی نہ ختم ہونے والا کٹھور سفر۔" اور اس بنجارے کو اپنی ایک انہونی منزل کی تلاش میں نکلے پورے 16 روز بیت چکے تھے۔ وہ باخبر تھی ان حسین وادیوں کے درمیان وہ جس حال میں ہوگا بہت خوش ہوگا۔ وہ خود اس کی خوشی میں خوش تھی مگر اس کا دل تھا جو ہزار وسوسوں کے زیر اثر تھا۔ وہ بخوبی جانتی تھی اسے حکم سفر ہے اور وہ ایک حسین بے حد حسین منزل کی طرف محو سفر ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی حسن جیسا بھی ہو ظالم ضرور ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ظالم چیزیں بھی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑا کرتیں۔ وہ پھر سے اداس ہونے لگی تھی اسی اداسی کو خود میں سموتے ہوئے اس نے گلابی متورم آنکھوں سے

اوپر کی جانب دیکھا۔ گلابی شام کے لمحہ بہ لمحہ منجمد ہوتے مخمور سائے کی آڑ میں ایک تواتر سے اڑان بھرتے۔ دن بھر کی مسافتیں طے کرتے تھکے ماندے سفید پرندے گھر کو لوٹ رہے تھے۔ وہ اپنی اداس سوچوں کے حصار سے نکلتی ہوئی ہاتھ پھیلا کر سفید بادلوں کی اوٹ میں چھپے نیلے افق کے سائے تلے آ کھڑی ہوئی۔ زمین اداس تھی۔ پھولوں سے مہکتی پگڈنڈیاں سنسان پڑی تھیں دور بہت دور سے گزرنے والی مین روڈ پر مسافروں سے بھری گاڑیاں بنا کسی شور شرابے کے اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھیں۔ ہوا تیز تھی مگر اس کی تیزی میں بھی ایک خاص ٹھہراؤ موجود تھا۔

سورج تمام فاصلے طے کرنے کے بعد بنا کچھ کہے اپنی آخری حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے نم آنکھوں کے بھیگے گوشوں سے افق پر منڈلاتے ہوئے سفید بادلوں کے جھرمٹ کو دیکھا، جہاں شام کی گلابی پر اب رات کی تاریکی اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد اس تاریکی کے وسط سے چاند نے نکلنا تھا اپنے حسن کے سحر میں جکڑتا عظیم چوٹیوں پر رقص کرتا روشنی بکھیرتا خوب صورت سا ٹکڑا جسے سب چاند کہتے تھے۔ اسے چاند سے محبت تھی اسے اسی سے محبت تھی عجیب خواہشیں تھی، عجیب محبتیں تھیں جن تک رسائی نہ تھی، جو کسی کے ہاتھ نہ آتی تھیں۔ بس دامن چھڑا کر ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ پھر چاند کے لمس کو ترستے کئی ستارے ایک ساتھ نمودار ہوئے اور فلک کی سیاہ چادر پر روشن جگنوؤں کی مانند جگمگانے لگے۔ عجیب سنگت تھی جو ابھی بھی دوری پر تھی۔ عجیب میل تھا جہاں خوشی اداسی کا بغل مارے بیٹھی تھی۔

”موسم تو سبھی حسین ہوتے ہیں ثانی! بس دل کا موسم خوشگوار ہونا چاہیے۔“ سائے میں ایک سرگوشی ہوئی تھی۔ وہ چونکی تو بارش کی دو ننھی بوندیں اس کے بہتے آنسوؤں کے تعاقب میں بہنے لگیں۔

اسے بارش سے محبت تھی کتنے پل جانے کتنے پل وہ ان ننھے قطروں کو آب حیات مان کر خود میں سموتی رہی، اسے چاند پسند تھا اور وہ کسی جوگن کی مانند چاندنی کا عکس اوڑھے بیٹھی رہی۔ تاریک سائے پھیل رہے تھے۔ وہ اداس تھی۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی اور وہ فلک پر جگ مگ کرتے چاند ستاروں کو اپنا غمگسار بنائے بیٹھی رہی۔ کئی جگنو اس کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ دور سے کسی کوئل کی کوک بھی سنائی دے رہی تھی۔ سب لوٹ آئے تھے۔ ایک وہ ہی نہیں پلٹا تھا جس کے انتظار میں آنکھیں راکھ ہوئی تھیں، اس کا ہم نوا...... اس کا ہم سخن...... گلمان سکندر۔

☆......☆

وہ دونوں لان میں بیٹھی افق کی چادر پر ننھے ستاروں کے بیچ چاند ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ وہ ایک خوشگوار پر سکون اور ٹھنڈی رات تھی۔

”یار! ویسے چاند کی اہمیت رات کو محسوس ہوتی ہے جب ہر طرف انتہائی تاریکی اور بے نوری سی پھیلی ہوئی ہے۔ جب ستارے بھی اپنی تمام تر کاوشوں کے باوجود روشنی دینے میں ناکام ہو جاتے ہیں پھر محسوس ہوتا ہے اگر چاند ہوتا تو شاید یہ سبھی تاریکیاں مٹ جاتیں اور پھر سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی ہمیں چاند کی قدر بھول جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی زندگی میں کوئی اپنا جو ہم سے بچھڑ جائے دنیا کی بھیڑ میں تو ہمیں محسوس کم ہوتا ہے مگر ایک مخصوص تاریکی کا وقت ہوتا ہے۔ جب اس اپنے کی کمی ٹوٹ ٹوٹ کر محسوس ہوتی ہے۔“ نتالیہ کا فلاسفر ایک بار پھر جاگ چکا تھا۔

”ہوتے ہیں ناں کچھ لوگ جن کے لیے ہماری ذات صدا گمنام ہی رہتی ہے جنہیں ہمارے ہونے نہ ہونے

سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جن کے لیے ہم ہمیشہ بے مول ہی رہتے ہیں ایسے لوگوں کو ہماری بے بسی کا احساس کبھی نہیں ہوتا۔" سروش درانی نے بھیگی پلکوں کے کناروں کو بند کرتے ہوئے ایک نئی دلیل پیش کی۔

"ہوتا ہے اک موڑ پر۔ احساس بھی خوب ہوتا ہے مگر اس موڑ پر اظہار کی گنجائش نہیں رہتی اور اس وقت کی بے بسی کو پچھتاوا کہا جاتا ہے۔" نثالیہ کے جواب نے اسے کسی حد تک مطمئن کیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی اس محبت کے پیچھے، سنو! اگر میں پاگل ہو گئی تو مجھ سے لاتعلق مت ہو جانا۔" اس نے کسی انجان خدشے کے تحت دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بے چارگی کے عالم میں کہا تو نثالیہ کے ساکن لبوں پر بے ساختہ ہنسی پھیل گئی۔

"جب تم پاگل ہو گئی تو ہمیشہ کے لیے میرے دل میں امر ہو جاؤ گی۔ تمہیں اس معاملے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج موسم کافی بھلا ہے تمہارا کیا کہنا ہے لانگ ڈرائیو پر نہ جایا جائے؟"

"موسم تو سبھی بھلے ہوتے ہیں نثالیہ، بس دل کا موسم بھلا ہونا چاہیے۔" اس نے ایک اداس آہ بھرتے ہوئے گلمان سکندر کی بات کو دہرایا۔

"اوہ...... دل کا موسم سوچوں کا محتاج ہوتا ہے میری پیاری، جیسا سوچوں کا حصار ویسا سب کچھ، دیکھو ایک آدمی دلدل کے کنارے کھڑا ہے وہ سوچ رہا ہے جوہڑ کا پانی گدلا بہت ہے۔ ایک اور آدمی بھی وہاں موجود ہے مگر وہ سوچ رہا ہے اس گدلے پانی کے بیچ لگا کیکٹس کا پھول بہت خوب صورت ہے۔ اب سوچ دونوں کی درست ہے مگر نیگٹو سوچ والے کو گدلا پن محسوس ہو گا مگر جس نے اچھی سوچ رکھی وہ کم از کم کیکٹس کی ترتیب اور خوب صورتی سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ سو تم بھی دکھوں کو سوچوں میں مت لایا کرو، خوشیاں دیکھا کرو، خوشیوں کو محسوس کر کے دل ہی دل میں مسکرایا کرو، میری پیاری خوش رہا کرو۔" ٹیبل پر پڑی کافی میں سے اب بھاپ اٹھنا بند ہو گئی تھی۔ وہ شاید ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔

"اوہ...... مجھے معاف کرنا میں نے بھی تمہیں اپنی الجھنوں میں الجھا دیا۔" سروش نے نثالیہ کے چہرے پر پھیلی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے معذرت کن لہجے میں کہا۔

"اٹس اوکے، میں تمہارے ساتھ کمفرٹ ایبل ہوں۔" وہ آہستگی سے مسکرائی تو سروش کو اس بھولپن شکل والی نازک سی لڑکی پر بے پناہ پیار آیا۔

"تم میرے ساتھ کمفرٹ ایبل ہو، تم پہلی ہو۔" اب کی بار مسکراہٹ نے سروش درانی کے سپاٹ چہرے کا رخ کیا تھا۔

"ویسے تم کسی کو کمفرٹ ایبل رہنے تو نہیں دیتیں پر یہ میرا اعلیٰ ظرف ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح تمہارے ساتھ کمفرٹ ایبل ہوں۔" نثالیہ نے گردن اکڑا کر جس فخریہ انداز میں کہا تھا اس نے سروش درانی کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔

"اف میرے خدا! ہمیشہ خود کی تعریف۔" وہ کچھ لمحوں کے بعد اپنی بے ساختہ ہنسی کو بریک لگاتے ہوئے بولی۔

"ایک سیکرٹ بتاؤں ایسی باتیں میں نے آج تک کسی سے نہیں کہیں تم پہلی ہو تمہارے لیے ایسا بولتی ہوں مگر یہ میں نہیں میرا دل بولتا ہے۔ سو امپریس مت ہوا کرو عمل کیا کرو، ورنہ بولنے اور لکھنے میں میں تم سے بہتر نہیں ہوں یو آر اے پروفیشنل رائٹر۔"

"اب تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو، خیر یہ سب چھوڑو کوئی اور نئی بات سناؤ۔" سروش نے آہستگی سے کہا۔

"یار! چاند کو ہاتھ میں تھامے بیٹھی ہوں، ابھی تھوڑی دیر پہلے سورج کو الوداع کہا اور رات آ گئی۔ کچھ دن پہلے تاروں سے لڑائی ہوئی تھی وہ بے چارے ناراض ہو کر اتنی دور جا کر کھڑے ہوئے کہ ان تک پہنچنے کے لیے سائنٹسٹ اپنا سر کھپا رہے ہیں لو جی کچھ نیا سنو۔" وہ مسکرائی۔

"اف تم عجیب ہو نثالیہ۔"

"عجیب کہاں یار ایک عام سی لڑکی ہوں۔"

"اچھا سنو لڑکی وقت بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ صبح یونیورسٹی جانا ہے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں سونا چاہیے۔" وہ ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے اٹھی تو نثالیہ بھی اس کے تعاقب میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سروش! تم نے ڈنر کر لیا؟" کچن میں مگ رکھتے ہوئے نثالیہ کو اچانک یاد آیا۔

"ڈنر...... نہیں وقت بہت زیادہ ہو گیا ہے اور مجھے کوئی خاص بھوک بھی نہیں ہے۔"

"ہاں پر مجھے زوروں کی بھوک لگی ہے جلدی سے نوڈلز بناؤ اور مجھے بھی کھلاؤ۔"

"تم ہٹلر ہو۔" سروش نے بے چارگی سے کہا۔

"اور تم جوانز مام جدرفینا ہو۔" اس نے اپنی کیئر ٹیکر کا نام لیا۔

"سارا دن کام جو کرتی رہتی ہو۔" اس نے اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

"سنو! یہ مام جوزفینا تھوڑا اوکورڈ نہیں ہے تم مجھے مسٹر مارگ برگ یا بل گیٹس دی گریٹ بھی تو کہہ سکتی تھیں۔ وہ بھی تو دن رات کام کرتے ہیں۔"

"ہاں میری پیاری مگر وہ بے چارے سارا سارا دن بیٹھ کر سوچتے ہیں کام تو کم ہی کرتے ہیں، مگر وہ سوچتے بھی تو اچھا ہیں تمہاری طرح اداس اور افسردہ نہیں ہرگز نہیں سوچتے۔"

"ہاں شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" وہ کیبنٹ سے نوڈلز کے پیکٹ نکالتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے۔ آج شام مجھے کرس کی کال آئی تھی، وہ اسکردو ہے میں اور اس کی کتاب تقریباً مکمل ہو گئی ہے۔ کرس کہہ رہا تھا کل شام تک وہ سب کچھ وائنڈ اپ کر کے لوٹ آئے گا اور پرسوں صبح کی فلائٹ سے ہم جرمنی چلے جائیں گے۔ آہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنوں سے بچھڑے عرصہ بیت گیا ہو۔" نثالیہ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"تو تم بھی چلی جاؤ گی مجھے چھوڑ کر۔" سروش نوڈلز کا پانی چولہے پر چڑھا کر ایسے بولی جیسے اسے کوئی پروا ہی نہ ہو۔

"ایک نہ ایک دن تو سب کو اپنی منزل کی طرف لوٹنا ہی ہوتا ہے مگر تم اداس کیوں ہوتی ہو۔ ہم بات کر لیا کریں گے وائبر پر اسکائپ پر یا پھر واٹس اپ پر اور پھر کل کا دن تو ہم ساتھ ہیں ناں۔"

☆......☆

جرمنی کے لیے فلائٹ کا وقت ساڑھے پانچ بجے صبح تھا۔ وہ 4 بجے ہی ایئر پورٹ آ پہنچے تھے۔ کرس نے اپنے آپ میں نہیں تھا وہ ضرورت سے کہیں زیادہ ایکسائیٹڈ تھا اور اپنی کتاب مکمل ہونے کو اپنی ذات کی تکمیل کہہ رہا تھا۔ ایئر پورٹ ٹرمنل پر ابھی شب کی سیاہی موجود تھی۔ باہر کہیں دور سے دن کی سفیدی اٹدنے کو بے قرار تھی۔ لوگوں کا ہجوم معمول کے مقابلے میں ذرا ہٹ کے تھا۔ نثالیہ اور وہ ایئر پورٹ کی خالی سیڑھیوں پر براجمان تھیں۔ ہیزل آنکھیں اداسی اور خوشی کا تاثر لیے ہوئے تھیں۔ کالی آنکھیں ہمیشہ کی طرح پر نم تھیں۔ ان آنکھوں میں اب بھی وہی خوف وہی اداسی کی سہمی ہوئی لہر دوڑ رہی تھی جو کسی اپنے کے بچھڑ جانے پر ہر بار ابھرا کرتی تھی۔

''عشق کیا ہے سروش؟'' لوگوں کی موجودگی کی سرسراہٹ میں نثالیہ کی دھیمی سی سرگوشی ابھری تھی۔
''فنا ہے نثالیہ......'' وہ اب بھی وہیں کھوئی ہوئی تھی۔
''عشق زادوں کے ساتھ تو اکثر ایسا ہوتا ہے، سب کچھ کب کا گزر چکا ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ وہیں کھڑے رہتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں بیتی یادوں میں۔''
''بقا کیا ہے پھر؟'' اس نے سوال کیا۔
''زندگی۔'' وہ زیرلب بولی۔
''غلط زندگی تو فنا ہے، عشق بقا ہے۔'' نثالیہ نے آہستگی سے کہا۔
''بقا کیا ہے نثالیہ؟'' وہ ناسمجھی کے عالم میں پوچھنے لگی۔
''خدا اور انسان۔'' اس نے اپنے سنہری بالوں کی ٹیل پونی بناتے ہوئے کہا۔
''انسان بقا ہے تو پھر مرنا کیا ہے؟'' اس کی کیفیت اب بھی ویسی تھی۔
''یہی تو ایک غلط فہمی ہے۔ مرنا الگ بات ہے فنا ہونا ایک الگ چیز ہے۔ انسان مرجاتا ہے مگر فنا نہیں ہوتا یہ تو ایک برا اسس ہے جو چلتا رہتا ہے اور مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔'' نثالیہ نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔
''کبھی کبھی مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ نہیں آتیں۔ خیر میرے پاس تمہارے لیے ایک تحفہ ہے۔'' سروش نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک شیشے کا جار نکالا اور اسے نثالیہ کے ہاتھوں میں تھما دیا۔
''میرے جگنو......رات کی تاریکی میں یہ تمہیں میری یاد دلائیں گے۔''
''اوہ......روشنی سے کوسوں دور تاریکی کے عالم میں۔ عشق کے ستائے لوگ کھیلتے ہیں جگنوؤں سے باتیں کرتے ہیں۔'' نثالیہ کے شوخ انداز پر وہ بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔
''ثانی! ویسے تم مجھے مس کروگی کیا؟'' نثالیہ اچانک سنجیدہ ہوئی تھی۔
''تمہیں کیوں بتاؤں؟'' وہ خوامخواہ اکڑی۔
''نہ بتانے کا فائدہ کیا ہے اور بتانے میں حرج کیا ہے؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔
''سنو! کرس سے کہنا عشق کا جب نصاب لکھے تو مجھ پر بھی ایک کتاب لکھے۔'' سروش پل بھر میں جذباتی ہوئی۔
''تم کہہ دو تو میں پورا دیوان لکھوں گی۔''
''میں اس دن کا انتظار کروں گی۔'' دو گرم آنسو ٹوٹ کر گرے اور اس کے یخ گالوں پر پھیل گئے۔
''تم اچھا نہیں کررہیں خود کے ساتھ۔ اپنے آپ کو سنبھالو دماغ کو ریسٹ دو، تم عام لڑکی نہیں ہو تو پھر عام کیوں بنتی ہو۔ آنسوؤں کو بہانے کے بجائے اپنی زندگی کا کوئی خاص مقصد بناؤ، عام لوگوں کی طرح یہ فرسٹریشن، ڈیپریشن وغیرہ تمہیں جچتا نہیں ہے یار! اپنے لیے نہیں اپنوں کے لیے جینا سیکھو۔ میں جانتی ہوں یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ کسی لڑکی کے لیے بھی نہیں ہوتا تم ایک مخصوص وقت لے لو ایک ہفتہ دس دن ایک مہینہ اور اس مخصوص وقت میں جتنے آنسو بہانے ہیں ایک ہی بار بہا دو، جب تھکنے لگو تو خود کو قسمت کی ناؤ پر سوار کر دینا کبھی نہ کبھی کنارے پر پہنچ ہی جائے گی۔'' نثالیہ اسے سمجھا رہی تھی اور مسلسل سمجھا رہی تھی۔
''معزز خواتین وحضرات جرمنی جانے والی فلائٹ نمبر AC101 پرواز کے لیے تیار ہے۔'' ایک دلکش نسوانی آواز نے ماحول کی خاموشی کو بے ترتیب کیا تھا۔
''او کے پیاری اب اجازت دو، اپنا خیال رکھنا ہمیشہ خوش رہنا تمہاری فکر رہے گی۔'' نثالیہ نے اسے گلے

لگاتے ہوئے محبت سے کہا تو وہ ایک بار پھر سسک اٹھی۔ بچھڑ جانے کا احساس، تنہائی کا خوف سب بھیگی پلکوں میں دھندلا رہے تھے۔

☆......☆

ویسے تو زندگی کی ہر صبح نئی ہوا کرتی ہے مگر کنورڈیا میں تین دن سے جاری طوفان کو مات دینے کے بعد زندگی کی وہ صبح بالکل ایک نئی صبح تھی۔ میں نے کروٹ بدلی، چہرے سے سلیپنگ بیگ سرکایا اور آنکھیں ملتا اٹھ کھڑا ہوا، باہر برف کی اپنی ایک الگ دنیا آباد تھی اور رات سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ خیمے کے کپڑے پر صبح کی روشنی دھیرے دھیرے لہرا رہی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ موجود پانچ رنگ برنگ سلیپنگ بیگز کی طرف دیکھا۔ کچھ لوگ اونگھ رہے تھے اور کچھ آنکھیں کھولے اپنی خیالی دنیا میں مگن تھے۔ ہوا کے زور سے خیمے کا پردہ تھوڑا سا سرکا، سامنے ایک الگ منظر تھا۔ ساری دنیا سے ہٹ کر بالکل منفرد جیسے یہ منظر قدرت نے صرف اور صرف ہمارے لیے بنایا ہو۔ پتھروں سے آگے برف کے تودے تھے۔ برف کے تودوں سے ذرا آگے براؤن گلیشیئر اور پھر ذرا فاصلے پر اس بھورے گلیشیئر میں سے بلند ہوتا ہوا براڈ پیک کا عظیم نظارہ براڈ پیک کے اوپر کا آسمان بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ باہر سردی تھی اور درجہ حرارت منفی پر تھا۔ ہم تقریباً موت کو لقمہ دے کر فرار ہونے والے تھے۔ یہ پانچ بنجاروں، آوارہ گردوں، کوہ نوردوں اور کوہ پیمائیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گروہ تھا جس میں ہم دو لوگوں کے علاوہ باقی تین غیر ملکی سیاح تھے۔ ہم کئی دن سے دنیا کے خوب صورت مگر بے حد ظالم گلیشیئر کنورڈیا کے وسط میں پھنسے ہوئے تھے، اس گلیشیئر کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں کے ٹو کے علاوہ باقی عظیم چوٹیوں کی بھی برف گرتی ہے۔ انسانی دنیا کی آخری بستی اسکولے سے یہاں تک کے ٹریک کو دنیا کا سب سے مشکل ترین ٹریک سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے غیر ملکی کوہ پیما ماؤنٹ ایورسٹ Summit کرنے کے بعد اس راستے کا رخ کرتے ہیں۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے ہم نے اسکردو جانے والے نو کر طیارے میں سے پربتوں کی ملکہ نانگا پربت کی دھند میں چھپی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی اور پھر ہم بلندیوں کے شاندار میدان قراقرم میں سے گزرے جسے دنیا میں پہاڑوں کے عظیم ترین مناظر کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ یہاں ہر طرف عظیم پہاڑوں کے بلند و بالا شاندار تخت پھیلے ہوئے تھے اور ان پہاڑوں پر برف کسی برفانی دیوتا کی مانند تمسخر سے پھیلی ہوئی تھی۔

مشابرم (برفلی دیوار) 7820 میٹر بلند، گشابرم iv (چمکتی دیوار) 7980 میٹر بلند، براڈ پیک (بڑی چوٹی) 8047 میٹر بلند، اسٹاک ٹاور (بلندیوں کے راج کمار) 7263 میٹر بلند۔

یہ سب خوش قسمت ترین چوٹیاں تھیں جن کی ایک جھلک دیکھنے کو کچھ سرپھرے سیاح موت کا طوق ہاتھ میں لے کر دنیا کے ہر کونے سے ہر سال یہاں آیا کرتے تھے اور وہاں ان چوٹیوں سے بھی زیادہ خوش قسمت ترین کوئی اور موجود تھا وہ ہم تھے غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ ہم اکڑ کر چل رہے تھے کیونکہ پہلی اور تیسری پیک کو نکال کر ہم دنیا کی پانچ بڑی پیکس کے مالک تھے۔ ہماری زمین پر پربتوں کی ملکہ نانگا پربت اور پربتوں کی دیوی راکا پوشی کے تخت بچھے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس دنیا کا سب سے خوب صورت گلیشیئر کنورڈیا اور پرانا گلیشیئر بالتورو موجود تھا اور دنیا کی سب سے حسین چراگاہ فیری میڈوز بھی۔ ہمارے ساتھ جانے والے جرمن سیاح اس بات پر اتراتے کہ فیری میڈو کو ایک جرمن سیاح نے discover کیا مگر ہمیں اس بات پر فخر تھا کہ فیری میڈو ہمارے وطن کے سینے میں آباد ہے۔ خیر گنوانے کو تو پورا شمال ابھی باقی تھا مگر اب ہم کنکورڈیا میں جھانکتی برف کی

بلندیوں کے سائے تلے تھے۔ مرنے کے لیے یہ احساس بھی خوش کن تھا کہ ہم دنیا کی سب سے خوب صورت جگہ پر تھے ہم گلیشیئر اور بھوری چٹانوں سے ذرا آگے واقع دلکش کنکورڈیا کے دامن میں تھے۔ کوہ پیاؤں، کوہ نوروں اور بنجاروں کی کھوکھلی ذات کی تکمیل اکثر انہیں جگہوں پر لکھی ہوتی ہے شاید یہی وجہ تھی کہ موت کو سامنے پاکر ہمارے چہروں پر ہوائیاں نہیں اڑی تھیں اور ہم خود کو خوش قسمت ترین تصور کر رہے تھے جیسا کہ اس وقت ہمیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے پاس بمشکل دو ہفتوں کا مزید راشن بچا تھا۔ گیس کے سلنڈرز اور پورٹرز کا کھانا بھی روز بروز کم پڑ رہا تھا۔ مسلسل تین دن سے جاری برف کا طوفان ذرا تھما تو ہوا کے زور کو برداشت کرتے ہمارے خیموں کو ایک پل کے لیے سکون آیا۔ ”ہمیں ہیڈ کوارٹر سے خبر ملی ہے کہ طوفان کسی بھی لمحے دوبارہ شروع ہو سکتا ہے۔ ہم یہاں سے اب نکل سکتے ہیں یا پھر کبھی نہیں۔“ جان لاک نے گرم پانی کے چند قطرے حلق میں انڈیلتے ہوئے اطلاع دی وہ ایک جرمن سیاح تھا اور ہماری ٹیم کا لیڈر بھی۔ ”آہ ابھی واپس جانا اتنا ضروری ہے کیا ہم یہاں کچھ دیر مزید نہیں ٹھہر سکتے کیا؟“ جان لاک کی بیوی ایلی جو ایک ورلڈ ایکسپلورر رہ چکی تھی نے اداسی سے بھرپور لہجے میں اجازت طلب کی۔

”اوہ...... کم آن ایلی اب ہم ہمیشہ کے لیے تو یہاں نہیں ٹھہر سکتے ایک نہ ایک دن اس جگہ کو الوداع کہنا ہی ہوگا آج نہیں تو کل کل نہیں تو پرسوں۔“ میں نے سلیپنگ بیگ میں لیٹتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”یہاں سے یونہی بے وجہ لوٹ جانے کا احساس میرے لیے موت کے احساس سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہے۔“ ڈاؤن جیکٹ میں ہاتھ ڈالے اپنی ذات میں گم چیونگم کے غبارے بناتے اس کوہ پیما نے ایک بار پھر ازلی لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔

”تم اکیلے ہی یہاں سے بے مقصد لوٹ جانے پر اداس نہیں ہو ہم سب بھی اس کرب کو جھیل رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں تم ایک Geneius ہو مگر جان بوجھ کر آگ کے سمندر میں چھلانگ لگا دینا یا پھر موت کی کھائی میں کود جانا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔“

”مجھے اس بے حس لڑکے کی ضرورت سے زیادہ بے حسی برتنے پر بے حد غصہ آیا۔ وہ بنا چونکے بنا لڑکھڑائے اور بنا سانس لیے خطرناک چٹانوں کو آسانی سے عبور کر لیتا تھا۔ وہ راکاپوشی اور نانگا پربت جیسی خوابناک چوٹیوں پر اپنے قدم گاڑ چکا تھا۔ اسے بلندیوں پر جانے کے لیے آکسیجن ماسک کی ضرورت شاذ و نادر ہی پڑتی تھی۔ بلاشبہ وہ اسمارٹ تھا مگر اسے اس قدر اسمارٹ بننے کی کیا ضرورت تھی۔“ میں نے کڑھتے ہوئے خود کلامی کی۔

”تم لوگ جانا چاہتے ہو تو الوداع میرے دوستوں مگر میں اور گلمان اپنا مشن پورا کر کے ہی لوٹیں گے۔“ ہمیلے نے اپنا منی رک سیک تیار کرتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ اس طوفانی صورتِ حال کے بیچ کے تو Summit کرنے نہیں بلکہ مال روڈ پر انجوائے کرنے جا رہا ہو۔

”یک نہ شد دو شد۔“ میں دل ہی دل میں بوکھلایا۔

”ہمیں جو خبر ملی ہے اس کے مطابق طوفان کبھی بھی شروع ہو سکتا ہے۔“ جان لاک نے انہیں ایک بار پھر یاد دہانی کروائی۔ وہ موجودہ صورت حال کو لے کر خاصا نروس تھا۔

”ہاں مگر اچھی خبر یہ ہے کہ طوفان ابھی شروع نہیں ہوا۔“ ہمیلے نے کندھے اچکاتے ہوئے بلیک سگار کا کش لیا۔

”مگر وہ کسی بھی لمحے شروع ہو سکتا ہے۔“ ایلی نے انہیں سمجھایا اور وہ یہ بھول رہی تھی کہ ان آوارہ گردوں کو وہ

کبھی نہیں سمجھا سکتی۔ یہ بنجارے اپنی اردگرد کی دنیا سے کب مطمئن ہوتے ہیں۔ خول میں لپٹے بناوٹی چہروں سے وہ جلد ہی اکتا جاتے ہیں اور تھک ہار کر دور پرے کہیں چین کی تلاش میں تن تنہا کھڑے ہوتے ہیں۔

''اور میرا انہیں خیال کچھ ہفتوں تک ایسا ممکن ہو۔'' گلمان نے براڈ پیک کے دائیں جانب واقع آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آسانی سے کہا جہاں کسی بادل کا شائبہ نہ تھا۔ جلد کسی طوفان کی کوئی امید نہ تھی۔ آسمان کورا تھا وہ صاف تھا اور بے حد نیلا تھا۔

''یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے؟''

''ہاں بالکل۔'' ہمیلے نے تصدیق کی مہر لگائی۔

''ایک بار پھر سوچ لو۔'' وہ تشویش زدہ تھی۔

''او جانے بھی دو ایلی تم شاید بھول رہی ہو سوچنا نارمل لوگوں کا کام ہے ہم بنجارے ہیں، ہماری منزلیں وہیں لکھی ہیں۔'' اس نے سویرے کی سفیدی سے جھانکتی شاہ گوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوکے ہم لوگ کے ٹو بیس کیمپ پر تمہارا انتظار کریں گے۔'' بالآخر کافی سوچ بچار کے بعد جان نے فیصلہ سنا دیا اور سب کے چہرے ایک بار پھر سے کھل اٹھے۔

☆......☆

پوری دنیا میں رات ہوتی ہے۔ پر انسانوں کی دنیا سے دور پرے دور کہیں برف زاروں، گلیشیئر اور بلندیوں کے دامن میں اور پتھروں کی تاریکی میں کبھی برف کی سفیدی پر دور کہیں چوٹیوں کے دھندلے وجود کی اپنی ایک رات ہوتی ہے۔ اپنی ایک وحشت ایک تنہائی ہوتی ہے۔ ایسا ٹھہراؤ ہوتا ہے گہری خاموشی، سرد سکوت برف کی نیلی چادر توڑ کر دھیرے دھیرے پھیلتی ہوئی سرگوشیاں، کنکورڈیا میں بتائی جانے والی وہ رات اپنی ایک رات تھی۔ دنیا کی راتوں سے قدرے مختلف قدرے دلنشین کنکورڈیا کے دامن میں نصب چار سرخ خیمے وہ خیمے جن میں لالٹین روشن تھی اور شاہ گوری کے عشق میں مبتلا فرنگی حسیناؤں کے قہقہے دور دور تک پھیل رہے تھے۔ برف پر جھکی ہوئی ان بلندیوں کا یہی ایک فائدہ تھا وہ تنہا تو ہوتی ہیں مگر پھر بھی انسان کو اس تنہائی میں اچھی اچھی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ نیم تاریکی میں گم شاہ گوری کے ظالم روپ کی ہلکی سی جھلک کے ٹو کا ایک چھوٹا سا حصہ دور تک پھیلی ہوئی برفانی پٹی اور بادلوں میں گھری ہوئی گھونگھٹ اوڑھے شرماتی ہوئی شاہ گوری کے ٹو کا بیشتر حصہ ابھی بھی بادلوں میں گم تھا۔ کنکورڈیا کو اگر بلندی سے دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ریسلنگ ٹریک کی مانند بلند پہاڑوں کے درمیان سفید اور بھورے رنگ کی پٹیاں پھیلی ہوئی ہوں۔

کئی رازوں کو اپنے دل میں دفنائے کئی کوہ پیماؤں اور کوہ نوردوں کو خود میں سمائے ہوئے، ہمالیہ کے سینے میں اور اس سے آگے خوبانیوں اور سیبوں کے درختوں کے جھنڈ سے کہیں بہت زیادہ دور جہاں انسان کم آتے ہیں جہاں آنے والے انسان کبھی سوچا نہیں کرتے جہاں سے پلٹنے پر انسان کبھی راضی نہیں ہوتے، یہ کیسا طلسم تھا۔ کیسا اسم تھا ان بلندیوں پر جو ہر آنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا جو پلٹنے کا موقع چند گنے چنے لوگوں کو ہی بخشتا تھا برف کی چادر کو چیر کر نکلتا ہوا تمسخر سے مسکراتا ہوا ایک بلند عظیم اور مقدس پہاڑ اور وہ پہاڑ ان کے سامنے تھا کنکورڈیا ابھی تک سائے کے زد میں تھا۔ باقی چوٹیاں ابھی بھی نیم تاریک تھیں۔ ایک چوٹیوں کے بیچ ایک وہ چوٹی تھی جو برف کے جواہرات سے لدی ہوئی تھی جو سر سے لے کر پاؤں تک دھوپ کی چادر اوڑھے لشکارے مار رہی تھی اور اوپر کی بلندیاں انہیں بلا رہی تھیں۔ چینی اسے QOGIR (کوگیر) کہتے تھے۔ دنیا اسے کے ٹو

کے نام سے جانتی تھی۔ مقامی لوگ اسے شاہ گوری (بڑا پہاڑ) کہہ کر پکارتے تھے۔ کیراٹ ڈصر گر اسے ہمالیہ کا کوہ نور لکھتا تھا اور غیر ملکی سیاحوں نے اسے لارڈ آف قراقرم کا نام دیا۔ لارڈ آف قراقرم۔ قراقرم کا چوہدری۔ دور تک پھیلا ہوا پہاڑوں کا بادشاہ عظیم بادشاہ...... جس پر برف کسی برفانی حسینہ کی مانند رقص کرتی تھی جو دیکھنے والوں کو اپنے عشق میں جکڑ لیتا تھا اور گلمان سکندر اسے کوہِ عشق کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ اس کے قریب تھے۔ بے حد قریب سامنے فرنگیوں کی ترپال کے باہر آگ کا ایک بڑا الاؤ روشن تھا۔ بلتی پورٹرز کے چولہوں پر کافی کے لیے پانی ابل رہا تھا۔ کچھ چولہوں پر روٹیاں پک رہی تھیں۔ کچھ پورٹرز ہاتھ گرم کر رہے تھے اور کچھ کھانے کے بعد سرو کی جانے والی سویٹ ڈش پر جھکے ہوئے تھے۔ فرنگی حسیناؤں کی سرگوشیاں، شوخیاں اور قہقہے مزید بلند ہو رہے تھے۔ گلمان کے ہاتھ میں اس کا اٹالین سگار سلگ رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی فتور وہی وحشت وہی ویرانی اڈر رہی تھی۔

سامنے غیر ملکی سیاحوں کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ دنیا کے آخری سرے پر جہاں کا لوگ سوچتے ہیں اور بس سوچ کر رہ جاتے ہیں اور کچھ لوگ تو سوچنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ آگ کے الاؤ کے گرد لالٹین کی روشنی میں وہ اپنے محبوب کا بازو تھامے نمودار ہوئی۔ بلتی چہرے ایک پل کے لیے ہشاش بشاش ہوئے جب فرنگی حسینہ اپنے محبوب کے ہمراہ محو رقص ہوئی۔ برف میں چھپی بلندیاں اچک اچک کر یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ شاہ گوری کا آنچل بھی کچھ پل کے لیے سرک گیا تھا۔

دونوں بدن بلتی سروں پر تھر تھرا رہے تھے۔ بدنوں کی تپش سے برف پگھلتی ہے، ڈھول اٹھتی ہے مگر وہ اپنی دھن میں مگن مسلسل تھر تھرا رہے تھے۔ بلتی حسینہ اپنے محبوب کے سنگ تھی وہ خوش تھی بے پناہ مسرور تھی اور دنیا سے لاپرواہ بھی۔ وہ اپنے محبوب کا بازو تھامتی ہے اور اس کے کندھے پر سر کو جھکاتی ہوئی بجلی کی سی رفتار سے اپنے جسم کو جھٹکا دیتی ہے۔ وہ ذرا پیچھے آتی ہے۔ آنکھیں بند کرتی ہے۔ قراقرم کی سردی اور برف کی سرگوشیاں اس پر مدہوشی سی طاری کر دیتی ہیں۔ وہ ایڑیوں کے بل گھومتی ہے اور بنا رکے بنا سانس لیے مسلسل گھومتی جا رہی ہے۔ اس کے نازک دودھیا ہاتھ اس کے بھورے گھنگھریالے بال قراقرم کی بلندیوں پر ہوا میں محو رقص ہیں اور وہ بے خودی کے عالم میں جھوم رہی ہے۔ اس کے ہر قدم کے ساتھ اس کے چہرے کا تاثر بدلتا ہے۔ ہر بار ایک نیا، کئی راز خود میں چھپائے گہرا بہت گہرا سا تاثر اس کے رنگوں سے لبریز گلابی چہرے پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کا سانس پھولتا ہے اور وہ اپنے محبوب کی بانہوں میں جھول جاتی ہے۔ اس کی نگاہیں بند ہیں اور وہ اپنے اوپر جھکے نفوس کی گرم سانسیں محسوس کر رہی ہے وہ پھر جھٹکا کھا کر اٹھتی ہے، گھومتی ہے تالی بجاتی ہے۔ اس کا سانس چڑھا ہوا ہے اس کے پاؤں کنکورڈیا کے دامن میں محو رقص ہیں۔ ہسپانوی سیاح جھوم رہے تھے جرمن کوہ پیما وائن کے نشے میں ڈوبے ہوئے تھے اور فرنگی حسینہ ناچ رہی تھی۔ اس کے مرمریں ہاتھ ہوا میں جھوم رہے تھے اس کے پاؤں دھیرے دھیرے برف کو کھسکا رہے تھے۔ بلتی بانسری بجا رہے تھے۔ کنکورڈیا کے دامن میں الاؤ روشن تھے۔ مشعلیں تھرک رہی تھیں اور لالٹین جگمگا رہی تھی۔ مٹی کے تیل کی خوشبو ان مشعلوں سے آ رہی تھی جو یقیناً کنکورڈیا کے حسن میں خلل پیدا کر رہی تھی۔ یہ کیسی الجھنیں تھیں جو ختم ہونے کو نہ تھیں۔ فرنگی حسینہ کا جسم تھر کنا بند ہو چکا تھا وہ جھک جھک کر سب سے داد وصول کرنے لگی۔ وہ تھکن سے بھرپور تھی مگر اس کے چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ لہرا رہے تھے جیسے وہ جانتی ہو کہ کنکورڈیا میں گزرنے والی یہ رات پھر کبھی نہیں آنے والی۔ رات بھیگ رہی تھی اور دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ایک عجیب سی مستی تھی جو زندگی سے بھرپور تھی جیسے دوبارہ پھر کبھی نہ آنے کا ارادہ کیے بیٹھی ہو۔ ٹھنڈ میں ہوا کا دور چلنے کو تھا۔ مشعلیں بھڑک بھڑک کر بجھنے کو تھیں۔ الاؤ راکھ ہونے کو بے قرار تھا۔

غیر ملکی سیاح تھے۔ بلتی لوگ گیت تھے، فرنگی حسینہ کا رقص تھا۔ سرد منجمد ہاتھوں میں کافی کے گگ تھے جو بہت گرم تھے۔ اس کی تیز بھاپ گہری مہک ہر طرف سکون کی ندیاں تھیں۔ سب کسی حسین بے حد حسین خواب کا حصہ لگ رہا تھا۔

وہ ہاتھوں میں اپنا منی رک سیک اور ٹریکنگ اسٹک سنبھالے محاذ پر جانے والے کسی چاق و چوبند فوجی کی مانند تیار کھڑے تھے پوری ٹیم نے مسکراتے ہوئے انہیں الوداع کہا۔ برفانی راستہ تھا سامنے شاہ گوری تھی۔ وہ اردگرد سے بے خبر تھی وہ شاہ گوری کے سحر میں کھوئے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ دور دور تک برف کسی سفید چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سفید تھی اور بے حد صاف تھی برف کی یہی تو ایک خاصیت ہے کہ یہ کبھی گندگی کو خود میں سمونے نہیں دیتی۔ دور دراز سے آنے والے کوہ پیما اگر یہاں پر کوئی ریپر، کاغذ یا کین وغیرہ پھینک بھی دیں تو برف انہیں سرکاتی ہوئی پہاڑوں کے پار گرا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برف پاک تھی اور وہ سویرے کی بجھی بجھی سفیدی میں بھی چمک رہی تھی۔

1971ء میں کے ٹو پر پہلے پاکستانی اشرف امان نے قدم رکھ کر پاکستان کا مان مزید بڑھا دیا۔ اس سے پہلے کے ٹو پیک کو کئی غیر ملکی سیاح Simmit کر چکے تھے۔ کے ٹو دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے۔ یہ ماؤنٹ ایورسٹ سے صرف 256 میٹر کم ہے لیکن کے ٹو ٹریک کو دنیا کا سب سے مشکل ترین اور پرکشش ٹریک سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ ایورسٹ پر ایک وقت میں کوہ پیماؤں کی پوری ٹیم آسانی سے چلی جاتی ہے مگر سالوں بیت جاتے ہیں تب جا کر کہیں ایک دو خوش قسمت کوہ پیما شاہ گوری کی بلندیوں کو مات دینے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ کے ٹو صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن حد تک مشکل ٹریک ہے یہ جان جوکھوں میں ڈال کر Summit چھ کیمپوں پر مشتمل کرنے والی چوٹی ہے۔

☆......☆

Day-1

شاہ گوری روم کے تریوی فوارے کی طرح مجھے اپنی قربت میں بلا رہی تھی اور میں سر جھکائے دل و دماغ کے فیصلے پر غور کر رہا تھا۔ دل اچھل رہا تھا۔ مچل رہا تھا اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ کسی حد تک باغی ہو رہا تھا۔ ویسا ہی باغی جیسا کبھی رومیو جولیٹ کے لیے ہوا تھا۔ ویسا باغی جیسے کوئی محبوب سالوں بچھڑنے کے بعد اپنی محبوبہ کی ایک جھلک دیکھ کر ہوا کرتا ہے اور دماغ میں جان لاک کے جملے گردش کر رہے تھے۔ ”طوفان کسی بھی لمحے شروع ہو سکتا ہے۔“ اور میں جانتا تھا یہاں موسم کا کچھ پتا نہیں چلتا ایک دفعہ برف باری کا آغاز ہو گیا تو بادل اور دھند نیچے آ جائیں گے۔ اتنے نیچے کہ پھر کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص لاپتا ہو بھی جاتا ہے تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ ایک بار طوفان شروع ہو گیا پھر تب تک نہیں تھمے گا جب تک ہم برف کی گود میں دفن نہیں ہو جاتے۔ پھر کئی دن ہماری باڈی بے آسرہ اس آئس ویلی میں دبی رہے گی۔ ہو سکتا ہے برف پگھلنے کے کچھ دنوں یا پھر مہینوں بعد کسی ریسکیو ٹیم کا یہاں پر آنا ہو اور ہمارے بے جان منجمد جسموں کو بیس کیمپ میں موجود برف کے گورستان میں منتقل کر دیا جائے۔ وہاں موجود ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح کے ٹو پیک پر اپنی عظمت کا جھنڈا گاڑ دیا جائے لیکن اس ایک خواہش کے رستے میں جو ہزاروں خطرات پڑتے تھے وہ بار بار سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ایلی جانے کے لیے بے قرار تھی وہ زندگی کو ایڈونچر کا نام دیتی تھی جب کہ جان لاک کا ماننا تھا زندگی کو ایڈونچر سمجھ کر ویسٹ کرنا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ وہ ایڈونچر کو زندگی کا نام دیتا تھا۔ میں

نے نظریں چرا کر شاہ گوری کی طرف رینگتے ہوئے ان جوانوں کی طرف دیکھا جو برف کی سفید دنیا میں ایک دھبہ لگ رہے تھے۔ جیسے ان کی ڈکشنری میں خوف نام کا لفظ کہیں لکھا ہی نہ ہو۔ اگر برف کے طوفان میں شاہ گوری پیک تک پہنچنا عقل مندی نہیں تھی تو یہاں تک آ کے واپس خالی ہاتھ لوٹ کر بھی میں کوئی دانش مندی کا ثبوت نہیں دے رہا تھا۔

مجھے فیصلہ کرنا تھا تو اب یا پھر کبھی نہیں۔ میں نے ایک نظر اپنے منی رک سیک کی جانب دیکھا وہ کے ٹو کی سختیوں کو جھیلنے کے لیے بالکل تیار تھا اور پھر گلمان اور ہیلے کی جانب دیکھا جو اب برف کی وسعت میں لاپتا ہونے کو تھے۔

''اوئے ٹھہرو۔'' میں بھاگا۔

''اوئے سنو۔'' اور پھر دیوانہ وار بھاگا۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔

''اوئے ظالموں کے ٹو Summit کرنے چلے ہو تنہا جا رہے ہو شرم تو نہیں آتی مجھے چھوڑ کے جا رہے ہو اوئے۔'' میں پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ منہ میں جو آیا بولتا چلا گیا۔ مجھے ساتھ آتا دیکھ کر دونوں جوانوں کے چہرے پر فتح کی ایک روشن کرن نمودار ہوئی۔

☆......☆

## Day-2

ہم سر جھکائے ہاتھوں میں واکنگ اسٹک تھامے ایک دوسرے کے آگے پیچھے اسمبلی میں جانے والے ویل مینرز اسٹوڈنٹس کی طرح واک آؤٹ کر رہے تھے۔ پہاڑوں پر جانے کے لیے آپ کو اپنی ساری بہادری ساری دلیری پیچھے وادیوں میں ہی چھوڑ کر آنی پڑتی ہے۔ آپ ان دیو قامت پہاڑوں کے سامنے کبھی بہادر نہیں ہو سکتے اگر آپ خود کو بہادر سمجھنے کی کوشش کریں گے تو پل بھر میں کسی ٹھنڈی گھائی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے ایک کوہ پیما کو ٹریکنگ یا کلائمنگ کرتے ہوئے ضرورت سے زیادہ محتاط ہونا پڑتا ہے۔ ہماری نظریں اپنے بوٹوں پر چسپاں تھیں جو ہمارے محتاط انداز میں حرکت کر رہے تھے۔ ان کے نیچے بجری تھی اور وہ کرچ کرچ کر رہی تھی۔ کہیں سخت برف تھی اور اس منجمد برف کے نیچے پانی کے تالاب تھے۔

ہر جگہ، ہر وادی، ہر خطے کے اپنے قانون ہوتے ہیں، ان پہاڑوں کا بھی اپنا ایک قاعدہ ہے۔ آپ ذرا سا پھسلتے ہیں ذرا سا توازن کھوتے ہیں تو پہلے آٹھ ہزار میٹر اونچائی سے سیدھا نیچے کسی گہری کھائی میں یا پھر برف کے گڑھے میں گرتے ہیں اور پھر دنیا کی عظیم ترین بلندی پر پہنچ جاتے ہیں بنا کسی rope کے بنا کسی ٹریکنگ اسٹک کے اور سب سے بڑھ کر بنا کسی محنت کے۔ گلمان سکندر نے کندھے اچکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔'' میں نے ذرا رک کر ایک سرد آہ بھری یہ جانتے ہوئے بھی جس جگہ پر ہم موجود ہیں وہاں پر آہ سرد ہی ہوا کرتی ہے۔

اردگرد کا ماحول، ہماری آنکھوں میں لہراتی وحشت کو دیکھ کر ہر گزرتے پل کے ساتھ مزید خاموشی، مزید گہرا اور مزید دہشت زدہ ہوتا جا رہا تھا۔ سامنے محبوبہ تھی، محبت کی مسافتیں طے ہو رہی تھیں اور ہم اپنی محبوبہ کے وصل کی خوشی میں دیوانہ وار چل رہے تھے۔ کے ٹو کی وسعتیں پھیل رہی تھیں۔ براڈ پیک اپنے تمام تر جلوؤں کے ساتھ ہمارے سامنے موجود تھی اردگرد کی برف سخت تھی اور بے تحاشا سخت تھی۔ سرد کبھی نہ پگھلنے والی، پتھر دل برف یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کئی سالوں سے ایسی ہی رہی ہو۔ گلیشیئر پیچھے دور بہت دور رہ چکا تھا۔ گلیشیئر کے کناروں پر بہتے پانی میں روانی تھی اور اس روانی میں ہلکی سی سرسراہٹ تھی اور وہ سرسراہٹ مزید ہلکی ہو کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔

کئی جگہوں کی برفیں تو مولود تھیں۔ وہ نرم تھی اوران پر چلتے ہوئے دل بار بار منہ میں آرہا تھا۔ کیونکہ برف میں دھنس کر پاؤں رکتا نہیں تھا بلکہ مزید نیچے سرکتا چلا جاتا تھا اور کبھی کبھی تو ہم گھٹنوں تک برف میں دھنس جاتے تھے کچھ جگہوں کی برفیں پختہ تھیں وہ ازل سے تھیں اور بھورے رنگ کے پتھروں اور ریت کی آڑ میں چھپی ہوئی تھیں۔ قدم قدم پر ٹوٹے ہوئے کناروں کے ساتھ کئی نیلی ندیاں پھیلی ہوئی تھیں اوران ندیوں کے علاوہ یہاں پر عظیم دراڑیں بھی موجود تھیں۔ دراڑیں برف کی ایک ہلکی سی تہہ میں پوشیدہ تھیں۔ ہموار ایک قدم نہیں تھا۔ آسان ایک لمحہ بھی نہ تھا۔ ان دراڑوں کو عبور کرتے وقت کنارے ٹوٹتے تھے اور لڑکھڑاتے ہوئے دور کہیں تاریکی میں کھو جاتے تھے۔ کے ٹو سامنے بانہیں پھیلائے ہم خانہ بدوشوں کو دیکھ کر تمسخر سے مسکرا رہا تھا۔ اس کی جانب سے آنے والی سرد ہوا ہمارے جسموں سے ٹکراتی ہوئی لہرا لہرا کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ سامنے ایک خواب ناک منظر تھا۔ بھوری شاہراہیں تھیں، برف کی سفیدی تھی ایک نیا گلیشیئر تھا۔ میں تھا، گلمان سکندر تھا اور ہیلے تھا اور ہم تینوں آنکھیں پھیلائے اس مدہوش کن منظر کو دیکھ رہے تھے۔ عجیب بات تھی کہ ہم تینوں خاموش تھے اور اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ یا پھر اردگرد کی دنیا تھی ہی اتنی سحر انگیز کہ بولنے سے ڈر لگتا تھا۔ ادھر ایک لفظ منہ سے نکلا، اُدھر سحر ٹوٹ گیا اور سب خواب چکنا چور ہو گئے۔ یہاں سردی تھی اور اس قدر سردی تھی کہ گلیشیئر سے نکلنے والا پانی دیکھتے ہی دیکھتے جم جاتا تھا۔ ندیوں کے پانی کے اوپر برف کی تہہ منجمد تھی اور وہ اتنی منجمد تھی کہ ہم آسانی سے اس پر چل پھر سکتے تھے۔ ہر منظر پچھلے منظر سے ہٹ کر تھا۔ ایک کے بعد ایک نئی تصویر ایک خواب ایک خواب نگر اور اس خواب نگری میں بھٹکنے والے تین خانہ بدوش۔ سامنے کھڑی محبوبہ کا دیدار اور پھر مزید قربت کی خواہش سینوں میں فخر آنکھوں میں کھوج دلوں میں ارمان قدموں میں مضبوطی، حدِ نظر پھیلے ہوئے کٹے پھٹے گلیشیئر، بھورے ٹیلے، منہ کھول کر موت کا سماں لیے خوفناک دڑاریں، لشکارے مارتی چوٹی، پانی کے بہاؤ کی دبی دبی آواز ماتھے پر آئے پسینے، برف چہرہ، برف ہم اور پتا نہیں کیا کیا۔ گلمان کو خطروں کی پروا نہ تھی وہ ایسے چل رہا تھا جیسے جی ٹی روڈ پر چل رہا ہو۔ ہیلے کے لیے یہ مسافتیں نئی نہ تھیں وہ ماؤنٹ ایورسٹ پر برطانیہ کا جھنڈا لہرا چکا تھا اور یہاں کے بھی تقریباً سبھی راستوں سے واقف تھا۔ وہ دو سال پہلے یہاں آ چکا تھا اور دو دن تک جاری مسلسل طوفان کی وجہ سے کیمپ 4 سے واپس پلٹا تھا۔ سفید کائنات میں ٹریکنگ سوٹ پہنے تین دھبے تھے، ایک نیلا، دوسرا سرخ اور تیسرا سفید اور وہ دھبے ہولے ہولے رینگ رہے تھے۔

☆......☆

**Day-3**

کے ٹو کا اپنا ایک جہاں آباد تھا۔ یہاں کی اپنی روایتیں تھیں۔ اپنے طور طریقے تھے۔ اس جہاں میں دنیا کے کئی عظیم کوہ پیما، کئی آوارہ گرد، کئی سیاح اور کئی پورٹرز در گور تھے۔ برف کی دنیا میں منجمد وجود لیے دنیا کی تپتی دھوپ سے اکتائے ہوئے گلکی میموریل کے ٹو بیس کیمپ کے سینے میں موجود گورستان کی سرد آغوش میں دفن میٹھی نیند کے مزے لیے یہاں کئی چٹانیں تھیں ان چٹانوں پر سلور کی تھالیاں تھیں جنہیں لمبی کیلوں سے ٹھونکا گیا تھا ان سلور کی تھالیوں میں رنگ برنگے نام چسپاں تھے۔ ایک کے بعد ایک اور بہت دور تک۔ پھیلے ہوئے نام وہ نام زیادہ تر غیر ملکیوں کے تھے یا پھر بلتی پورٹرز کے۔ ان چٹانوں کے نیچے برف کی گور اور اس گور میں موجود منجمد وجود۔ ادھوری خواہش، ٹوٹے ہوئے خواب، ان سلور پلیٹوں پر اگلا نام کس کا ہو گا یہ سوچ کر میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور میں جھرجھری لے کر آگے چلنے لگا۔ گلمان ایک چٹان پر اپنا نام لکھ رہا تھا۔ ہیلے ایک اور چٹان پر

جھکا بیٹھا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں پرنم تھیں۔ اس چٹان پر لگی سلور پلیٹ پر اس کی محبوبہ جولی کا نام ابھر رہا تھا۔ جو دو سال پہلے اس کے ہمراہ آئی تھی اور پھر کبھی واپس نہ جا پائی۔ ماحول مزید سوگوار ہو رہا تھا۔ وحشتیں دور دور تک پھیل رہی تھیں۔ شام سرک رہی تھی۔ ایک اداس...... بے حد اداس سی شام ہیلے جولی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ ہمیں اس کے ساتھ رکنا تھا اور ہم رک گئے۔ گلمان ایک کتبے پر اپنا نام نقش کر چکا تھا۔

☆......☆

Day-4

ہم کیمپ 4 سے نکل چکے تھے۔ یہاں سے آگے کا درجہ حرارت ہمیشہ منفی ہوتا ہے۔ یہاں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ پائیو سے آگے کسی مقام پر بارش کم ہی ہوتی تھی بس آسمان سے برف کی گولیاں برستی تھیں اور مسلسل برستی تھی اور ان برف کی گولیوں میں سفر کرنا ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے۔ کیمپ 4 کے بعد ڈیتھ ڈراپ شروع ہو جاتا ہے۔ کسی بھی لمحے الوداع آسکتا ہے یا کوئی برف کا تودا اچانک گرنے سے آپ ہمیشہ کے لیے اس میں فنا ہو سکتے ہیں۔ ہم اپنی روپ کے سہارے ہاتھوں میں ٹریکنگ اسٹک تھامے برف کے نگر میں چل رہے تھے۔ ایک بار آپ کیمپ 4 تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو آپ بلا جھجک بنا کچھ سوچے ایک فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا تو گرنا ہے یا پھر مرنا ہے۔ منزل کے قریب بہت قریب پہنچ کر واپس آنے کا تصور موت کے تصور سے کہیں زیادہ دردناک ہوا کرتا ہے۔ اردگرد ٹمپریچر اتنا نیگو تھا کہ ہمیں اپنا خون جمنے کے ساتھ ساتھ ہڈیوں کا گودا تک جمتا ہوا محسوس ہوا اور وہاں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے اگر ہم ایک پل کے لیے بھی خود کو حرکت نہیں دیتے تو ہم منجمد ہو سکتے تھے اور وہیں برف کی ڈھیر میں ڈھیر بن سکتے تھے۔ ہم بخوبی واقف تھے کہ کسی نہ کسی طرح ہمیں خود کو گرم رکھنا ہے۔ اپنے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت میں رکھنا ہے۔ ایک دفعہ ہمارے جسم کا کوئی حصہ Stuck ہو جاتا تو اس کے بعد ہم ڈیتھ تھے اور پھر واپس آنا ممکن نہیں تھا۔

جگہ جگہ پر دڑاریں پھیلی ہوئی تھیں اور کسی کسی جگہ پر تو یہ دڑاریں اتنی کھلی ہو جاتی تھیں کہ انہیں چھلانگ لگا کر کراس کرنا ایک ہولناک تجربہ بن جاتا تھا۔ ہمارے قدموں کی چاپ کے ٹو پر پھیلی خاموشی کو دھیرے دھیرے جگا رہی تھی۔ وہاں ہم تھے اور بس ہم تھے۔ کبھی کبھی برف گرتی تھی اور اس کے ساتھ ہمارے دل بھی تھم جاتے تھے۔ بہرحال اس جگہ پر برف کا گرنا یا ذرا سی ہلچل ہمارے لیے کسی طوفان سے بڑھ کر تھی۔

☆......☆

ہم Camp-5 میں اپنا خیمہ نصب کر چکے تھے۔ گلمان برف پگھلا کر پانی گرم کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا اور ہیلے خالی آنکھوں کے ساتھ جولی کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ اس کی پلکوں کے گوشے اب بھی نم تھے میں سلیپنگ بیگ سیٹ کر کے اس میں لیٹا ہوا تھا ہم اتنی بلندی پر تھے کہ کیمپ کے اس حصے میں آکسیجن بمشکل پہنچ رہی تھی۔ گلمان کا دعویٰ تھا کہ وہ بنا آکسیجن ماسک کے ایورسٹ بھی Summit کر سکتا ہے اسے اردگرد کے ماحول سے خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ ہیلے جوان تھا بلندی نے اس کے پھیپھڑوں کو بھی متاثر نہیں کیا تھا جب کہ آکسیجن کی کمی کے باعث میری وینز پھول رہی تھی اور وینز پھولنے کے ساتھ ساتھ میرا سانس بھی پھول رہا تھا۔ آکسیجن ماسک کی ضرورت صرف مجھے تھی اور میں ماسک چڑھائے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆......☆

Day-5

اگلی صبح ہم کیمپ 5 سے نکل چکے تھے۔ جان لاک وقفے وقفے کے بعد ٹرانسمیٹر پر ہم سے رابطہ کر رہا تھا۔ وہ

پریشان تھا بہرحال یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی وہ ہماری ٹیم کا لیڈر تھا۔ اسے پریشان ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیمپ 5 کے بعد آپ کا آگے بڑھتا ہر قدم آپ کے دل سے تمام خدشات خود بخود مٹا دیتا ہے۔ سامنے بلندیوں پر رقص کرتی دھند ہوتی ہے اور اس دھند میں چھپی ہوئی ایک نکھری سی چوٹی اور وہ عشق کی چوٹی تھی جان لاک کی اطلاع کے مطابق اگلے 5 گھنٹوں میں برف کا طوفان شروع ہونے والا تھا اور وہ بار بار سختی سے واپس آنے کو کہہ رہا تھا مگر یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ ہم 5 گھنٹوں میں بیس کیمپ تک بھی نہیں پہنچ سکتے لیکن ہم کوشش کرتے تو ان پانچ گھنٹوں میں ہم Peak تک ضرور پہنچ جاتے اور اگر ایک بار ہم Peak تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر کسی قسم کا طوفان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

## Day-5

وہ کئی راتوں پر بھاری رات تھی۔ برف کا طوفان جاری تھا اور اتنی جوش و خروش سے جاری تھا کہ گرم دستانوں میں موجود ہمیں اپنے ہاتھ منجمد ہوتے محسوس ہوئے اور ہمارے پاؤں کے انگوٹھے بھی منجمد ہونے کو تھے۔ ہیلے اور گلمان کی نگاہیں اب بھی ساکت تھیں وہاں کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ ان کے بس میں نہیں تھا وہ اس طوفان سے بھی لڑ جاتے۔ ہمارا خیمہ برف کے دباؤ کو برداشت کرنے کے لیے اور تیز ہوا کے بدلتے رخ جھیلنے کے لیے ناکافی تھا۔ میں نے ہیلے کی مدد سے برف میں ایک غار کھودا۔ فی الحال خود کو بچانے کے لیے ہم جتنا کر سکتے تھے وہ یہی تھا ہمارے جوتوں کا چمڑا جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا اور ہمارے پاؤں جم چکے تھے۔ ہم چیک کراس ڈربے نما غار میں دبک کر بیٹھے رہے۔ میں اونگھنے لگا اور جانے کب تک اونگھتا بھی رہا۔ جب آنکھ کھلی تو سامنے براڈ پیک کو پایا۔ براڈ پیک کے پیچھے سے چھپتی ہوئی روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی اور روشنی کی وہ کرن یقیناً سورج کی تھی۔ زندگی کی تھکا دینے والی اس طویل رات کے بعد صبح کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ خاص طور پر جب وہ نظارہ آپ کو نئی زندگی کی نوید دے رہا ہو تو کچھ زیادہ ہی دلکش لگتا ہے۔ 76 فٹ کی مسافت پر اس سفاک چوٹی کا بسیرا تھا جہاں اب بھی دھند لہرا رہی تھی۔ پہاڑ اتنے خوب صورت ہوتے ہیں وہ کسی کی جان کیسے لے سکتے ہیں۔ چوٹی کی طرف بڑھتے ہوئے گلمان نے مسکرا کر کہا۔

ٹرانسمیٹر پر جان لاک کو طوفان تھم جانے اور ہمارے بچ جانے کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ ہم تینوں چوٹی کی طرف بھاگے اور پھر دیوانہ وار بھاگے ایک دوسرے کے آگے پیچھے بے قابو ہو کر۔ اردگرد سے بے نیاز سے۔ چوٹی دس قدم کی دوری پر رہ گئی۔ ہیلے رک گیا۔ اور پھر ہم بھی رک گئے۔ ہیلے کی پلکوں کے گوشے ایک بار پھر نم ہونے لگے تھے اور اب کی بار صرف ہیلے کی نہیں بلکہ ہم دونوں کی آنکھیں بھی اشک برسانے لگی تھیں۔

"میں کوہِ عشق کی چوٹی سے مل کر لوٹوں گا۔"

"اور میں کے ٹو فتح کرنے آیا ہوں مر جاؤں گا مگر اکیلا واپس نہیں پلٹوں گا۔"

بیس کیمپ کی طرف جاتے ہوئے گلمان اور ہیلے نے ہاتھ ملا کر کہا تھا۔

اور میں...... میں حماد لودھی ان دونوں کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ میری زندگی کا یہی اصول تھا میں گھر سے کبھی کسی پہاڑ کو فتح کرنے نہیں نکلتا تھا۔ وہ اتنے عظیم ہوتے ہیں کہ انہیں فتح کرنا اور ان پر اپنی عظمت کا جھنڈا لہرانا مجھے کبھی پسند نہیں تھا۔ میں بس قدرت کی خوب صورتی دیکھنے کا قائل تھا۔ وہ کے ٹو فتح کرنے آئے تھے۔ کے ٹو پر پہلا حق ان کا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی رفتار آہستہ کر لی۔

"ہیلے تم جاؤ تمہارا پہلا حق ہے۔"

''نہیں گلمان پہلے تم جاؤ، یہ تمہارا ملک ہے۔ یہ تمہاری چوٹی ہے اور اس چوٹی پر پہلا حق تمہارا ہے۔'' پیک سے پانچ فٹ دور میں نے دونوں کو تکرار کرتے سنا۔

''تم میرے ملک کے مہمان ہو تم جاؤ۔'' گلمان نے ایک بار پھر اپنی بات پر زور دیا۔

''مہمان کو ریسیو کرنے کے لیے کسی میزبان کا وہاں پر پہلے سے موجود ہونا لازمی ہے۔ میں چاہتا ہوں جب میں مسلم دنیا کے عظیم ملک کے شمال میں واقع دوسری بڑی چوٹی پر پہنچوں تو وہاں اس ملک کے کسی میزبان کو اپنا منتظر پاؤں۔'' اس نے بلا جھجک اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''عجیب رشتہ ہے انسان کا پہاڑوں سے پہاڑوں کا انسان سے صدیوں پرانا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک بلند مقام پر جا کر طلوع آفتاب کو دیکھ کر اسے اپنا رب خیال کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صحرائے سینا کے سینے میں پھیلی ایک پہاڑی کی چٹان پر اپنا عصا مارا تو پیاس سے بے حال بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے لیے الگ الگ پانی کے چشمے پھوٹے اور پھر ہمارے نبی حضرت محمدؐ اور بلندی پر غار حرا اور اس غار کے نصیبوں والے وہ عظیم پتھر جن پر جبرئیل علیہ السلام اور حضورؐ کا سانس پھیلا جنہیں آپ کی قربت محسوس ہوئی۔''

کیسی خواہشیں تھیں کیسا عشق تھا۔ یہ کیسی جستجو تھی جو سب کی سمجھ سے باہر تھی۔ لاحاصل عشق...... بنا کسی سودے کا عشق ایک مکمل لازوال عشق سا تھا۔ محبت کے بدلے میں محبت ضروری ہوتی ہے مگر یہ کیسی محبتیں تھیں کیسی چاہتیں تھیں جہاں ایک دیدار محض ایک دیدار کی چاہ میں قدم قدم پر 109 عاشق درگور ہوئے تھے۔ ہم سجدے میں چلے گئے یونہی روتے ہوئے۔ آنسو بہاتے ہوئے۔ اگلے بیس سے پچیس منٹ ہم نے اس ظالم چوٹی پر گزارے جسے اب ہم تسخیر کر چکے تھے۔ نیچے بیس کیمپ میں موجود پورٹرز اور ہماری ٹیم کے نعرے ٹرانسمیٹر کے ذریعے بخوبی ہم تک پہنچ رہے تھے۔ ہم نے چوٹی سے نیچے کی جانب دیکھا۔ ہم بلند مقام پر تھے ہمارے وجود ایک مقدس بلندی پر موجود تھے۔

''کیسا رشتہ...... یہ کیسا تعلق تھا۔ انسان کا بلندیوں سے بلندیوں کا انسانوں سے کیوں ہر بار انسان کی سوچ اسے بلندیوں پر لے جاتی ہے۔ کیوں سارے خواب ایسے بلندی کی دہلیز پر لا کے کھڑا کر دیتے ہیں۔ کیوں انسان پستی میں جانے سے خوف کھاتا ہے۔ کیوں اسے اپنے سے نیچے لوگ دکھائی نہیں دیتے۔''

کسی بھی پہاڑ کو سر کرنے کے بعد آپ یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ اب آپ محفوظ ہیں۔ یہ پہاڑ آپ کو تب تک زندگی کی ضمانت نہیں دیتے جب تک آپ یہاں سے پلٹ کر واپس وادی میں نہیں آجاتے۔ ہم عظیم بلندی پر موجود تھے۔ یہاں سے جنوب کی طرف قراقرم کی ہڈن پیک گشابرم دو، تین چار اور براڈ پیک کی تینوں چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بے شک ہر بلندی کو زوال حاصل ہے۔ انسان جتنی بھی بلندی پر پہنچ جائے اسے واپس پلٹنا ہی پڑتا ہے۔ نیچے جانے کے لیے واپس پلٹنے کے لیے بھی بلند حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم چوٹی پر اپنی عظمت کا جھنڈا لہرا چکے تھے مگر ہم ابھی خود کو کامیاب کہنے سے قاصر تھے واپسی کا راستہ باقی تھا اور وہ اتنا ہی خطرناک اور جان لیوا تھا۔

☆......☆

Day-10

کنکورڈیا کے راستوں سے دھوپ اندر آئی اور ارد گرد پھیلنے لگی۔ بیس کیمپ میں ہماری ٹیم کے افراد موجود تھے۔ نیلی ٹوپیاں پہنے اسنو گوگلز چہروں پر سجائے اور وہ بے حد خوش تھے ہم کے ٹو فتح کر آئے تھے۔ اس عظیم

طوفان کے بیچ ہمیں ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔ کچھ ایسی ہی بے یقینی کی حالت ان کی بھی تھی۔ ایلی پورٹرز کے ساتھ مل کر ٹیونا فش تیار کررہی تھی۔ جان لاک ہمیں بانہوں میں لیے یہ یقین کررہا تھا کہ ہم صحیح سلامت لوٹ آئے ہیں یا نہیں۔

☆......☆

Day-11

نیچے بیس کیمپ کے نواح میں گلکی میموریل سنسان پڑا تھا۔ گلمان سکندر کی لگائی گئی تختی پر اب برف کی تہہ جم گئی تھی۔ گلکی میموریل...... میں نے ایک سرد آہ بھری یہ جانتے ہوئے بھی فرانسیسیوں کی ترپال بھی ساتھ میں بجھی ہوئی تھی۔ خیموں سے آوازیں قہقہے اور نعرے بلند ہورہے تھے۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور بہت دلجمعی سے چلا۔ فرنگی حسینہ کا رقص، بلتی لوک گیت، پورٹرز کی بانسری، تالیوں کی گونج، آگ کا الاؤ، مشعلوں کی روشنی، سرور، نشہ اور ایک زوردار دھماکا، پھر ایک دل دہلا دینے والی چیخ۔ ایک دوسری چیخ پھر خاموشی۔ برف کی خاموش دنیا میں گہرا سکوت۔ اختتام کلائمیکس کے ٹو نامہ ختم شد، تمام مسافتیں تمام شد۔

☆......☆

Day-12

اگلے کچھ گھنٹوں میں وہاں آرمی آپریشن کررہی تھی اور بڑی پھرتی سے کررہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے کے ٹو Summit کرکے آنے والے دو کوہ پیما اچانک برف کا تودا گرنے سے ہلاک ان میں سے ایک کوہ پیما ہیلے کا تعلق برطانیہ سے تھا اور دوسرا کوہ پیما گلمان سکندر پاکستانی تھا۔'' نیوز کوریج کی جارہی تھی۔

کچھ دیر بعد برف کا تودا کاٹا جانے لگا۔ وہ بزرگ برف تھی اور پتھروں سے زیادہ سخت تھی۔ اس برف کے تودے سے ایک ہاتھ باہر نکالا گیا ایک بے جان ہاتھ۔ خون میں لت پت ہاتھ۔ اس ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔ ایک کاغذ تھا اور اس کاغذ پر تحریر کی گئی ایک ادھوری سی نظم۔ تصویر میں ٹوٹے ہوئے مگ کی کرچیاں اور ان کرچیوں کو سمیٹتی ایک لڑکی۔ برف کھود کر ایک ڈیڈ باڈی باہر نکالی گئی۔ پہلا کلک۔ پھر دوسری ڈیڈ باڈی باہر نکالی جانے لگی۔ دوسرا کلک۔ ایلی کی دبی دبی چیخیں فرنگی حسیناؤں کے آنسو کے ٹو کی نمی میں ڈوبی سرد ہوا، بجھی بجھی سی برف ماتمی سسکیاں اور بے یقینی ہی بے یقینی۔ ڈیڈ باڈیز کو اسٹریچرز پر باندھ کر نیچے لایا جارہا تھا۔ تیسرا کلک۔ اس سارے آپریشن کی مکمل ویڈیو کوریج جاری تھی۔ تصویریں اتر رہی تھیں۔ معصوم چہروں کی بے جان جسموں کی گلکی میموریل کی ایک خوفناک دراڑ میں پہلے میزبان کوہ پیما کو ڈالا گیا۔ پانچواں کلک۔ انہیں برف سے ڈھانپا جارہا تھا۔ چھٹا کلک اس چٹان کے اوپر برف جمی تھی اور اس برف کے نیچے گلمان سکندر کا نام درج تھا اور وہ نام اس نے خود نقش کیا تھا۔ کوریج مکمل ہوچکی تھی۔ آرمی ٹیم واپس جارہی تھی۔ ہم بھی واپس پلٹ رہے تھے کچھ بوجھل سے کچھ اداس سے۔ دو ہیروز کھو دینے کے بعد میں نے وہ تصویر اور کاغذ اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

میں کے ٹو کی چوٹی سے مل کر لوٹوں گا۔'' ایک سرگوشی۔

''مجھے نہیں لگتا طوفان اتنی جلدی شروع ہوگا۔'' دوسری سرگوشی۔

''اور مجھے نہیں لگتا طوفان ہمارا کچھ بگاڑ پائے گا۔'' تیسری سرگوشی۔

اور وہ سچے تھے طوفان نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ طوفانوں سے لڑ کر لوٹے تھے مگر ایک برف کا تودا صدیوں سے ہوا میں معلق ایک ظالم برف کا تودا یوں اچانک ان کی زندگی چھین کر لے گیا۔

ٹی وی پر ہر چینل بار بار اس نیوز کو ہائی لائٹ کر رہا تھا۔ وہ ٹی وی اسکرین کے سامنے گنگ بیٹھی تھی۔ بالکل ساکن۔ بنا پلکیں جھپکے بنا سانس لیے اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''وہ کوئی اور ہوگا۔'' کچھ لمحوں کے بعد جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ لینڈ لائن پر کسی کی کال آ رہی تھی اور مسلسل آ رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی لینڈ لائن تک آئی ریسیور اٹھایا اور کان کو لگا لیا۔ ''ہاں نتالیہ میں نے خبر سنی ہاں وہ کوئی اور ہوگا۔ میڈیا والے جھوٹ کہتے ہیں۔ وہ گلمان نہیں ہے۔ گلمان تو فل نہیں ہے وہ کے ٹو Summit کر آیا تھا۔ پھر وہ کیسے مر سکتا ہے۔ وہ بھی برفانی تودا گرنے سے۔ نہیں وہ نہیں مر سکتا۔ وہ کہہ کر گیا تھا میرا انتظار کرنا میں آؤں گا اور تم جانتی ہو ناں وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کیا کرتا ہے۔ تم آنسو مت بہاؤ نتالیہ دیکھنا وہ لوٹ آئے گا۔ او کے میں کال بند کرتی ہوں۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ شدید نیند۔'' اور پھر وہ آنکھیں بند کر کے وہیں سو گئی۔ اسے حقیقت کو سمجھنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

☆......☆

اگلے کچھ دنوں کے بعد حماد لودھی یونیورسٹی آیا تھا۔ وہ بھی گئی تھی۔ وہ جانتی تھی حماد آیا ہے تو گلمان بھی آیا ہوگا۔ حماد کے اردگرد میڈیا کا انبار لگا ہوا تھا۔

☆......☆

اگلے کچھ دنوں کے بعد حماد لودھی یونیورسٹی آیا تھا۔ وہ بھی گئی تھی۔ وہ جانتی تھی حماد آ رہا ہے تو گلمان بھی آیا ہوگا۔ حماد کے اردگرد میڈیا کا انبار لگا ہوا تھا۔ گلمان بھی یہیں کہیں ہوگا۔ اس نے خود کو تسلی دی اور پھر وہیں بیٹھ کر حماد کے فری ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ ایک گھنٹہ گزرا، پھر دوسرا...... پھر تیسرا وہ تھک کر ٹہلنے لگی۔ جرنلسٹ کا دائرہ مزید بڑھ رہا تھا۔ وہ اکتا سی گئی۔ تقریباً چار گھنٹے گزرنے کے بعد اس نے حماد کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

''گلمان......'' اس نے اردگرد نگاہ دوہرائی وہ اب کہیں نہیں تھا۔

''گلمان کہاں ہے؟ وہ آیا کیوں نہیں آپ کے ساتھ؟'' حماد خاموش رہا۔

''آپ! بول کیوں نہیں رہے۔ میں آپ سے پوچھ رہی ہوں گلمان کدھر ہے۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔'' اس نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ حماد سر جھکائے کھڑا رہا۔ جیسے اسے تسلی دینے کے لیے مناسب الفاظ ترتیب دے رہا ہو۔ ''گلمان ٹھیک تو ہے ناں۔'' دل میں پہلی بار امید کی کرن بجھی تھی۔ پہلی بار اسے کسی انہونی کا سائرن سنائی دیا تھا۔

''مجھے معاف کرنا سروش۔ وہ اب نہیں رہا۔'' حماد نے آہستگی سے کہا۔

''کیا مطلب نہیں رہا، وہ مجھ سے وعدہ کر کے گیا تھا وہ آئے گا تو آیا کیوں نہیں۔''

حماد نے اپنی پاکٹ سے ایک پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ پیکٹ کھولا۔ اندر ایک تصویر تھی۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ ایک ٹیپ تھی اور خون میں لپٹی وہ تصویر اس کے لیے نئی نہ تھی۔ اس تصویر کی پشت پر کچھ مٹے مٹے سے نقوش تھے اس نے ان نقوش کو پڑھنے کی کوشش کی۔

"The beautiful ledy of
The world I ever meet."

اس نے کاغذ کی تہیں کھولنا شروع کیں۔

محبت کی اس وادی میں

جہاں سب رنگ پاکیزہ ہیں
جہاں سورج کی آب وتاب حقیقی ہے
جہاں ندی میں بہتے پانی کا رنگ
محبت سا شفاف ہے
اس وادی محبت میں!
سنگ تمہارے چلتے چلتے
کوہ عشق کی چوٹی کو!
تمہارا ہاتھ تھامے سر کرتے کرتے
ایک پرانا خواب پھر سے جاگ اٹھا ہے
جواب اپنی تعبیر مانگتا ہے
مجھے ان کے حصول کو جانا ہے
تم انکار مت کرنا بس میرا انتظار کرنا
بھلے کتنے سال بیت جائیں
تا صدیوں کے ورق پلٹ جائیں
مگر امید اور محبت پر یقین تو
زمانے اور وقت سے ماورا ہوتا ہے
ہاں تم اس محبت کی وادی میں
یقین کی آبشار تلے
انتظار کی اس جھیل کے
ساحل پر بیٹھی رہنا
اپنے ریشمی ہاتھوں کی گداز انگلیوں سے
تم ساحل کی اس ریت پر
ہر ان کہی بات لکھ دینا
پھر جب ریت ہوا کے سنگ اڑتی ہوئی
مجھ تک آئے گی
میرے چہرے کو چھوئے گی
تو میرے کان میں سرگوشی کر کے
تمہاری سبھی تحریریں کہہ دے گی
سنو!
تم میرا انتظار کرنا
جب بھی آنگنِ کائنات میں نیا دن اترے
جب بھی برسات ماحول کو حسن کی ردا سنائے

جب بھی دھنک افق کو رنگین کر جائے
جب بھی سورج شام کی دلہن کو مہندی لگائے
جب بھی چاندنی رات کو نور سے غسل کروائے
جب بھی گل کو شبنم وضو کرائے
تم مجھے یاد کرنا
میرا انتظار کرنا
میں اپنی محبتوں کی صداقتوں کے ساتھ
میں اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ
میں ابھرتے دن کی شہادتوں کے ساتھ
میں چڑھتے سورج کی تمازتوں کے ساتھ
لوٹ آؤں گا
تمہیں اپنا بنانے کی خاطر
اور اپنا آپ سونپنے کی خاطر
لوٹ آؤں گا ہاں لوٹ آؤں گا

آگے کی تحریر پر خون چسپاں......وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

''یہ کیا ہے حماد؟'' اس نے ٹیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''گلمان کی آخری فون میسج ہے۔''

''میں اس کا کیا کروں گی۔'' اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ گلمان کو اس حالت میں دیکھ پاتی۔ بے جان، مردہ، بنا سانسوں کے اور وہ یہ کبھی نہیں کر سکتی تھی۔

''وہ ایک شخص......اس کا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کوہِ عشق کی قسمت میں تھا اور اسے بنا مانگے ہی مل چکا تھا۔ اس نے اس کے عشق کے بیچ آنا چاہا تھا اور قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔''

''مجھے اس ٹیپ کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے لفافہ واپس حماد کی طرف بڑھا دیا اور آنکھیں بند کر کے لگاتار روتی چلی گئی۔ جیسے سارے آنسو ختم کر دینا چاہتی ہو۔ بہت دیر لگی تھی۔ اسے یہ جاننے میں کہ وہ جو اس کا کبھی تھا ہی نہیں وہ اب نہیں رہا تھا۔

☆......☆

''چھوٹی بی بی باہر کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' وہ فائلز پر جھکی پچھلے سال کے ریکارڈ چیک کر رہی تھی جب رحیم بابا نے اسے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔

''اس وقت......!'' کندھوں پر پھیلی شال کو سرکا کر سر پر لاتی ہوئی وہ وال کلاک کی جانب دیکھنے لگی جو رات 10 بجے کا الارم بجا رہا تھا۔

''کون ہے بابا؟'' اس کے لہجے میں حیرانی و پریشانی کا ملا جلا تاثر موجود تھا۔

''جی کوئی ارسل صاحب ہیں کہتے ہیں آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ اس لیے ارجنٹ ملنا چاہتے ہیں۔''

''ارسل......!'' اس نے زیر لب کہا۔

یہی راتیں تھیں، یہی موسم تھا، وقت کی سوئیاں پھر سے انہی لمحات پر آ کر رکی تھیں جہاں ساتھ درکار تھا مگر

ساتھ میسر نہیں تھا۔
''چھوٹی بی بی آپ نہیں ملنا چاہتی تو انہیں واپس بھیج دوں۔'' رحیم بابا اسے سوچ کے سمندر میں ڈوبا دیکھ کر آہستگی سے بولے۔
''نہیں بابا! آپ انہیں ڈرائنگ روم میں لے کر چلیں میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ پورے وقار سے بولی۔
''جو حکم چھوٹی بی بی۔'' کریم بابا اپنی سرخ اونی ٹوپی ہلاتے ہوئے باہر نکل گئے اور وہ ایک بار پھر مضبوط نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔
''السلام علیکم سروش۔'' اس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ارسل نے اٹھ کر شائستہ انداز میں کہا۔
''جی وعلیکم السلام تشریف رکھیے پلیز۔'' وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے سامنے پڑی کرسی پر براجمان ہو گئی۔ ان تین سالوں میں وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ سوائے اس کے چہرے پر پھیلے خود غرضی کے آثار کے جواب شرمندگی کا تاثر لیے ہوئے تھے۔ وہ نظریں نہیں ملا پا رہا تھا جب کہ وہ سکون سے بغیر جھجکے اس کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔
''جی کیسے آنا ہوا؟''
''یہاں آنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا لازمی ہے کیا میری خالہ کا گھر ہے جب چاہے آسکتا ہوں۔''
''معاف کیجیے گا مسٹر ارسل مگر آپ کی خالہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں اس لیے اگلی بار جب آپ یہاں کا رخ کریں تو پلیز وقت کو مدِ نظر ضرور رکھیے گا۔'' اس نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔
''میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔''
''مجھے آپ سے کسی قسم کا کوئی شکوہ نہیں ہے۔''
''مگر مجھے ہے تمہیں مجھے روکنا چاہیے تھا۔'' وہ شکوہ رساں ہوا۔ ''جانے والوں کو کون روک سکتا ہے ارسل صاحب، اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں رہا جو باتیں اذیت دیں انہیں بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' وہ اس پر حقیقت عیاں کرتی ہوئی آہستگی سے بولی۔
''پتا ہے سروش میں نے خالہ سے وعدہ کیا تھا کہ تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا اور میں اب اپنے وعدے کی تکمیل چاہتا ہوں۔''
''وعدے کی تکمیل۔'' وہ بے دلی سے مسکرائی۔
اور پھر مسکراتی چلی گئی۔ ''ہمیں لوگوں کی، ان کی باتوں ان کے وعدوں کی قدر ہمیشہ تب کیوں ہوتی ہے۔ جب وہ منوں مٹی کے بوجھ تلے دفن ہوتے ہیں جب انسان گزر گیا تو اس کے وعدوں کی کیا اوقات بھول جائیں سب مجھے ان باتوں میں پھر سے مت الجھائیں۔'' اس کے بھیگے لہجے میں التجا چھپی تھی۔
''تم مانو نہ مانو مگر تمہیں میرے ساتھ کی ضرورت ہے اور ہمیشہ رہے گی تم زندگی کا مقابلہ تنہا نہیں کر سکتیں۔'' ارسل نے اسے ایک بار پھر یہ باور کروانا چاہا تھا کہ وہ کمزور ہے۔ ''تین سال پہلے اسپتال کے لان میں بیٹھ کر آنسو بہاتی کمزور لڑکی کو شاید ہی آپ کے ساتھ کی ضرورت ہو پر آج تین سال بعد ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز سروش درانی کو آپ کے ساتھ کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔'' وہ اپنے ازلی دوٹوک لہجے میں بولی تھی۔
''تم خاصی میچور ہو گئی ہو۔''
''وقت کی مہربانی ہے ارسل صاحب سب سکھا دیتا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔''
''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اتنی سی بات تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔''

"اور میں آپ سے کسی قسم کا کوئی رشتہ استوار نہیں رکھنا چاہتی آپ کیوں سمجھ نہیں پا رہے۔"
"اگلے ہفتے امی آ رہی ہیں ان کے ساتھ جا کر شاپنگ کر آنا اور اس معاملے میں تمہاری کوئی ضد نہیں چلنے والی۔"
"نتاشہ کیسی ہے؟" ارسل نے جتنے مان سے کہا تھا اس نے اس سے کہیں زیادہ لاپرواہی سے جواب دیا۔
"ٹھیک ہی ہو گی۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"کیا مطلب ٹھیک ہی ہوں گی بیوی ہے وہ آپ کی۔"
"اب ہم ساتھ نہیں رہے۔"
"اوہ تو اس لیے آپ میرا ساتھ مانگنے چلے آئے۔" اس نے لہجے میں تنفر کو سمویا۔
"ہم کبھی بھی ساتھ نہیں رہے۔ لندن جاتے ہی اس نے مجھ سے طلاق لے لی۔ میں واپس آنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں ہو پا رہی تھی تمہارا سامنا کرنے کی اب اگر ہمت کر کے آ ہی گیا ہوں تو پلیز انکار مت کرو۔ تم جو کہو گی جیسا کہو گی ویسا ہی ہو گا۔" اس نے ایک بار پھر التجا کی۔
"میں شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔"
"میں انتظار کر لوں گا۔"
"کب تک انتظار کریں گے آپ؟"
"جب تک تم کہو گی۔"
"میں نے لفظوں پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے۔"
"تم مجھے کبھی بھی آزما سکتی ہو۔" وہ خاموش رہی۔
"K-2 Nama پر فیچر تم نے لکھا تھا؟"
"جی...... کیوں؟" وہ چونکی۔
"کچھ نہیں اچھا لکھا تھا۔" اس نے سرسری سا جواب دیا۔
"گلمان سکندر کے بارے میں جانتی ہو؟" اس نے سروش کے چہرے کو کریدتے ہوئے سوال کیا۔
"اتنا ہی کہ وہ ایک کلائمبر اور عظیم انسان تھا۔" وہ ہڑبڑائی اس کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی۔
"عظیم انسان۔" وہ مسکرایا۔
"گلمان سکندر کبھی عظیم انسان نہیں رہا۔ اس نے خود پر بس عظمت کا لیبل لگا رکھا تھا۔ میں نے زندگی کے سترہ سال اس کے ساتھ گزارے ہیں اور گلمان سکندر کی فطرت کو مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان سترہ سالوں میں اس میں کوئی ایک اچھائی تلاش کر سکوں مگر میں ناکام رہا۔"
"اچھائی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہونی چاہیے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے پھسلا۔
"تم ٹھیک کہتی ہو مگر ڈرنکس، ڈرگز، آئے روز نت نئی گرل فرینڈز ایسی برائیاں اگر سامنے کی جائیں اور سرِ عام کی جائیں۔ آنکھوں کی اچھائی بہت پیچھے دفن ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ ذہین و فطین قسم کا طالب علم ضرور تھا مگر وہ کبھی عظیم نہیں رہا۔ تمہیں اپنی سوچ میں تبدیلی لانا ہو گی۔" ارسل نے گلمان کی ذات پر پورا تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔
جواباً وہ خاموش رہی۔ وہ کہنا چاہتی تھی ایسا نہیں ہے۔ وقت کے چھ سالوں نے اسے گناہوں کی دلدل سے نکال کر عظمت کے دائرے میں داخل کر دیا ہے۔ کسی اور کے لیے نہ سہی مگر وہ اس کے لیے ہمیشہ عظیم رہا ہے۔ ٹوٹ کر چاہنے والا، ٹوٹ جانے سے خوف کھانے والا، تنہا ستم جھیلنے والا، خود فریب سا اسے کبھی محبت

نہیں ہو سکی خوش فہم سا، میں محبت کا باب اپنی زندگی کی کتاب سے نکال چکا ہوں اور کچھ کچھ غلط فہم سا۔ خوب صورتی کسی کی جان کیسے لے سکتی ہے۔" وہ خاموش رہی کچھ سوالوں کا جواب نہیں ہوتا اور کچھ سوال جواب دینے کے لیے نہیں ہوتے۔ وہ اس وقت گلمان سکندر کی ذات کو لے کر ارسل سے کوئی Argue (آرگیو) نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆......☆

ہر غم کے بعد صبر آ جاتا ہے۔ ہر نقصان کے بعد تلافی ہو جاتی ہے۔ ہر ظلم کو زوال آ ہی جاتا ہے۔ ہر دکھ کی سہ پہر کو سکھ کی ٹھنڈی شام مل ہی جاتی ہے۔ ذرا سی محنت بس ذرا سی محنت سے زندگی میں ہر شے کا نعم البدل مل جاتا ہے۔ نہیں ملتا تو صرف اس شخص کا نعم البدل نہیں ملتا جو بھی آپ کے وجود کا حصہ رہا ہو۔ جس کے انتظار میں آنکھیں راکھ ہوئی ہوں۔ جس کی ہر آہٹ پر دھڑکنیں منتشر ہوتی ہوں۔ جس کا لمس اٹھتے بیٹھتے اپنے ہونے کی گواہی دیتا ہو جو زندہ نہ ہو کر بھی دل کے ہر کونے میں جاوید ہو۔ پھر زمانہ چاہے جتنی کوشش کر لے، اس کی قبر پر کتنے ہی کتبے مزید سجا دے کتنے ہی طاق جلا دے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یاد کی ہلکی سی آنچ کبھی بھی کہیں بھی کسی بھی لمحے آنسوؤں کو بھڑکانے میں کافی ہوتی ہے۔ مرنے والوں کا تو نعم البدل مل ہی جاتا ہے مگر دل میں بسنے والوں کا کوئی Alternative نہیں ہوا کرتا۔

آنسوؤں کی شدت میں روانی آئی تھی۔ اسے کسی ساتھ کی ضرورت تھی مگر کوئی کندھا میسر نہیں تھا۔

"زندہ رہنے کے لیے ہر بار محبت اتنا معنی نہیں رکھتی بعض مقامات پر چاہ ہوتی ہے تو صرف کسی کے ساتھ کی کسی کے سہارے کی اسے مجھ سے محبت نہیں ہے میں تسلیم کرتی ہوں۔ اسے آئندہ بھی مجھ سے محبت ہو گی میں ایسی کوئی امید نہیں رکھتی مگر پھر بھی مجھے اس کا ساتھ چاہیے۔ میں زندگی سے تنہا نہیں لڑ سکتی۔ مجھے ایک سہارا چاہیے۔" اسے اپنی ڈائری پر لکھے گئے الفاظ یاد آئے۔ گلمان سکندر کو سروش درانی سے محبت تھی۔ ایسا اس کے دل نے کہا تھا اور کئی بار کہا تھا۔ سامنے پڑا کاغذ کا ٹکڑا اس ان کہی محبت کو زبان دے رہا تھا۔ اظہار ہو چکا تھا مگر ساتھ کھو چکا تھا۔ زندگی میں ایسے موڑ آتے رہتے ہیں جب وقت اختیار میں نہیں رہتا اور جب وقت ہی اختیار میں نہ رہے تو زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے کے بجائے خود کو قسمت کی ناؤ کے حوالے کر دینا چاہیے۔ یہ اس کی اپنی سوچ تھی۔

"تب ساتھ درکار تھا مگر محبت نہیں تھی اب محبت ہاتھ آئی ہے تو ساتھ کھو گیا ہے۔ زندگی بھی آسائشیں ایک ساتھ تو نہیں بخشتی ناں۔"

"میں تمہارا ساتھ دینے آیا ہوں۔" ارسل کی سرگوشی ابھری۔

"ثانی میں بس یہ چاہتا ہوں آپ ایک نئی زندگی کی شروعات کریں کسی ایسے کے ساتھ جو بس آپ کے لیے ہو۔ یقین کریں اسی میں میری خوشی ہے۔" دوسری سرگوشی گلمان کی تھی۔

وہ گلمان سکندر کی خوشی چاہتی تھی اور وہ اس کی خوشی میں خوش تھا۔

"اوپر والا چاہتا ہے آپ ایک محبت کرنے والی روح کے ساتھ زندگی گزاریں۔" نتالیہ کی آواز آئی تھی۔

اس نے مزید کچھ سوچے بنا موبائل فون اٹھایا اور دھیمی سی مسکان لبوں پر سجائے ارسل کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"زندگی میں سب ہمارے مطابق تو نہیں ہوتا نا......!"

☆......☆

# یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

**Click on http://paksociety.com to Visit Us**

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



مون شاہ

ناولٹ

# موسمِ ہجر

"آہ۔" جلن کی شدت سے نمل کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ شفاف بازوؤں کی جلد پر سگریٹ سے داغے جانے کے نشان گول گول ابھر رہے تھے۔ اور جسم کو داغنے والا کوئی اور نہیں احراز بخاری تھا۔ آج



رات پھر اسے شک کے چکر چڑھے تھے اور آج پھر وہ نمل سے نمل کے پیار کا نام جاننے کے لیے بضد تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح احراز بخاری کے دیئے گئے زخم کو خاموشی سے قبول کر رہی تھی۔

”تمہیں بے وفائی کی سزا ضرور ملا کرے گی۔ بولو کس سے فون پر باتیں کر رہی تھیں؟“ احراز نے چیخ کر دریافت کیا تو اس کی روح فنا ہوگئی۔

”میں کسی سے بات نہیں کر رہی تھی احراز...... میرا یقین کریں۔“

”کیسے کروں یقین، میں نے خود تمہاری سرگوشیاں سنی ہیں۔“

نہ جانے وہ کس طرح نہ کی جانے والی باتوں کو بھی سن لیتا تھا۔ وہ سرگوشیاں جو اس نے کی بھی نہ تھیں۔

”نمل بیگم! یہ میری بدقسمتی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ تم میری زندگی کو ویران کرنے چلی آئی ہو۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اپنے کھنڈر دل میں اپنے پیار کی محبت کے اجڑے ہوئے مزار پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے میرے نام کی مہندی ہاتھوں پر سجا رہی ہو اور کیا سمجھتی ہو کہ تم محبت کے اجڑے مزار پر حسرتوں کے چراغ جلاتی رہو گی اور میں بے غیرت بن کر تماشا



دیکھتا رہوں گا۔ نہیں نمل بیگم میں غیرت کو محبت کے قبرستان میں دفن نہیں کر سکتا۔" پھر وہ اس کے نزدیک آیا اور جلتی ہوئی سگریٹ سے نمل کے کان کی لو کو جلایا وہ تڑپ ہی تو گئی لیکن لبوں تک آنے والی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ نمل کے بالوں کو مٹھی میں جکڑے تنفر آمیز لہجے میں بولا۔

"اب جلدی سے نام بتا دو، ورنہ تمہارے ان ہونٹوں کو سگریٹ سے جلا کر خاکستر کر دوں گا جن ہونٹوں سے تم میری غیر موجودگی میں میرے گھر میں نامحرم سے باتیں کرتے ہوئے میری امانت میں خیانت کرتی ہو۔"

نمل نے سخت خوف زدہ ہو کر آنکھیں بھینچ لیں۔ مارے بے بسی کے آنسو مسلسل رخساروں پر پھسلنے لگے۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ انتہائی عاجزی سے بولی تو احراز بخاری نے جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے، سگریٹ کو ڈسٹ بن میں پھینک کر وہ ایک ایک لفظ کو چبا کر بولا۔ "ٹھیک ہے تمہارے کہنے کے مطابق ایسا کچھ بھی نہیں ہے تو ایک کام کرتے ہیں بولو کرو گی؟"

نمل نے ہراساں ہو کر اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوں..... اگر تم کسی اور سے محبت نہیں کرتیں تو میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور میرے سوا کسی کا تمہاری زندگی میں نہ گزر تھا نہ ہے۔"

چھن..... چھن..... اس کے دل کی کرچیاں خود اپنے وجود میں پیوست ہو گئی تھیں۔ یہ کیا کہہ رہا تھا وہ؟

کیسا امتحان تھا؟

کیسی آزمائش تھی؟

کیسی پڑتال تھی؟

وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ احراز نے اس کا شانہ ہلایا۔ "نمل..... کھاؤ میری قسم۔" اب کے اس کا لہجہ فریادی لیکن غیر محسوس طور پر سفاکیت کی جھلک بھی رکھتا تھا۔

نمل نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ احراز بخاری کے سر پر رکھا۔

"میں..... آپ سے بہت محبت کرتی ہوں اور..... میری زندگی میں آپ کے سوا..... کسی کا گزر تھا نہ ہے اور نہ ہو گا۔"

اس کا دل سینے میں تڑپ کر رہ گیا اور چیخ چیخ کر اپنی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے انصاف طلب کرنے لگا۔

دل کی عدالت میں وہ آج مجرم ٹھہری تھی لیکن جب دل نے بے بسی دیکھی تو اپنے پر بے چارگی سے پھڑ پھڑانے لگا۔

احراز بخاری کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ایک پل کے لیے نمودار ہو کر غائب ہوئی۔

اس نے زور سے نمل کا بازو کھینچا اور کلائی مروڑ دی۔

"جن کی زبان حق کہتی ہے وہ تمہاری طرح اٹک اٹک کر کسی مجرم کی مانند اعتراف محبت نہیں کرتے۔" احراز بخاری نے لمحوں میں پینترا بدلا تھا۔

"مگر میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرا یقین کریں۔"

"جھوٹ۔" وہ دہاڑا۔

"جھوٹ بولتی ہو تم۔" احراز اسے کھینچ کر آئینے کے سامنے لے گیا۔

"نمل بخاری! تمہاری آنکھیں تمہارے زبانی بیان کا ساتھ نہیں دیتیں۔ اگر تم حق کہہ رہی ہو تو پھر اس حق کی گواہی آنکھوں سے بھی دو، تمہاری ان آنکھوں میں سچائی نہیں ہے۔"

وہ خاموش رہی تو احراز نے جھنجلا کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

"تم سادہ ہو یا معصوم، یا پھر انتہائی چالاک لیکن تم مجھے پاگل کر دو گی۔"

نمل بخاری خزاؤں کی زد پر آئے زرد پتے کی طرح لرزتے ہوئے احراز بخاری کا جنون بے بسی سے دیکھ رہی تھی جو ہر تجویز کو رد کرتا تھا۔

پھر گویا وہ فیصلہ کر کے اس کا بازو نفرت سے پکڑ کر باہر دھکیلتے ہوئے بولا۔ "تمہاری اس کمرے میں نی

الوقت گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ اب میری زندگی میں بھی تمہاری کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں تمہیں جلد آزاد کروں گا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میرے صبر کا امتحان مت لو۔" احراز نے اسے کمرے سے باہر نکال کر دروازہ بند کرلیا اور وہ اپنا قصور بھی نہ پوچھ سکی اور نہ یہ بتا پائی کہ صبر کا امتحان حقیقت میں کون دے رہا تھا؟

وہ بری طرح سسکیاں بھرتے ہوئے کاریڈور کے سرد فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر گھٹنوں میں سر دیئے ڈھیٹ بن کر بیٹھ گئی۔

"یا اللہ! میں اس وقت طوفانی بارش میں ڈرائیو کررہا ہوں اور سنا ہے بارش میں دعا قبول ہوتی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ کریم میری نمل کو ایسا ہمسفر دے جو اس کو سمجھ سکے، جیسی میری نمل ہے ناں ہنسنے والی ایسا ہی اس کا ہمسفر ہو۔" کوئی یاد کی پر چھائیں جیسا بھولا ہوا لہجہ عجیب مقام پر سماعتوں میں گونجا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا اندھیرے کے سوا کوئی ہمدم نہ تھا۔ جانے کیوں بھولے ہوئے لہجے اس موڑ پر یاد آتے ہیں جب زخموں سے رستا خون مرہم مانگتا ہے اور وہ بھول بھلیوں میں گم ہوتے ہیں، شاید ہم ان کی یادداشتوں میں کہیں محفوظ بھی نہ ہوں۔

آج کی بوجھل رات میں نمل بخاری کی ساتھی صرف تنہائی، بے چارگی، وحشت اور مایوسی تھی۔

☆......☆

کسی انجانے احساس کے زیر اثر حُر عباس نے نیند میں بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی تھکا ہارا لوٹ کر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اگرچہ نیند کی طلب تھی لیکن دل کی وحشت کچھ اور طلب کررہی تھی۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے انتہائی حسرت سے اپنے پہلو میں مطمئن پڑی انفال کو دیکھا۔ درد کی شدید لہر رگ جاں میں کروٹیں لینے لگی۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "ایک تم ہی میرے نصیب میں نہ تھیں ورنہ......"

حُر عباس نے ایک ہی سانس میں پانی کا گلاس ختم کیا اور ضد کرتے دل کو بہلاتے اس سرد رات میں گرم بستر چھوڑ کر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سگریٹ لائٹر اور سیل فون نکال کر ٹیرس پر چلا گیا۔ کسی پل سکون نہ تھا۔ اب بھلا نیند کس کم بخت کو آنی تھی؟

سرد ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ آسمان سے اترتی خنکی سے اس کا وجود کپکپا گیا۔

حُر عباس نے تاریکی میں کھڑی خاموش عمارتوں کو متلاشی نظروں سے دیکھا جن کے مکین خواب غفلت کے مزے لوٹ رہے تھے۔ شاید وہ ان عمارتوں میں سے کسی عمارت کی مکین ہو مگر اس ہنگاموں سے بھرے شہر میں کسی کو تلاش کرنا آسان کہاں تھا، اس کا جی چاہا وہ محوِ آرام شہر کو تہ و بالا کردے اور ہر شہری سے سوال کرے کہ "میرا کیا قصور تھا جو آج میرے دل کی دنیا زیروزبر ہے؟ کیا زندگی کی ان رونقوں سے پورے جی کے ساتھ لطف اندوز ہونا میرا حق نہیں ہے؟ کیا میٹھی نیندوں پر میرا کوئی حق نہیں ہے؟ کیوں میری قسمت میں یہ بے چین نیندیں ہیں یار رتجگے......!

میری یہ آنکھیں جو مدت سے پرسکون نیند کی خواہش مند ہیں آخر کب تک تاوان دیتی رہیں گی؟ میری یہ بانہیں جو کسی کے انتظار میں وا ہیں آخر کب تک نامراد رہیں گی۔ میرے شل ہوتے اعصاب کو نئی روح کب ملے گی؟ کب میرا وجود مکمل ہوگا۔"

حُر عباس کا سر چکرا رہا تھا، وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کو اس سے کیا میں مروں یا جیوں......آپ بس مصروف رہیں اللہ آپ کو ہمیشہ مصروف رکھے۔"

کسی یاد نے دامن پسارا، کوئی بھولا ہوا شکوہ بے چین کر گیا۔ اس نے بے ساختہ ان باکس کھولا۔ آخری پیغام تک رسائی میں کچھ دیر لگی تھی۔ حروف کچھ یوں جگمگا رہے تھے۔

"اچھا بہت تنگ ہیں ناں آپ مجھ سے اب نہیں کرتی آپ کو میسج معاف کردیجیے۔"

چھ سال پرانا ایس ایم ایس پڑھتے بھولا بھٹکا آنسو موبائل کی اسکرین پر گرا تھا۔ اضطراب کے حصار میں حُرعباس نے رابطہ نمبرز نکالے وہ تا دم ''مائے جان'' کے نام سے محفوظ نمبر کو دیکھتا رہا۔

''کیا رات کے اس پہر فون کرنا مناسب ہوگا۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ جاگ رہی ہو۔ جانے میں بھی اس کی یادداشت میں محفوظ ہوں یا نہیں۔ شاید اب تک نمبر بھی بند ہوگیا ہو۔''

حُرعباس کا ذہن سوچوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس نے آہ بھر کر اپنا ارادہ ترک کیا اور کافی سالوں پہلے کھینچی گئی ایک مسکراتی تصویر کو سیل میں دیکھ کر بیقرار ہو کر رو پڑا اور بے تابی سے تصویر کو چومنے لگا۔ دل کو حوصلہ دینا بہت مشکل تھا۔

کتنے ہی پل سگریٹ پھونکتے گزر گئے تھے۔ وہ انسان جو دنیا کی نظر میں متقی، پاکباز تھا کبھی نشہ آور اشیاء کے قریب نہ گیا تھا۔ آج غم غلط کرنے کی کوشش میں تھا۔ یہاں سوائے خدا کے اسے کوئی دیکھنے والا نہ تھا اور یہ غم خود کاتب تقدیر نے جلی حروف میں اس کا نصیب کر دیا تھا۔ وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں اپنے رب سے مخاطب ہوا۔

''اے اللہ کریم میں نہیں جانتا کہ رات کے اس پہر اس کی یاد نے مجھے اتنا بے قرار کیوں کر دیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ چھوٹی سی لڑکی جو میری جان ہے وہ کس حال میں ہے لیکن میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ اسے اپنی حفاظت میں رکھنا اور ایک بار صرف ایک بار میرے نصیب میں اس کا دیدار لکھ دے۔'' وہ تڑپ رہا تھا، رات سرک رہی تھی۔

☆......☆

الارم کی کان پھاڑ آواز نے احراز بخاری کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ بستر پر نمل کو نہ پا کر وہ پریشان سا ہو گیا۔ ''نمل کہاں گئی؟'' ٹوٹی ہوئی چوڑیوں پر نظر پڑی تو منتشر سوچیں یکجا ہو گئیں۔ اسے سب یاد آ گیا اور اس یاد نے احراز کو پشیمان کر دیا۔

کتنا سنگدل ہوں میں...... خود اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کو اذیت دیتا ہوں۔ وہ یقیناً رات بھر جاگی ہو گی اس آس میں کہ میں جا کر اسے منالوں گا۔ کتنی اچھی ہے وہ کہ مجھے میرے برے رویے پر آسانی سے معاف کر دیتی ہے۔ افوہ وہ کتنا پریشان ہوگی کہ میں اسے چھوڑ دوں گا۔ بھلا میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں اسے چھوڑ کر میں کیسے جیوں گا؟'' اس نے انہی سوچوں کے دوران دروازہ کھولا تو نمل کا بے جان وجود اس کے قدموں سے ٹکرایا۔ وہ ایکدم گھبرا کر نمل کے قریب آ بیٹھا۔

''نمل...... میری جان...... کیا ہوا ہے تمہیں...... اٹھو آنکھیں کھولو...... مجھے معاف کر دو...... میں وعدہ کرتا ہوں اب تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں کروں گا...... تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں تمہیں معلوم ہے ناں کتنی محبت کرتا ہوں تمہیں...... پلیز نمل......''

''ڈاکٹر پلیز میری نمل کو بچالیں۔'' وہ گڑگڑا رہا تھا۔

''دیکھیں...... آپ حوصلہ رکھیں آپ کی مسز کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ دعا کریں وہ ٹھیک ہو جائیں خدا کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے، کچھ دیر تک ہوش آ گیا تو کم از کم زندگی خطرے سے باہر ہو گی۔ ورنہ ساری عمر کومے میں گزرے گی۔''

وحشتوں کے گھمبیر سائے احراز بخاری کے چہرے کو تاریک کر گئے۔ احراز بخاری کا جی چاہا وہ اپنا سر دیوار میں دے مارے۔

آج اگر وہ اس حال میں تھی تو اس کا ذمہ دار صرف اور صرف وہ خود تھا۔

''یا اللہ! ایک بار نمل کو اچھا کر دے۔ میں زندگی بھر اس کا خیال رکھوں گا۔ کبھی پھولوں کی چھڑی سے بھی اسے نہیں ماروں گا۔'' وہ اسپتال کے کاریڈور میں بینچ پر بیٹھا رو رو کر دعائیں مانگ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اسے اس اطلاع کے ساتھ نمل کو دیکھنے

کی اجازت ملی کہ وہ اب زندگی بھر کو بے میں رہے گی۔
وہ لٹے ہوئے مسافر کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور نمل کو اس حال میں دیکھ کر بے حال سا ہونے لگا۔ نمل کے سرسوں کے پھول جیسے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ بند آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے۔
احراز شکستگی کے عالم میں نمل کے قریب بیٹھا اور ہولے سے اس کی بند آنکھوں کو چھوا۔
"نمل......!" وہ دھیرے سے بولا۔
نمل نے ذرا سا کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔ نمل کی پتھر آنکھوں میں جینے کی کوئی آرزو نہ تھی۔
"نمل......!" احراز نے تڑپ کر ایک بار پھر اسے پکارا۔
اب کے نمل کے باہم سختی سے پیوست ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ اس کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے نام نے احراز کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ احراز اس کا ہاتھ تھام کر ہلتے ہوئے لبوں کے نزدیک ہوا۔ "حُر۔"
"کون تھا وہ؟"
"کہاں سے تعلق رکھتا تھا؟"
"کیا رشتہ تھا نمل سے؟"
ایک بات تو طے تھی کہ ایسی حواس گم حالت میں بھی اگر نمل کی زبان پر اس کا نام آیا تھا تو یقیناً اس شخص کا نمل کی زندگی میں کوئی خاص کردار رہا تھا۔
ایک تیر جو جگر کے پار ہوا تھا۔
احراز نے آہستگی سے نمل کا بازو چھوڑا۔
وہ بازو جن پر اس کے جنون کے نشان اپنی بے حسی کا ثبوت دے رہے تھے۔ وہ مزید نادم ہوا۔
اس کی سوچ میں واضح اور مثبت تبدیلی آئی تھی۔
"اگر وہ شخص حُر تمہاری زندگی ہے تو میں تمہیں تمہاری خوشیاں ضرور لوٹاؤں گا۔"
وہ عزم کے ساتھ اٹھا تھا۔
☆......☆
ایک قیامت تھی جو چپکے سے نمل بخاری کے دل پر گزر گئی۔
"اب خاموش کیوں ہو؟" حُر عباس نے چڑ کر پوچھا۔
"حُر......جو آپ کہہ رہے ہیں ایسا ممکن نہیں ہے میں کس طرح آپ کو سمجھاؤں؟" وہ لجاجت سے بولی۔
"نمل! تم میرے لیے کیا ہو، میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پلیز مجھ سے شادی کر لو۔"
"کیسے کرلوں شادی حُر؟" وہ لاچاری سے بولی۔
"دیکھو میں سب سمجھتا ہوں۔ بے وقوف نہیں ہوں میری عمر اور تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ میں اپنے مقام کو بھی جانتا ہوں کہ ایک مشہور اسکالر ہو کر مجھے معاشرے کی رو سے ایسا کرنا مناسب نہیں ہے اور تمہارے لحاظ سے مذہب میں بھی ممانعت ہے۔ تم سید ہو اور میں تمہاری ذات برادری سے تعلق نہیں رکھتا۔ بتاؤ کہ میرے دل کا کیا قصور ہے۔ اسلام میں پسند کی شادی کی اجازت ہے لیکن کسی سیدہ سے نہیں، کاش تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتیں، میں اس درد سے بے بہرہ رہتا۔ بتاؤ آخر میں کیا کروں۔ خودکشی کرلوں پھر یہ معاشرہ کیا کہے گا کہ ایک نامور اسکالر نے حرام موت کا انتخاب کیا۔ کوئی تجویز دو مجھے۔ کوئی تدبیر ہی بتلاؤ؟" وہ رو ہی تو پڑا تھا۔
خود نمل کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا۔
"میرے پاس کوئی تجویز نہیں ہے، میں کیا تدبیر دوں گی جب کہ میرے پیروں میں ماں کے اعتبار کی بیڑیاں ہیں، مجھے اپنے خدا سے بہت خوف آتا ہے کہ مجھے اس محبت کی پاداشت میں معتوب نہ کردے۔ وہ مجھ سے خفا نہ ہو جائے، ہاں میں نے زندگی میں کبھی کوئی شکوہ رب سے نہیں کیا لیکن آج کرتی ہوں کہ اگر آپ کو چاہنا ایسا ہی گناہ تھا تو کیوں ہمارے دلوں میں اس گناہ گار محبت کو پروان چڑھایا کیوں؟" وہ سسک رہی تھی۔
"حُر......آپ کو خدا کا واسطہ اپنے دل کی اس

طلب پر مذہب کی زنجیر چڑھا دیں۔ آپ میری رسائی سے دور سہی لیکن یقین کریں میری روح پر آپ کی حکومت ہے۔ میں جہاں بھی رہوں جس حال میں بھی رہوں یہ یقین رکھیے گا کہ صرف آپ کی محبت میرے سینے میں دھڑکتی ہے۔ میں آپ کے لیے بہت دعا کروں گی۔ اپنے دل کی اس ضد کو رسم و رواج کی بھینٹ چڑھائیں کیونکہ......؟“ اس نے روتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کیا...... کیونکہ؟“ وہ بھیگے لہجے میں دریافت کر رہا تھا۔

”کیونکہ میں کسی بچی سے اس کا باپ نہیں چھین سکتی اور نہ کسی اپنے جیسی لڑکی سے اس کا شوہر۔ مجھے مجبور نہ کریں، آپ کو پتا ہے ناں کہ آپ کی نمل بہت اچھی ہے۔ اچھی بہن! اچھی بیٹی...... اچھی لڑکی...... تو نمل کیسے ظالم بن جائے؟ کیسے بری بن جائے؟ کیوں کر کسی کی سیج اجاڑ دے؟“

”تم میری جان ہو نمل! چھوٹی سی جان، میری گڑیا اتنی بڑی بڑی باتیں سمجھتی ہے مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ میری نمل کو اچھا ہی رہنا ہے۔ چاہے کسی اور کی دلہن بن کر۔“

”حُر مت اس قدر دل جلانے والی بات کریں۔ نمل صرف آپ کی ہے۔“ وہ تڑپ کر بولی تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

”پتا ہے میں اس وقت بارش میں ڈرائیو کر رہا ہوں اور سنا ہے بارش میں کی گئی دعا قبول ہوتی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں اپنے کاکے کے لیے۔“ وہ خود ہی کاکا کہنے پر ہنس دیا۔

”بس کریں حُر۔“

”کیوں بس کروں بھئی۔ میں تو کہوں گا یا اللہ کریم! میری نمل کو ایسا ہمسفر دینا جو اس کو سمجھ سکے، جیسی میری نمل ہے ناں کھیلنے والی، ایسا ہی اس کا ہمسفر ہو۔“

”پلیز حُر! میں نے مانا کہ آپ ایسی دعا ہو جس پر مذہب کے پہرے ہیں لیکن مجھے کسی ”اور“ کی بددعا تو نہ دیں۔“

”کیوں میرے ساتھ رہنا ہے کیا؟“ اس کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی۔

”ہاں۔“ نمل کی آنکھیں اور آواز بھرا گئی۔

تو وہ سرد آہ کھینچ کر بولا۔ ”کاش...... ایسا ہوتا...... لیکن میری گڑیا فکر نہ کرے، میں اپنی گڑیا کو انفال سے زیادہ پیار کروں گا۔“

”جھوٹ۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔

”نہیں جانو...... سفید سچ......!“ حُر ہنس دیا۔

یہ حُر عباس ہی تھا جو اس کے نخرے اٹھاتا تھا لاڈ کرتا تھا۔

”اچھا! اب ایسا ہے کہ آپ انفال کو منا لائیں۔“ نمل بولی۔

”سوچیں گے۔ فی الوقت میری منزل آگئی ہے۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔“

حُر عباس کتنی ہی دیر یونہی ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا، وہ نمل کا میسج پڑھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”حُر عباس! ٹھیک ایک ہفتے بعد میری شادی ہے میں آپ کو تنہا نہیں دیکھ سکتی پلیز آپ اپنی مسز کو منا لائیں۔ آپ کی بیٹی کو باپ کی ضرورت ہے، کیا آپ اسے باپ کے پیار سے محروم کر دیں گے۔ آپ خود سمجھدار ہیں میری خاطر آپ اپنی زندگی کو ڈسٹرب نہ کریں، مجھے بھول جائیں اگرچہ یہ آسان نہیں ہوگا، کم از کم میرے لیے لیکن سمجھوتا تو کرنا پڑے گا ناں۔“ حُر عباس جو اس وقت کسی جگہ علماء کی کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہا تھا اس دردناک اطلاع کو پڑھ کر ٹوٹ سا گیا۔ دنیا جسے شیخ الاسلام حُر عباس کے نام سے جانتی تھی وہ ایک چھوٹی کم عمر لڑکی کے پیار میں اس کے سامنے بچہ بن جاتا تھا۔ اس کی خاطر کئی اہم کانفرنس اور محفلیں چھوڑ کر اپنے وقت کا خیال کیے بغیر ڈھیروں مصروفیات کو

پسِ پشت ڈال کر اس سے ملنے اکثر گھر چلا جاتا تھا۔ وہ لاہور کا باسی تھا لیکن اس کی یاد کی شدت سے گھبرا کر فیصل آباد چلا جاتا۔ وہ نمل کے بھائی کا دوست تھا یہ دوستی وقت کے ساتھ اتنی گہری ہوئی کہ اسے اندرونِ خانہ جانے کی اجازت بھی مل گئی۔

حُر عباس اور نمل غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ نمل بہت چھوٹی تھی جب کہ حُر عباس شادی شدہ اور ایک سالہ بیٹی کا باپ تھا۔ یہ باتیں ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ حُر عباس کا اپنی بیوی سے پہلے ہی تصادم تھا۔ دونوں کے مزاج میں کافی فرق تھا۔ انفال نسبتاً تیز مزاج آزاد خیال تھی جب کہ حُر کے نزدیک چونکہ وہ ایک نامور مذہبی شخصیت تھا تو اس کی بیوی کے خیالات بھی مذہبی ہونے چاہئیں۔ مزاج کے اسی فرق نے ان کے درمیان دوری پیدا کردی تھی۔ انفال قطعی اس کے والدین کی پسند تھی جسے نبھانے کے لیے وہ مجبور ہو گیا تھا۔ اس مجبوری میں اضافہ بیٹی کی پیدائش نے کردیا، تاہم حُر کی بیوی معمولی سی بات کو بنیاد بنا کر میکے جا بیٹھی تھی جب کہ عمر کے اس حصے میں حُر عباس نمل سے پیار کر بیٹھا تھا۔

حُر عباس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر نمل کا نمبر ڈائل کیا، وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ حُر نے کار ایک طرف روک کر پیغام لکھا۔

”میں آخری بار کال کر رہا ہوں، فون ریسیو کرو۔“

پیغام کے بعد اس نے دوبارہ کال کی تو نمل نے کال ریسیو کرلی۔

”السلام علیکم!“ نمل نے خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام......!“ حُر عباس نے جلدی میں سلام کا آدھا جواب دیا اور بے تابی سے متنفر ہوا۔

”گڑیا! کیا مذاق کر رہی ہو میرے ساتھ اگر یہ مذاق ہے تو بہت سنگین مذاق ہے۔ میں اس وقت کسی کانفرنس میں جا رہا ہوں اور تم نے مجھے پریشان کردیا۔“

”یہ سچ ہے حُر۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”یوں اچانک کیسے، ابھی دو ماہ قبل میری تم سے بات ہوئی تب تو ایسا کوئی ذکر نہ تھا اور اب میں کیسے مان لوں؟“

”بس اچانک ہی سب کچھ بدل گیا۔ اچانک ہی ماما کی ڈیتھ ہوگئی اور......“

”کیا؟“ وہ حیرت کی زیادتی سے چلا اٹھا۔

”ماما کی ڈیتھ ہوگئی اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔ نوفل نے مجھ کو اتنا غیر کردیا کہ بتانا ضروری نہ سمجھا۔“ وہ نمل کی والدہ کو ماما ہی کہا کرتا تھا۔

”مجھے اپنا ہوش کہاں تھا، نوفل بھائی نے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا آپ پاکستان سے باہر ہیں۔“

”پھر بھی آپ نے زیادتی کی ہے نمل! بعد میں ہی بتا دیتے مانا کہ کچھ عرصے سے میں بہت زیادہ مصروف رہا ہوں لیکن مجھے یہ بتاؤ کیا پہلے میں تمہارے پکارنے پر ہر کام چھوڑ کر نہیں آتا تھا۔ میں ضرور نوفل سے بات کروں گا۔“ وہ صدمے کی کیفیت کے زیر اثر تھا۔

”آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے کیونکہ......“

”کیونکہ......؟“ حُر نے پوچھا۔

”کیونکہ یہ میں کہہ رہی ہوں۔ ماما کی ڈیتھ کے بعد نوفل بھائی نے میرے تعلیم کے حصول کی خواہش کو نظر انداز کر کے مجھے خاندان میں احراز بخاری کے نام سے منسوب کر ڈالا ہے اور جلد وہ اپنا فرض ادا کردیں گے۔ حُر یہ کہنا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے کہ ہم بچھڑ رہے ہیں۔ وہ شخص جسے میرا ہم سفر بنایا جا رہا ہے وہ تنگ ذہنیت کا مالک ہے لیکن مجبوری ہے نوفل بھائی کی کہ وہ خاندان کا آخری لڑکا بچا ہے اگر اس سے میری شادی نہ ہو سکی تو خالص سادات میں باہر رشتہ ڈھونڈنا ان کے لیے دشوار امر ہوگا۔ میں نے

اپنی خاموش اور معصوم محبت کو بھائی کی عزت، خاندان کی غیرت، معاشرے کے چلن، انفال کے شوہر، بیٹی کے باپ اور مذہب کے نام پر قربان کر دیا ہے۔ آپ بھی میری خاطر انفال کو واپس لے آئیں اور اس یقین کے ساتھ جئیں کہ آپ کی تمل زندگی کی آخری سانس تک آپ کی محبت کو چھپائے دور کہیں سانس لیتی رہے گی۔ صدیوں بعد بھی خواہ وقت کی گرد اس تعلق کو دھندلا دے لیکن یہ تعلق کبھی موت کا شکار نہیں ہوگا۔ آپ کو میری قسم ہے حُر، اگر نوفل بھائی آپ کو مدعو بھی کریں تو میری شادی پر نہ آئیے گا۔'' دونوں کی آنکھیں برس رہی تھیں۔

''تم نے ہمیشہ مجھ سے ٹافیوں کی فرمائش کی اور میری یہ حسرت رہی کہ تم مجھ سے کچھ اور مانگو اور آج تم نے جدائی مانگ لی۔ کاش میرا دل مانگا ہوتا، جو تمہیں اپنی بے چارگی کے قصے سنا سنا کر آخر یقین دلا سکتا کہ تم دنیا کے کسی گوشے میں بھی رہو، صرف اپنے حُر کی گڑیا ہو اور حُر جو دنیا کے لیے شیخ الاسلام حُر عباس ہے وہ تمہارے لیے صرف تمہارا عابی ہے۔ کاش میں اتنی ہمت رکھتا کہ اپنی ننھی سی گڑیا جان کو دلہن بنے دیکھ سکتا لیکن نہ تو تمہارا حُر اتنا مضبوط ہے اور نہ حُر اپنی گڑیا کو ٹوٹتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔ حُر نہیں چاہتا کہ حُر کی گڑیا اسے دیکھ کر اپنا ضبط کھو دے۔ حُر اپنی گڑیا کی ہر فرمائش پوری کرتا ہے تو کیسے ممکن ہے اپنی گڑیا کی اس فرمائش کو رد کر دے۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر اس نے لائن منقطع کر دی تھی۔ دل کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ اس نے ٹشو پیپر سے چہرے کو صاف کرتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی۔

کوئی نسخہ تو ہوگا ناں؟
کوئی تعویذ بھی ہوگا؟
کوئی ترکیب تو ہوگی؟
کوئی تجویز ہی دے دو؟
ارے اب کچھ تو بتلاؤ؟
اگر تم نے کہا ہے
میں اب بھول جاؤں تم کو
میری جاں بھول جاؤں گا
مگر کیسے یہ بتلا دو؟

☆......☆

کئی مہینوں کی تلاش کے بعد اسے حُر عباس کا سراغ مل ہی گیا تھا اور یہ پتا اتنی آسانی سے کہاں ملا تھا۔ بہر حال یہ جان کر اسے شدید حیرت ہوئی تھی کہ حُر عباس کوئی اور نہیں اس کا پسندیدہ اسکالر تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ ایک دن کسی چینل پر شیخ الاسلام حُر عباس کا مذہبی پروگرام چل رہا تھا اور اسکرین پر ان کا نمبر بھی آ رہا تھا۔

نہ جانے کیوں اسے شبہ ہوا کہ یہ وہی حُر عباس ہے جسے تمل نے ایک بار پکارا اور دوبارہ کومے میں چلی گئی۔

احراز بخاری نے اس کا نمبر اپنے سیل میں نوٹ کر لیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ تمل کی ذاتی الماری کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ تمل کی الماری میں ایک چھوٹی سی ڈائری پڑی ہوئی تھی۔ احراز نے کھول کر دیکھا۔ ساری ڈائری کسی بھی تحریر سے مبرا تھی لیکن آخری صفحے پر حُر عباس کا نام اور فون نمبر درج تھا۔ احراز بخاری کا دل ڈوب سا گیا۔ یہ وہی نمبر تھا جو اس نے مذہبی شو سے نوٹ کیا تھا۔

وہ ہارے ہوئے جواری کی مانند صوفے پر جا بیٹھا اور حُر کا نمبر ڈائل کیا۔

کافی دیر کوشش کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' نہایت شائستگی سے جواب دیا گیا تھا۔ احراز بخاری کا دل ڈوب کر ابھرا۔ یہ صدفی صد تمل کا حر ہی تو تھا۔ کچھ لمحے خاموشی چھائی رہی تو دوسری طرف سے دریافت کیا گیا۔

''جی کون؟ کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہے آپ کو۔ آپ بولیے میں سن رہا ہوں لیکن ذرا جلدی میں ہوں

بات اختصار سے کیجیے گا۔'' احراز بخاری کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بولے۔ وہ بے معنی سوال کر بیٹھا۔

''آپ حُرعباس ہیں ناں؟''

''جی ہاں...... خاکسار حُرعباس ہی بات کر رہا ہوں۔ آپ بولیے۔'' اس کا لہجہ عجز و انکسار سے لبریز تھا۔

''میرا نام احراز بخاری ہے۔ میرا مسئلہ عام مسائل سے ہٹ کر ہے۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' وہ جذبات پر قابو پا کر بولا۔

''جی فرمائیں شاہ صاحب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا کسی سید زادی کا نکاح غیر قریشی میں ہو سکتا ہے؟ اور اگر ہو سکتا ہے تو اس کی صورت کیا ہے؟''

''ہوں۔'' معلوم نہیں کیوں احراز بخاری کو محسوس ہوا اس ہوں میں اَن دیکھے کرب کی داستان چھپی ہے۔

''کیا میں نے کوئی مشکل سوال کر دیا۔''

نہ جانے کیوں احراز بخاری کے لہجے میں غیر محسوس تلخی اُمڈ آئی۔

''نہیں شاہ صاحب! کسی اسکالر کے لیے کوئی بھی مذہبی سوال مشکل نہیں ہو سکتا، میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پاک کے متعلق کوئی حرف زبان سے ایسا نہ نکل جائے جو ان کے شایانِ شان نہ ہو۔'' حُرعباس کا لہجہ انتہائی عقیدت مندانہ اور سادہ تھا۔ احراز بخاری نادم سا ہو گیا۔

''اس کی ایک ہی صورت ہے کہ اگر غیر سید نسب کے اعتبار سے معتبر ہے، کوئی ایسا پیشہ اختیار نہیں کرتا کہ جو معاشرے میں ذلیل سمجھا جاتا ہو، شریعت پر کاربند ہو اور عالم دین ہو تو جائز ہے مزید برآں ایسا شخص جس کو نفس پر قابو ہو اور وہ سید زادی کا ہر ممکن احترام کرے، تقدس پامال نہ ہونے دے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائے کوئی ایسی بات نہ کرے جو ان کو ناگوار گزرے تو ایسا شخص ان سے نکاح کر سکتا ہے۔ (بحوالہ: بہارِ شریعت)

''آپ کا بہت شکریہ مولانا صاحب کہ آپ نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی اور اپنے قیمتی وقت میں سے مجھے چند لمحات دیے۔'' احراز بخاری نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''اگر میں کسی سید زادے کے کام آسکوں تو یہ میرے لیے سعادت کی بات ہے۔''

''جزاک اللہ۔''

اب اس کے ذہن میں خیالات کی یلغار تھی۔

''تو کیا اب تک ہم اندھیروں میں ڈوبے ہر ممکن حد تک اس مسئلے کو سمجھ نہ پائے۔

☆......☆

''میرے کچھ خواب ہیں عالی۔''

''خواب نہیں دیکھا کرتے گڑیا۔ خواب تو ٹوٹ جاتے ہیں۔''

''میں جانتی ہوں لیکن یہ تو چھوٹے چھوٹے معصوم خواب ہیں جن کو پورا کرنا ہمارے اختیار میں ہے۔ البتہ وہ خواب جو قد سے اونچے ہوں وہ ٹوٹ جاتے ہیں۔''

''ہماری گڑیا! سمجھدار ہو گئی ہے اچھا بولو کیا خواب ہیں۔ عالی ان کو ضرور پورا کرے گا۔''

''میری باتوں پر آپ ہنس دیں گے۔ مذاق اڑائیں گے میرا۔ میں نہیں بتاؤں گی ویسے بھی آپ سلیبرٹی ہیں۔ برا بھی مان سکتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ گڑیا نے مجھے اپنا سمجھا ہی نہیں ہے۔ نمل میں تو خدا کے بندوں میں سے ایک عام سا بندہ ہوں اگر لوگ میرے علم کی وجہ سے مجھے جانتے اور عزت کرتے ہیں تو اس میں میرا کیا کمال ہے۔ یہ سب تو اللہ کی عطا ہے۔ اس کا فضل ہے جسے چاہے نواز دے اس پر تکبر کیسا وہ جب چاہے کسی خطا کی پاداش میں مجھ سے یہ شہرت واپس بھی لے سکتا

ہے۔ بس تم میری ثابت قدمی کی دعا کیا کرو کہ وہ مجھے اپنی بارگاہ میں مقبول رکھے۔ یہ دنیاوی مقبولیت تو فانی ہے اور پھر تمہارا عابی ہوں۔ پھر تمہارا مذاق کیوں اڑاؤں گا۔"

"تو پھر سنیں۔"

"تو پھر سنائیں ہم ہمہ تن گوش ہیں۔ وہ لطافت سے بولا۔

"میرا خواب ہے ہم مل کر آنکھ مچولی کھیلیں، کھٹی املی پر چورن چھڑک کر مزے سے کھائیں۔ بیت بازی کا مقابلہ کریں اور دسمبر کی نیم گرم دھوپ میں "لڈو" کھیلیں اور......اور......" حُر عباس کے لبوں پر مسکان در آئی۔ وہ اپنی گڑیا کے معصوم خوابوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"ایک دوسرے کو سرہانوں سے مارتے ہوئے جھوٹ موٹ کی لڑائی کریں۔ کسی شام سمندر کے کنارے دور تک چلتے چلے جائیں اور مل کر ایک استغاثہ نبی پاک کی بارگاہ میں پیش کریں۔ اللہ کے حضور عرض کریں کہ......" نمل کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔

"تاجدارِ حرم ہو نگاہِ کرم۔" حُر عباس کا دل پسیج گیا۔

"دیکھو شیر بہادر بنتے ہیں۔ بزدلوں کی طرح روتے نہیں ہیں۔ میرا ابھی ایک خواب ہے کہ تمہارے گالوں کو زور سے کھینچوں اور پھر زبردست سی گٹ لگاؤں......ہاہاہا......" حُر عباس نے اسے خوش کرنے کی خاطر بات کو مذاق میں ٹال دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے آپ اپنا خواب پورا کر لیجیے گا۔" وہ معصومیت سے بولی۔ تو حُر کو اس پر والہانہ پیار آیا۔

"ارے میرے ہاتھ نہ ٹوٹ جائیں اگر تمہیں گٹ لگاؤں۔"

"اللہ نہ کرے۔ کیسی باتیں کرتے ہیں عابی۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔"

"مجھے......اور میری گڑیا کو بھی۔"

"حُر۔" انفال نے پریشان ہو کر کمرے کی لائٹ آن کی اور آنکھوں پر بازو رکھے بیڈ پر دراز حُر کو آواز دی۔

"جانِ عابی۔" حُر عباس نے نم آنکھوں سے انفال کو دیکھا اور تاسف سے دل مسوس کر رہ گیا۔

انفال گڑبڑا سی گئی۔ شادی کے اتنے سالوں میں آج پہلی بار حُر نے اسے جان کہا تھا۔ وہ کیا سمجھتی کہ حُر عباس کو اس پر نمل کا گمان گزرا تھا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" وہ فکر مندسی تھی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" وہ انفال کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

"مگر......!"

"اگر......مگر کچھ نہیں پلیز تم یہاں سے جاؤ۔" اس نے چڑ کر کمبل تان لیا تو انفال اس پر دکھ بھری نظر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"تاجدارِ حرم ہو نگاہِ کرم؟" حُر عباس نے سسک کر فریاد کی۔

تمہیں اِک لفظ بولا ہو؟
کوئی دکھڑا سنایا ہو؟
تمہیں رکنے کا بولا ہو؟
کوئی تفصیل مانگی ہو؟
اگر ایسا نہیں کچھ بھی
تو پھر تم بضد کیوں ہو
کہ تمہیں میں بھول
ہی جاؤں
تمہیں جانا ہے نا؟
تو جاؤ

☆......☆

"جناب میں احراز بخاری بات کر رہا ہوں۔ آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔"

حُر عباس جامعہ زین العابدین کے کشادہ اور حسین لان میں تنہا بیٹھا مذہبی مسائل کی ضخیم کتابوں کا مطالعہ

کر رہا تھا۔ جب احراز کی کال آئی۔
"جی فرمائیے۔" وہ ادب سے بولا۔
"میں بات کو گھما پھرا کر کرنے کی بجائے صاف سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کسی نمل نامی لڑکی کو جانتے ہیں۔
دھک......دھک......دھک...... حُر عباس کے دل کی دھڑکنوں میں بے ترتیب روانی آ گئی۔ اس نے وحشت سے گود میں دھری کتاب کو ٹیبل پر رکھا۔ کئی لمحوں بعد وہ بولنے کے "قابل" ہوا۔
"جی......لیکن آپ کا نمل سے کیا تعلق ہے؟"
احراز بخاری نے تنتے ہوئے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔
"میں نمل کا جو بھی ہوں لیکن یہی سوال میں آپ سے کرتا ہوں کہ اس کا آپ سے کیا رشتہ ہے؟"
"آپ یہ سب کیوں جاننا چاہ رہے ہیں؟" وہ مضطرب ہو کر لان میں ٹہلنے لگا۔
"یہ بے معنی سوال ہوگا۔ بس اتنا جان لیں کہ نمل زندگی موت کے درمیان پس رہی ہے اور اس حالت میں بھی ایک بار آپ کا نام لے کر دوبارہ کومے میں جا چکی ہے اگر آپ دونوں کی محبت اتنی شدید تھی تو پھر کیوں چھوڑ دیا آپ نے اسے۔ کیوں پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی اور آخر میں یہ عرض کر دوں کہ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور نمل سے محبت بھی میں آپ دونوں کا خیر خواہ ہوں۔ اس کے متعلق پریشان نہ ہوئیے گا لیکن میری درخواست ہے کہ ایک بار نمل کو دیکھ لیں۔ شاید آپ سے مل کر وہ جینے پر آمادہ ہو جائے۔ میں آپ کو ایڈریس ایس ایم ایس کر دوں گا۔" یہ کہہ کر احراز نے کال ڈراپ کر دی۔
دل کے ہزار ٹکڑوں کے درمیان حُر عباس سر تھامے کھڑا تھا۔ اسے دھڑکنوں کی چیخیں ضبط کرنا محال امر لگ رہا تھا۔ کیسے ان چیخوں کا گلا گھونٹوں؟ کاش نمل کی اس حالت کے بارے میں جاننے سے پہلے قوت سماعت سے محروم کر دیا جاتا۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھے دل کے ٹکڑوں کے پھڑکنے کا تماشا بے چارگی سے دیکھ رہا تھا۔

تمہاری یاد ہو، کچھ بھی ہو
تم آزاد ہو جاؤ
تمہیں اس سے نہیں مطلب
غلط فہمی تھی کہ الفت
یہ میرا درد سر ہے درد دل ہے
جو بھی ہے جاؤ
تمہارا کام تھا تم نے
محبت کی بہت اچھے
یہ میرا کام ہے
میں یاد رکھوں
یا بھلا ڈالوں
عجب باتیں ہیں دنیا کی
عجب رسمیں ہیں الفت کی
محبت کر تو لیتے ہیں
نبھانا بھول جاتے ہیں
کسی دن چھوڑ جائیں گے
بتانا بھول جاتے ہیں

حُر عباس کو دسمبر کی نیم گرم دھوپ بھی کڑی لگ رہی تھی۔ زمین و آسمان گویا چکرا رہے تھے، اسے لگا جامعہ زین العابدین کی پرشکوہ و شاندار عمارت کے ملبے تلے وہ دفن ہو جائے گا۔ کسی لمحے سانس گم ہو جائے گا وہ اپنا لرزتا ہوا ہاتھ دل پر رکھے پوری طاقت سے گویا چلانا چاہتا تھا لیکن وہ معاشرے کے خوف سے ایسا نہ کر سکا، محض مضطرب سا دل کو تھپکیاں دے کر چپ کروانے کی کوشش میں نڈھال ہو گیا تھا۔
"عابی کی جان۔"
بے بسی کے آنسو ضبط کی باڑھ کو توڑ کر شہد آگیں آنکھوں سے نکل کر سیاہ پلکوں پر چمک رہے تھے۔
☆......☆

اپنی تمامتر مصروفیات کو پس پشت ڈال کر وہ احراز کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچنے کے لیے راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ یہ سفر بے حد ذہنی اذیت کا باعث تھا۔ وہ اپنے اندر نمل کو دیکھنے کی ہمت پیدا کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ آج وہ نمل کی قسم کو توڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیسے بتاتا احراز بخاری کو کہ یہ ہجر نمل کی فرمائش کا نتیجہ تھا۔ ورنہ وہ نمل سے دور جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''تو گویا نمل گڑیا کو اپنا عابی یاد ہے۔''

''جو خبر دی وہ مذاق ہے یا اس میں کوئی حقیقت ہے۔ آپ کا نمل سے کیا رشتہ ہے اور نمل ادھر تک کیوں پہنچی۔ آپ کو ہمارے اس تعلق کا علم کیوں کر ہوا ہے میں نہیں جانتا۔ میں تو محض اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے نمل سے اپنے تعلق کی شدت کو محسوس کر کے آپ پر یقین کے اندھے دریا میں ماضی کی کشتی کو بے چینی کے پتوار سے چلا کر آپ کے بتائے گئے مکان تک پہنچ چکا ہوں۔''

''آپ سے ملاقات کے شرف کی خواہش بہت دیر سے تھی لیکن یہ خواہش تقدیر نے عجیب دوراہے پر پوری کی کہ ذہن کچھ بھی محسوس کرنے سے قاصر ہے۔ آپ خدا پر بھروسا کر کے مجھ پر اندھے یقین کے دریا میں ماضی کی کشتی کو بے چینی کے پتوار سے چلا کر آئے ہیں تو یقین کریں کہ آپ کا بھروسہ رائیگاں نہیں ہے۔ خدا آپ کو مایوس نہیں کرے گا اور میری بابت سمیت آپ کو تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ میں آرہا ہوں۔''

وہ جلد ہی اس آشیانے میں ایک خوبرو شخص کے سامنے تھا۔ احراز بخاری نہایت گرمجوشی سے اسے ملا اور ایک کمرے کے سامنے رک کر بولا۔ ''یہ کمرا آپ کی عارضی منزل ہے۔ آج آپ نمل کے مہمان ہیں اور مستقل مہمان بن سکتے ہیں اگر...... خیر آپ جائیے۔ جب خوب تسلی ہو جائے تو مجھے کال کر دیجیے گا میں آجاؤں گا۔ میں فی الحال دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے جا رہا ہوں کیونکہ میں محبت کے درمیان مخل ہونے کو گناہ سمجھتا ہوں۔''

احراز بخاری ضبط کی حدوں اور غیرت میں ایثار کی بلندیوں کو چھو آیا تھا۔ ہاں غیرت میں ایثار ورنہ ہر شوہر کے لیے یہ ناقابل برداشت بات ہے کہ اس کی بیوی اپنے دل میں بسنے والے نامحرم سے اسی کے مکان میں ملے لیکن وہ نمل کو دیکھ کر احساس جرم کا شکار ہوتا تھا۔ اتنا بڑا فیصلہ اس نے نمل کی بیماری کو دیکھ کر کیا تھا۔ وہ جانتا تھا اگرچہ نمل کے ظاہری وجود پر سکتے کی برف پڑی ہے لیکن باطنی طور پر کسی کی یاد کی حرارت اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ضرورت محض اس زندگی کو تلاشنے کی تھی۔ فی الوقت نمل، احراز کی بربریت کا جیتا جاگتا لیکن موت سے بدتر نشان تھی جس کی بنجر عمارت کی پیشانی پر مٹا مٹا سا کندہ حرف ''محبت'' ہجر کے ماروں کی بے بسی کو ظاہر کرتا ہوا اعلان کرتا تھا کہ پیار ایسا آنگن ہے جس میں وصل کا سرخ بستر نہیں بچھ سکتا۔ دیکھو چشم عبرت سے کہ پیار تو وہ محل ہے جس میں ویرانیوں اور وحشتوں کا ڈیرا ہے۔ جہاں تنہائی کے جھینگر باریک آوازوں میں چیخ کر جدائی کا پتا دیتے ہیں۔ کانٹوں کے بستر پر جو بے آرام دل کا بسیرا ہے اور بے آرام دل پر جاں گسل خاموشی کا پہرہ ہے۔ وہ دل کہ جس کی صورت جدائی کے واہمے سے زرد ہے رگوں کا خون نچڑا ہے۔ قطرہ قطرہ زندگی پگھل رہی ہے۔ کرب کے الاؤ میں۔

احراز بخاری گریہ سے لال آنکھوں کو بے دردی سے رگڑ کر چلا گیا۔ حُر عباس جذبات سے بھرپور احساسات سمیت اس کمرے میں داخل ہوا اور بستر پر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر جامد پڑی اپنی نمل گڑیا کو دیکھ کر گویا پتھر کا ہو گیا۔

وہ قدم اٹھانے کی کوشش کرتا تو جیسے زمین پیروں کو جکڑ لیتی۔ دل جو کرب کے الاؤ میں جل رہا تھا۔ اوس

کا کڑوا دھواں اس قدر پھیلا کہ دھڑکنیں کھانسنے پر مجبور ہو گئیں اور آنکھوں کی جلن نمکین پانیوں کی صورت بہنے لگی۔ وہ بھاری ہوتے قدموں کی زنجیر تڑواتے ہوئے دیوانہ وار بھاگا۔ وہ مسلسل خدا سے معافی مانگ کر بے دم تمل بخاری کو بانہوں میں لیتے ہوئے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"دیکھو تمل...... میری جان...... میری گڑیا...... یہ میں ہوں تمہارا عابی۔ مدت سے پیاسی بانہوں کو مزید پیاسا نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ گناہ ہی مگر مجھے معاف کر دو۔ یا اللہ کریم! اس گناہ کی معافی دے دے یا گناہ گار محبت کی جڑ کو اکھیڑ دے یا پھر صبر دے۔" وہ اسے خود میں شدت سے سموئے مچل مچل کر رو رہا تھا۔

"میں نے تمہاری قسم توڑ دی گڑیا! اس قسم کی حد بندی نے تمہیں بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ایک بار تو عابی کو دیکھو تمہارا عابی کتنا پریشان حال ہے۔"

محبت کی حرارت نے تمل بخاری کو ویران آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہاں زندگی نے حُر عباس کی خاطر مہربانی کی تھی۔ مہینوں کا سکتہ لمحوں میں تڑخ کر ٹوٹا تھا۔

شاید یہ صبر کا چھوٹا سا انعام تھا۔ سالوں کے صبر کا انعام۔

"عابی۔" تمل بخاری نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور حُر کے سینے میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

"چند لمحے کوئی سوال نہ کرو میری جان! بس پہلی اور آخری بار مجھے ان لمحوں کو جینے کا حاصل کر لینے دو۔ یادوں کے خزانے میں اضافہ کرنے دو۔ انمول...... یادگار اضافہ، گناہ ہے یا ثواب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ معاشرہ، حد بندی، ان سب کو رہنے دو۔ اپنے عابی کی شکستگی دیکھو۔ تشنگی دیکھو اپنے حال پر رحم کرو۔ تم مجھے دیکھو میں تمہیں دیکھوں۔" اس کے لہجے میں انتہائی فریاد تھی۔

"یہ کیا حال کر لیا تم نے اپنا اگر میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں تو کیوں رابطے توڑنے کی قسم ڈال دی۔ مجھے بتاؤ گڑیا یہ نشان کیسے ہیں؟"

حُر عباس نے تمل کے بازوؤں اور گردن پر جا بجا نشانات کے متعلق دریافت کیا۔ تو تمل نے ہونٹوں کو دانتوں تلے اتنے زور سے دبایا کہ خون اُمڈ آیا۔

حُر نے تڑپ کر اس خون کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔

"تم آج بھی اتنی ہی پاگل ہو بولو کیا ہوا؟"

"کیا جاننا چاہتے ہیں آپ کہ آپ کے ہجر میں مجھے کتنے زخم لگے، میں نے یہ عرصہ کیسے گزارا اور یہ کہ میرے لیے اچھے ہم سفر کی دعا مستجاب ہوئی یا نہیں تو یہ نشان عابی کی گڑیا کے ہم سفر کی عطا کی گئی نوازشیں ہیں۔ سنا آپ نے یہ ہجر کے زخم ہیں۔ جو اذیتوں کے پانی سے ناسور کی طرح بھرے پڑے ہیں۔ قطرہ قطرہ رستے ہیں۔ یہ دل بھی ناسور ہے جس کو باقی ماندہ عمر رستے ہی رہنا ہے عابی کی محبت کا ناسور۔"

حُر عباس کانپ گیا۔

ایسا ہی ایک ناسور خود اس کے سینے میں بہتا رہتا تھا۔ جس کی بے بسی کا مواد نہ اس تعصب پسند معاشرے کو نظر آتا تھا نہ اسے کسی کو صاف کرنا تھا۔ شاید اس ناسور کو تب بھی رستے ہی رہنا تھا جب ان کے وجود میں سے روح کھینچ لی جاتی اور وہ قبر میں پڑے ہوتے یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جاتی۔ پھر بے تابیوں کے قصے تھے۔ کس نے کس حال میں کس موڑ پر کس طرح ضبط کیا تھا۔ ساری داستانیں مدت سے گونگی محبت کی زبانیں بیان کرنے لگیں۔ اس انکشاف نے حُر عباس کو ہلا کر رکھ دیا کہ احراز بخاری، تمل کا ہم سفر تھا اور تمل یہ جان کر ششدر رہ گئی کہ احراز بخاری کی کھوج کے نتیجے میں آج وہ دونوں روبرو تھے۔ اسے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ احراز بخاری ستم گر ہے یا چارہ گر۔

یا پھر یہ تقدیر کا کوئی الٹ پھیر ہے؟

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



لیکن ایک بات ضرور تھی کہ حُر عباس کی ایک دعا قبول ہوگئی تھی۔ ہاں دیدار کی دعا۔

وہ اپنی گھٹن سے زیادہ نمل کی بے حالیوں پر کڑھ رہا تھا۔

"نمل اگر زندگی آج ہمیں موقع دے ایک ہونے کا تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟"

نمل نے اپنی بے قراریوں پر بند باندھنے کی کوشش کی۔

"میں کیسے ایک بیٹی سے اس کا باپ چھین لوں، میں کسی کا گھر برباد کر کے خوش نہیں رہ سکتی میں آپ کی اچھی نمل گڑیا ہوں ناں۔ میرا جواب آج بھی وہی ہے۔"

حُر عباس کے دل پر نمل کے لہجے کی مردہ ویرانیاں اور چہرے کی زردیاں ضربیں لگا رہی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کی خاطر سب چھوڑنے کو تیار تھا اگر وہ مان جاتی۔

وصل کے یہ مختصر لمحے گھڑیوں کی صورت اڑے تھے اور غیرت کو محبت کے قبرستان میں دفن کرنے والا انا پرست شہ زور مرد احراز بخاری دروازے پر دستک دے کر آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

حُر عباس، نمل کے قریب سے اٹھ کر پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ نڈھال تھے۔

"آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے نمل کو زندگی بخش دی۔ آپ کا وجود گویا دم عیسیٰ ثابت ہوا اور نمل ٹھیک ہو گئی۔ ہاں محبت ایسا ہی اپنے وجود میں کرشمہ ہے۔ معجزہ ہے۔ مہینوں جسے میری دیکھ بھال نے تندرست نہ کیا وہ چند گھنٹوں میں شفا پا گئی۔ میں احراز بخاری آج آپ کو اپنی زندگیوں کا اختیار دیتا ہوں۔ اگرچہ غیرت کے لحاظ سے یہ فیصلہ آسان نہیں ہے لیکن مذہب کی رو سے بڑی حد تک درست ہے۔ غیرت کا کیا ہے یہ تو بل کھاتے سانپ کی طرح معمولی باتوں پر بھی پھنکارتی ہے اور غیرت مذہب سے بڑھ کر نہیں ہے۔ وہ مذہب جو پسندیدہ عورتوں سے نکاح کا اختیار کسی پابندی کے بغیر دیتا ہے۔ ہاں مذہب اسلام اور محبت کا مذہب تو صرف "محبت ہے" غیرت نہیں۔

کیوں صاحب یہ آپ نے ہی کہا تھا ناں کہ غیر قریشی اگر شریعت پر کاربند اور نفس پر قابو رکھتا ہو تو وہ سید شیرزادی کا کفو ہے؟ میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا یہ درست ہے۔ تو بات صرف اتنی ہے کہ میں نمل کو محبت کی خاطر چھوڑ دوں گا۔ آپ نمل کو اپنے عقد میں لے لیجیے گا۔ میں محبت کی بددعا نہیں لے سکتا۔ میری زندگی تو آل ریڈی عذاب ہے۔"

وہ دونوں اپنی جگہ لرز گئے تھے۔

اس عجیب فیصلے پر محبت کی روح بھی حیران تھی اور یہی ایک پل تھا فیصلہ کرنے کا۔ نمل بخاری تمام تر ہمتوں کو یکجا کر کے بولی۔

"احراز میں نہیں جانتی کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں لیکن حُر عباس میرا ماضی ہیں۔ میرا حال آپ ہیں اور مستقبل بھی آپ سے منسوب ہے۔ کیونکہ مشرقی عورت کا نام ایک بار جس کے مقدر کے ساتھ جڑ جائے اس کے مقدر سے ہی جڑے رہنا پڑتا ہے۔ حُر عباس شادی شدہ اور بیٹی کے باپ ہیں۔ ان کی بیوی اور معصوم بیٹی کا کیا قصور ہے کہ میں ان کو اپنی محبت کی سزا دوں؟ میں ظالم نہیں ہوں احراز جو کسی کی خوشیوں کے مقبرے پر اپنے ظلم کی بنیاد رکھوں۔ جتنا روگ ہم نے بھوگنا تھا، بھوگ چکے کسی بے گناہ کو آخر اس ہجر کی محرومیوں کی وعید کیوں سنائیں۔ محبت تو نوید ہے خوش نصیبوں کے لیے۔ خوش نصیبوں کی لکیروں سے حسد کرنے کا ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔"

"مجھے زیادہ سبق پڑھانے کی کوشش مت کرو، محبت انسان کا محض ماضی نہیں ہوتی بلکہ محبت حال بھی ہے اور مستقبل بھی۔ یہ زمانوں سے مشروط نہیں ہے۔ تم آج بھی جھوٹ بول رہی ہو نمل۔ تمہاری زبان آج بھی لڑکھڑا رہی ہے اگر حُر تمہارا ماضی تھے تو کیوں کومہ کی نیم بے ہوشی میں بھی ان کا نام تمہاری زبان سے ادا ہوا اور اگر محبت صرف ماضی ہوتی تو آج حُر صاحب

تمہارے سامنے بیٹھنے کے بجائے اپنی ہم سفر کے پاس ہوتے۔ ان کی یہاں موجودگی اور میری بات پر یقین کر کے چلے آنا اس بات کی گواہی ہے نمل کہ محبت مر نہیں سکتی۔ مجھے رہنے دو۔ اپنی بات کرو۔ قدرت اگر موقع دے رہی ہے تو کفران نعمت نہ کرو اور مجھے معاف کر دیجیے گا حُر آپ کی نمل کو حفاظت سے نہیں رکھ سکا۔ میں نے اس پر بہت تشدد کیا۔ نمل تم بھی میری زیادتیوں پر مجھے معاف کر دینا۔" وہ یہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔

حُر عباس خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ نمل کا فیصلہ آج بھی وہی ہے اور کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ کیا ہوا اگر احراز بخاری کی سوچ میں تبدیلی آ گئی تھی۔ یہ انفرادی تبدیلی کہاں تک کارگر ہوتی۔ محبت تو آج بھی رسوم و ذات کے قلعے میں محصور تھی اور شاید کل بھی محصور رہتی۔ وہ آج سے چھ سات سال قبل کی طرح از سر نو دی گئی قسم کا بوجھ اٹھائے کھڑا تھا۔ آج بھی اس نے جدائی مانگی تھی اور آج بھی وہ دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور اور بے اختیار تھے۔ حُر عباس نے نمل کی پیشانی پر آخری بوسہ دیا۔

"عابی کی جان! عابی کی گڑیا اپنا خیال رکھنا۔ میں زمین کے کسی گوشے میں بھی رہوں ہمیشہ اپنی نمل گڑیا کا عابی رہوں گا۔"

"اور نمل صرف اپنے عابی کی گڑیا۔ گڑیا کے عابی ایک دوسرے کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں ناں، ہے ناں عابی؟"

"ہاں عابی کی جان۔" وہ شکستگی سے مڑ گیا۔

مجھے اب کچھ نہیں سننا
مجھے کچھ بھی نہ بتلاؤ
مجھے تم مشورے مت دو
کہ
میں نے کیسے جینا ہے
اگر تم بھولنے کا مجھے بتلا نہیں سکتے
تو پھر کچھ بھی نہ بتلاؤ
چلے جاؤ چلے جاؤ
کبھی نہ لوٹ کر آنے کو
تم جاؤ...... چلے جاؤ
نمل پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

☆......☆

دوسرے کمرے میں احراز بخاری بھی تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا۔ "میں احراز بخاری آج اس لیے نہیں رو رہا کہ میں نے غیرت کو محبت کے قبرستان میں دفن کر دیا ہے۔ میں اس لیے رو رہا ہوں کہ میرے دل کا ناسور بہہ رہا ہے اور یہ تو بہتا ہی رہے گا۔

کیونکہ اس کا پھایا اس کا مرہم نمل بخاری کے پاس نہیں ہے۔ ہاں نہیں ہے اس کا علاج عابی کی گڑیا کے پاس۔ اس کا دم تو صرف احزاب کے پاس ہے وہ احزاب جیسے نمل کو عابی سے چھین لیا گیا۔ ایسے ہی مجھ سے چھین لیا گیا کیونکہ اگرچہ وہ میری چچازاد تھی لیکن اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑی تھی۔

میں غیرت کے جنازے پر نہیں محبت کی قبر پر، اشک فشانی کر رہا ہوں۔ یہ بات بھی نمل جان نہیں پائے گی کہ وہ مرض ہجر میں تنہا نہیں ہے اور عابی کی گڑیا کا خیال مجھے رکھنا ہے کیونکہ رشتے کے لحاظ سے وہ مجھے عزیز بھی تو ہے۔ شاید اس طرح ہمارے دلوں کو سکون ملے کہ سنا ہے محرومیاں محرومیوں کی گود میں سر رکھ کر روتی ہیں۔ مجھے اس غلطی کا ازالہ بھی تو کرنا ہے جو میں نے ناروا سلوک کی صورت نمل سے روا رکھا۔ اس پر بے وجہ شک کیا۔ حالانکہ وہ حُر عباس سے رابطے میں نہیں تھی یہ میرے اندر کا چور تھا جو مجھے نمل پر شک کرنے کے لیے مجبور کرتا۔

ہاں میرے دل میں احزاب کی محبت کا چور تھا دیکھیں یہ چور کہیں آپ کے دل میں تو نہیں ہے؟

اگر ہے تو...... کسی نمل پر شک کرنے کی بجائے دلوں کے ناسور کو خاموشی سے رسنے دیں۔

......☆......

شہلا گل سحر

افسانہ

# اعتبارِ محبت ٹھہرا نے ٹھہری

ریڈ شرارے میں وہ سرخ گلابوں کے درمیان بیٹھی خود بھی ایک کھلتا ہوا سرخ گلاب لگ رہی تھی۔ ایک تو تھی وہ اپسرا اوپر سے دلہناپے کے ہار سنگھار نے اس کے حسن کو دوآتشہ کر دیا تھا۔ تو آخر کار میں



نے مغرور سے زرنیل احمد کو پا ہی لیا۔'' اس نے آسودہ سانس لیتے ہوئے کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی۔ کمرے کی ڈیکوریشن بڑے ڈیسنٹ طریقے سے کی گئی تھی۔ گلاب اور موتیے کی سیج اس کی سانسوں کو مہکا رہی تھی۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے وہ ہر چیز کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ باہر سے آتی قدموں کی چاپ نے اسے چوکنا کر دیا۔ جلدی سے گھونگھٹ گرائے وہ اپنے ہم سفر کا انتظار کرنے لگی۔ زرنیل نے کمرے میں آکر اچٹتی نظر اس پر ڈالی۔ کلاہ اتار کر صوفے پر رکھا اور چینج کرنے کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اساورہ نے جھکی جھکی نظروں سے سارا منظر دیکھا۔ عجیب سے خوف نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اندیشوں کے ناگ اسے بری طرح ڈس رہے تھے۔ وہ جانتی تھی یہ شادی زرنیل نے تایا ابو اور تائی کے دباؤ میں آکر کی ہے۔ ورنہ اس نے کبھی نہ شادی کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ اسے عورت ذات سے سخت چڑ تھی۔ اس کے بابا نے بھی مما کی ضد میں آکر اس کی شادی ددھیال میں کر دی مگر در حقیقت خود اس کی خواہش بھی اس میں پنہاں تھی۔ اونچا لمبا ڈیسنٹ



سا زرنیل اسے پہلی نظر میں متاثر کر گیا تھا۔ تایا ابو کے بزنس اور جائیداد کا اکلوتا وارث۔" زرنیل کا انتخاب بھی اس نے ایک مقصد کے تحت کیا تھا۔ اس میں خود اس کا بھی ایک گہرا راز چھپا تھا۔ بے تحاشا حسن کی مالک اساورہ کو زرنیل نے جس بے نیازی سے نظر انداز کیا تھا اس کی یہی ادا ہی اسے بھا گئی تھی۔ اپنی سوچوں میں غلطاں اور ماضی کی پٹاری کھولے اساورہ واش روم کا دروازہ کھلتے ہی ہوش کی دنیا میں آ گئی۔ اب موصوف کلاک پہ طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد روم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ ماتھے پر تناؤ کا جال اس کی ذہنی خلفشار کی غمازی کر رہا تھا۔ چہل قدمی کے بعد اس نے صوفے پر بیٹھ کر لائٹر سے سگریٹ سلگائی اور گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ وہ کمرے میں موجود دوسرے نفوس سے قدرے لاپروا تھا۔ اساورہ جھکی نظروں سے اس کی ساری کارروائی دیکھتی رہی اور پھر اپنی خود اعتمادی بحال کرتی اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ زرنیل نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی مگر اس کے مہکتے اور ہوشربا حسن نے اس کے پتھر دل کو بھی ڈگمگا دیا۔ رشتہ بدلتے ہی اس کے دل کی حالت بھی بدل گئی تھی مگر لمحہ بھر میں اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"تم لوگوں کو قربانی کا بکرا میں ہی ملا تھا۔ دنیا میں اور لڑکے ختم ہو گئے تھے۔" اس نے رخ پھیرتے ہوئے غصے سے کہا۔

"دیکھیے پاپا اور تایا کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ میری ضد پر مجبور ہو گئے تھے۔ دراصل پاپا بچپن سے میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔" وہ ہاتھ جوڑے مجرموں کی طرح سر جھکائے اس کے کٹہرے میں کھڑی تھی۔

"میں کوئی کھلونا ہوں یا کوئی بے جان مورت۔" کہ تمہاری خواہش پر قربان کر دیا جاؤں۔" زرنیل نے غصے سے اسے کندھوں سے جھنجھوڑا۔ اس لڑکی کی خواہش کو اس پر ترجیح دی گئی تھی۔

"اصل میں، میں ہارٹ پیشنٹ ہوں، میرے دل میں سوراخ ہے۔ اس لیے بابا میری کوئی بات نہیں ٹالتے مگر میں سچے دل سے آپ کے ساتھ کی گئی ہر زیادتی کی دل سے معافی مانگتی ہوں۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔ کوئی ضد نہیں کروں گی۔ آپ کے ساتھ کی گئی زیادتی کا ہر طریقے سے مداوا کرنے کی کوشش کروں گی۔ آپ غصہ تھوک دیں پلیز۔" ہرنی جیسی آنکھوں سے شبنمی آنسو ٹپ ٹپ گالوں کو بھگو رہے تھے۔

زرنیل اس کی بات پر بری طرح چونکا۔ اپنی پری وش دلہن کی آنکھوں سے گرتے موتی اس کے موم جیسے دل کو جھنجھوڑ گئے۔ اس نے سارے گلے شکوے ایک طرف ڈالے۔ مگر اس کی بیماری کا سن کر اسے ایک نئی الجھن نے آ گھیرا۔

"تایا ابو نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔" مگر جیسے اساورہ نے اس کی سوچ پڑھ لی۔

"آپ سوچ رہے ہیں کہ بابا نے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ ایسی بات نہیں میں نے ہی بابا کو سر کی قسم دے کر منع کیا تھا۔ آپ کی اصل گناہ گار میں ہوں۔" بھیگے لہجے میں کہتے ہوئے اساورہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ زرنیل نے گہری سانس لیتے ہوئے اس احمق لڑکی کو دیکھا۔

"او کے تم چینج کر کے آرام کرو۔" اور خود بستر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ چینج کر کے آئی تو وہ کروٹ بدلے سو رہا تھا۔ لائٹ آف کر کے وہ بھی کونے میں ٹک گئی مگر دماغ الجھی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور نگاہ کسی غیر مرئی نکتے پر مرکوز تھی۔

☆......☆

صبح صبح اٹھ کر اس نے گلاس وال سے باہر دیکھا۔ بارش نے ہر چیز کو دھو کر ایک نئی جلا بخشی تھی۔ سردی اور خزاں کو رخصت کر کے بہار نے ہر چیز کو

ایک نیا پیرہن بخشتا تھا۔ ہر پھول اور پورا نکھرا نکھرا اور دھلا دھلا خوشی سے جھوم رہا تھا۔ مگر موسم کی دلفریبی بھی اسے کوئی خوشی یا کوئی نیا احساس نہیں دے سکی تھی۔ ملازمہ کے بلانے پر وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں چلی آئی جہاں اس کے ممی پاپا ڈاکٹر ہاشم اور ڈاکٹر سمیرا ہاشم اور اس کا بھائی راحم پہلے سے موجود تھے۔ وہ سلام کر کے کرسی پر ٹک گئی۔ ابھی اس نے بریڈ ہاتھ میں ہی لیا تھا۔

''آج ہاسپٹل سے آف ہے ڈاکٹر انصاری کے ہاں گرینڈ پارٹی ہے شام کو تیار رہنا۔'' گھمبیر خاموشی میں ڈاکٹر ہاشم کی آواز گونجی۔

''سوری میں آج کسی اور جگہ انگیج ہوں۔'' سمیرا ہاشم نے ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''اپائمنٹ کینسل کرو، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے، یہ فیملی فنکشن ہے۔'' ہاشم خان کی پاٹ دار آواز گونجی۔

''سوری میں اپنی اپائمنٹ کینسل نہیں کر سکتی۔ آپ اکیلے ہی اٹینڈ کرلیں۔'' یہاں بے نیازی عروج پر تھی۔

''دو ٹکے کی عورت تم ایک بات نہیں سنتیں۔ ٹکے ٹکے کے لیے ترسنے والی اپنی اوقات سے بڑھ کر دیکھ لیا تم نے اس لیے اپنی اوقات بھول گئی ہو۔ مفلسی میں زندگی بسر کرنے والی میری دی ہوئی آسائشات کی مرہونِ منت تم اتنا اترانے لگی ہو۔'' ہاشم خان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ اس نے سامنے پڑا دودھ کا گلاس دیوار پر دے مارا۔

''اور تم کیا ہو نہ شکل، نہ پرسنالٹی۔ ارے لوگ ہم دونوں کو دیکھ کر اب بھی کہتے ہیں۔ حور کے پہلو میں لنگور شرم آتی ہے مجھے تمہارے ساتھ جانے پر۔''

بچوں کے سامنے سمیرا ہاشم کی عزت مجروح ہوئی تھی۔ اس لیے اس کی زبان بھی انگارے اگل رہی تھی۔ کچھ ٹائم کے بعد زبانی گولہ باری کے ساتھ ساتھ برتنوں کی بھی قضا آ گئی۔ وہ دونوں حیران پریشان ماں باپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کون سا ناشتا اور کہاں کا ناشتا۔ ''ان کے مہذب والدین جو پیشے کے لحاظ سے مسیحا تھے اب لڑتے ہوئے حیوانوں سے بھی بدتر لگ رہے تھے۔ حالانکہ یہ نئی بات نہیں تھی۔ یہ تماشا تو وہ اپنے بچپن سے دیکھ رہے تھے۔ ایک کو اپنے حسن پر غرور تھا تو دوسرے کو اپنے اسٹیٹس اور حسب نسب پر۔ ان لوگوں کی اس چپقلش نے بچوں کو احساس محرومی میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆......☆

ولیمے کا فنکشن اچھے سے گزر گیا۔ کامدار بھاری فراک اتار کے اس نے ہلکا پھلکا کاٹن کا سوٹ پہنا۔ طلائی زیورات کو ڈبوں میں بند کیا۔ کولڈ کریم سے میک اپ صاف کر رہی تھی کہ اسی اثناء میں زرنیل بھی چینج کر کے بیڈ پر آ چکا تھا۔

لائٹ آف کر کے وہ بھی بیڈ پر آ گئی۔ زیرو لائٹ کی روشنی میں اس نے زرنیل کو دیکھا جو آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ جانے اسے کیا شرارت سوجھی کہ اس نے اس کے کان کے پاس چوڑیاں کھنکھنائیں، آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر زرنیل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''آج بھی آپ جلدی سو جائیں گے۔'' اس نے معصومیت سے آنکھیں جھپکا کے کہا۔

''تو کیا کروں۔'' اس نے برجستہ پوچھا۔

اسا وہ نہ صرف سٹپٹا گئی بلکہ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔

''م ......مم میرا مطلب ہے ہم کوئی بات تو کر سکتے ہیں۔''

''کیا بات کریں۔'' پھر مزے سے پوچھا گیا۔

''مثلاً آپ نے مجھ سے میری پسند یا میرے

بارے میں کچھ پوچھا ہی نہیں۔" ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے معصومیت سے کہا۔

"عمر پڑی ہے، جان لیں گے اس وقت تو مجھے سخت نیند آرہی ہے۔" جماہی لیتے ہوئے اس نے کروٹ بدل لی۔

"سنیے آپ پلیز میری طرف منہ کر کے سو جائیں۔" اس نے التجا کی۔

"کیا مسئلہ ہے بھئی۔" اس نے اس کی طرف کروٹ بدل لی۔ تب اس نے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ تو سامنے دیوار پر موٹی تازی چھپکلی کو دیکھ کر اسے ہنسی آگئی۔

"آج کل کی عورت ستاروں پر کمند ڈال رہی ہے مگر چھپکلی اور لال بیگ سے آج بھی اس کی جان جاتی ہے۔" اس نے ایک نظر اساورہ پر ڈالی جو برابر میں ہی لیٹی تھی۔ آنکھیں زور سے میچے وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔ نکھرا نکھرا سا سادہ چہرہ، سنہری بال کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ یاقوتی ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے اور سفید صراحی دار گردن اس کے جذبات میں ارتعاش لانے لگی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے بڑے استحقاق سے اسے بانہوں میں لیا تو اس نے تڑپ کر آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کے چہرے پر جھکا گرم سانسوں کے شور نے اس کے ہوش اڑا دیئے۔

وہ اسے دور دھکیلنے لگی۔

"ارے چھپکلی گر گئی۔" وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی اور ہنستے ہوئے زرنیل نے اسے سانسوں میں سمو لیا۔

☆......☆

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی دونوں بہن بھائی والدین سے یکسر لاپروا ہو گئے۔ ارحم اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلا گیا اور اس کا وہاں سیٹل ہونے کا ارادہ تھا۔ اساورہ نے ایم اے اکنامکس کر کے بی ایڈ کیا اور ایک گرلز کالج میں پڑھانے لگی۔ ماں باپ کے لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس نے میڈیکل لائن جوائن نہیں کی۔ سیکنڈ ٹائم اس نے کئی شارٹ کورسز کیے، کمپیوٹر، انگلش لینگویج، کوکنگ، ڈیکوریشن وغیرہ چھٹی کے دن وہ قریبی مدرسے چلی جاتی، قرآن ترجمہ اور تجوید سے پڑھتی۔ دراصل وہ گھر سے فرار چاہتی تھی۔ آج بھی اس کے اندر احساس محرومی کی شکار لڑکی تھی۔ بزدل اور ڈرپوک، ماں باپ کو سوں فاصلے پر آج بھی وہ تنہا اور اکیلی تھی اور اس کے والدین کے جھگڑے آج بھی عروج پر تھے، گھر واپس آکر وہ اپنے کمرے میں مقید ہو جاتی۔

☆......☆

آج سنڈے تھا۔ تایا ابو اور تائی امی بیٹے کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد عمرے کے لیے جا رہے تھے۔ رات کو ان کی فلائیٹ تھی۔ اس کی تینوں نندیں اپنی اولاد سمیت ڈرائنگ روم میں براجمان تھیں، سب کی باتوں اور قہقہوں کے درمیان فضا بہت خوشگوار تھی۔

اساورہ پہلی بار میٹھا بنا رہی تھی اور نندوں کی فرمائش پر وہ گاجر کا حلوہ بنا رہی تھی۔ تائی اماں نے ضرورت کی ساری چیزیں اسے نکال کر دے دی تھیں اور اب اسے کڑے امتحان سے گزرنا تھا۔ زرنیل بھی چھوٹی بہن سنبل کی بیٹی کو گود میں اٹھائے ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کی متلاشی نظریں بار بار کچن کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

"معزز خواتین کیا آپ لوگوں نے ایک اہم بات نوٹ کی۔" چھوٹی بہن سنبل نے باقی بہنوں کو دیکھ کر آنکھ دبائی تو سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ وہ بغور زرنیل کی طرف دیکھ رہی تھی جو اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کی درگت بننے والی ہے۔

"کیا تم لوگوں نے نوٹ کیا کہ شادی کے بعد ہمارے پیارے اینگری ینگ مین بھیا کتنا بدل گئے

ہیں، ماتھے پر سلوٹیں غائب ہوگئی ہیں، آنکھوں میں چمک سی آگئی ہے۔ ہونٹوں پر بھی مدھر مسکان نے بسیرا کرلیا ہے اور تو اور موصوف کنکھیوں سے کئی بار کچن کی طرف بھی دیکھ چکے ہیں جہاں اساورہ بھابی پہلا میٹھا بنا رہی ہیں۔" سب کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی نامحسوس طریقے سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

"خبردار! جو تم نے بڑے بھائی کو تنگ کیا۔" تائی امی نے مسکراہٹ دبائے اس کا کان پکڑا۔

"حقیقت پسند بندے ہیں حقیقت بیان کررہے ہیں۔ مختصر یہ بھابی کی محبت نے بھائی کو یکسر بدل دیا ہے اور ہمیں اس مثبت تبدیلی کے لیے بھائی کی شادی بہت پہلے کردینی چاہیے تھے۔"

سنبل کی شوخی عروج پر تھی اور زرنیل اس کی گفتگو سے جھینپ کے سر کھجا رہا تھا، اسی اثناء میں اساورہ حلوہ بھی لے آئی اور ہنستے مسکراتے ماحول کا حصہ بن گئی۔ حلوے کے ذائقے نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ اساورہ اتنی اچھی کوکنگ بھی کرسکتی ہے۔ ڈنر میں بوا کے ساتھ مل کے اس نے مٹن بریانی، چکن ہانڈی، نرگسی کوفتے اور رشین سلاد بنا کر نہ صرف داد سمیٹی بلکہ تایا ابو کے وائٹ سے کئی نیلے نوٹ اس کی ہتھیلی پر منتقل ہوگئے۔ سب ہی اس کے سگھڑاپے کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ زرنیل کے دل میں اس کی قدرومنزلت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

☆......☆

اپنی دن بھر کی روٹین بھگتا کر وہ واپس آئی تو خلاف توقع مما اسے لان میں ہی مل گئیں۔

"سنو اساورہ ادھر آؤ۔" انہوں نے اسے پکارا تو وہ سلام کرتی کین کی کرسی پر ٹک گئی۔

"کل شام کو ڈاکٹر تحسین کے گھر گرینڈ پارٹی ہے۔ اپنے بیٹے کی کامیابی کے سلسلے میں جو ابھی حال ہی میں لندن سے اسپیشلائزیشن کرکے لوٹا ہے۔ تم صبح کالج سے آف لو اور یاد سے پارلر چلی جانا تاکہ سیکنڈ ٹائم تم بالکل فریش ہو۔"

"مگر مما! آپ جانتی ہیں کہ میں ان چیزوں کو پسند نہیں کرتی۔" اس کے صبیح چہرے پر بیزاری چھاگئی۔

"مگر یہ بہت ضروری ہے مجھے تم سے مزید بحث نہیں کرنا، بس کل تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔" وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے روم کی طرف بڑھ گئیں۔

وہ پہروں بیٹھ کر وہاں کڑھتی رہی۔ مما کی ضد کے آگے وہ ہتھیار ڈال کے ان کے ساتھ چلی گئی۔ پیچ کلر کی فراک جس پر کڑھائی اور نازک موتیوں کا کام ہوا تھا۔ چوڑی دار پاجامہ اور بڑا سا دوپٹہ لیے بیوٹیشن کے کیے گئے خوب صورت میک اپ اور منفرد ہیر اسٹائل کے ساتھ وہ کافی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ رنگ و بو کے سیلاب میں وہ خود کو ان فٹ محسوس کررہی تھی۔ بابا نہیں آئے تھے وہ کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے تھے۔ مما نے بہت نخرے سے سب سے ملوایا۔ سب نے اس کی تعریف کی مگر اس کے چہرے پر بیزاری ہنوز قائم تھی۔ پورا ٹائم وہ گھڑی دیکھتی رہی۔ اس سے بے خبر کہ دو آنکھیں مسلسل اس کے چہرے کا طواف کررہی تھیں مما نے جب میزبان سے اجازت چاہی تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔

☆......☆

تایا اور تائی کے جانے کے بعد وہ زرنیل اور ان کی پرانی ملازمہ بوا اور اس کی بھتیجی ہی گھر میں رہ گئے تھے اور زرنیل کے لیے تو جیسے وہ نشہ ہی بن کے رہ گئی تھی۔ ہنستی، مسکراتی تتلی کی طرح اس کے آگے پیچھے گھومتی اس کے کام کرتی، نماز کی پابند، قرآن کی تلاوت کرکے اس پر پھونکتی اسے صبح آفس رخصت کرتی، اس کی ہر ادا دل ربا تھی اور ہر دن

وہ زرنیل کو حیران کرتی، ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی لڑکی مڈل طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی طرح Be have کرتی۔

☆......☆

زرنیل لیپ ٹاپ کھولے اپنے آفس کے کام میں مصروف تھا۔

"چلوناں زرنیل! باہر بہت پیاری بارش ہے۔ چلوناں لان میں چلتے ہیں۔"

کھڑکی سے بارش کا نظارہ کرتی اساورہ مچل سی گئی۔ زرنیل کے ساتھ اسے سارے موسم اچھے لگنے لگے تھے۔ زرنیل کے انکار کے باوجود وہ اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی باہر لے گئی۔ موسلا دھار بارش تھی۔ ہر چیز ساکن اور خاموش تھی۔ رات کی رانی کی مہک سانسوں میں اتر رہی تھی۔ بارش کے ساتھ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی ماحول کو رومانوی بنا رہی تھی اور وہ پاگل سی لڑکی ہاتھ پھیلائے گول گول گھوم رہی تھی۔ بارش کے قطرے اس کے گلاب چہرے کو چوم رہے تھے اور اس کے سنہری بالوں میں شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ زرنیل جو زبردستی اس کے ساتھ آیا تھا، برآمدے کے شیلٹر کے نیچے اب بڑے مزے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک خوب صورت منظر تھا۔ یک لخت بجلی بہت زور سے کڑکی اور اساورہ سہم کر زرنیل کے گلے لگ گئی۔ اس کے گرد زرنیل کا گھیرا تنگ ہوگیا۔ اس کے چہرے سے بارش کے قطرے جذب کرتا وہ دنیا مافیا سے بے خبر ہوگیا۔ "زرنیل" وہ اس کے بازوؤں میں کسمسائی تو وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ اساورہ نے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھا۔

"تمہارا قصور ہے موسم کے ساتھ ساتھ تم بھی بے ایمان ہوگئی تھیں تو میں کہاں تک کنٹرول کرتا۔ خیر چلو روم میں اور چینج کرو بیمار ہو جاؤ گی۔" اور ساتھ میں اس کے بھیگے وجود کو بازوؤں میں اٹھا کر روم میں لے آیا۔ "کپڑے چینج کر کے وہ کمبل میں دبک گئی۔ زرنیل پھر سے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

"اساورہ! انکل کون سے ہارٹ اسپیشلسٹ سے تمہارا علاج کروا رہے ہیں۔ تم صبح اپنی ساری رپورٹس اور میڈیسن لسٹ مجھے دے دینا کہ تمہارے چیک اپ کے ساتھ ساتھ میں تمہارا کیس بھی تفصیل سے ڈسکس کرلوں۔" زرنیل نے کام سے ہاتھ روک کر بے ساختہ اسے کہا تو اساورہ کو اتنی ٹھنڈ میں بھی پسینہ آ گیا۔

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

پہلی رات اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے جو جھوٹ بولا تھا وہ تو وہ کب کا بھول چکی تھی مگر زرنیل احمد کی یادداشت میں وہ بات اچھی طرح محفوظ تھی۔ بہت دنوں بعد اس کا دل اندیشوں اور وسوسوں سے بھر گیا تھا۔

☆......☆

لندن پلٹ ڈاکٹر حسن کو معصوم سی اساورہ دل سے بھا گئی تھی۔ مما کو اس کو ساتھ لے جانے کا مقصد بھی پورا ہو گیا تھا۔ وہ لوگ پروپوزل لے کر آئے تو مما کے پاؤں خوشی کے مارے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے مگر اساورہ کوفت کا شکار تھی۔ ماں باپ کی عملی زندگی دیکھ کر اسے شادی کے نام سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔ وہ اپنے خول میں سمٹی لڑکی تھی اس لیے اس کی گن کچھ ہی فرینڈز تھیں ہر بات میں اختلاف رائے رکھنے والے بھلا اِدھر کیسے متفق ہوتے۔ بابا نے مما کی کہاں چلنے دی۔ جھگڑا طول پکڑنے لگا، اب جھگڑے کی وجہ اس کی ذات تھی، اسے اپنا آپ فساد کی جڑ لگنے لگا اور پھر ایک دن پاپا مما کی چیخ و پکار کی پروا کیے بغیر اسے تایا ابو کے گھر لے آئے۔ تایا ابا جو کہ اپنی فیملی کے ساتھ پشاور میں مقیم تھے۔ کبھی کبھی پاپا اسے اور ارحم کو لاتے تھے،

یہاں کا پیار اور اتفاق دیکھ کر اکثر ان کا احساس محرومی بڑھ جاتا، یہاں کی فضا پیار اور خلوص سے گندھی ہوئی تھی۔ تایا ابا کی تینوں بیٹیاں جو شادی شدہ تھیں اس سے ملنے آئیں۔

''ارے اساورہ تو کتنی پیاری ہوگئی ہے۔'' کومل کے منہ سے نکلا تو سب کے بے اختیار دیکھنے پر وہ جھینپ گئی۔ وہ اپنے کزن زرنیل سے بھی ملی۔ اونچا لمبا وجیہہ! زرنیل اس سے سرسری سا ملا اور پہلی نظر میں اسے متاثر کر گیا مگر زرنیل کی بے نیازی عروج پر تھی، اس نے ایک نظر کے بعد دوبارہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پاپا نے تایا اور تائی امی سے مشورہ کر کے آناً فاناً اس کا رشتہ زرنیل سے کر دیا، مرضی پوچھنے پر اس نے سب کچھ پاپا پر چھوڑ دیا۔ ویسے بھی وہ کسی کی ضد کے بھینٹ چڑھنی تو تھی۔ مما نے بہت شور مچایا۔ پاپا کو بے نقط سنائیں۔ اسے واپس آنے کے لیے قائل کرنا چاہا مگر شاید اس کا رشتہ زرنیل احمد کے ساتھ آسمانوں پر جڑ چکا تھا۔ اس لیے تو 15 دن کے اندر اندر وہ اس کی نصف بہتر بن کر بڑے استحقاق سے اس کے بیڈ روم میں حصے دار بن گئی، زرنیل شادی سے الرجک تھا، اسٹڈی کے دوران اسے اپنی ایک کلاس فیلو سے محبت ہوگئی تھی مگر اس نے زرنیل سے بے وفائی کی اور کسی اور کے گلے کا ہار بنی تو اسے عورت ذات سے نفرت ہوگئی تھی مگر جانے پاپا اور تایا نے اس پر کون سا صور پھونکا کہ وہ آمادہ ہوگیا مگر پہلی رات جو اس کے غصے سے ڈر کر اس نے جھوٹ بولا اب وہ اس کے گلے پڑ چکا تھا۔

☆......☆

صبح اس کے آفس جانے تک اس کی سانس گلے میں اٹکی رہی اور اس کے جانے کے بعد اس نے سکھ کا سانس لیا، بوا اور مہر کے ساتھ اس نے روم کی سیٹنگ بدلی۔ اپنی وارڈ روب سیٹ کی زرنیل کی پسندیدہ ڈشز کا مینو بنایا۔ وقت پاس کرنے کے لیے اس نے خود کو مصروف رکھا مگر دل کو خوف ویسے ہی ڈستا رہا۔ شام زرنیل اپنے وقت سے بہت پہلے آگیا اور آتے ہی چائے کی فرمائش کی، چائے بنا کر وہ روم میں آئی۔ تو وہ کسی گہری سوچ میں ہی مستغرق تھا۔ اس کی پیشانی پر کھینچا رگوں کا جال اس کی پریشانی کی غمازی کر رہا تھا۔ کہیں یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کی پیشن گوئی تو نہیں کر رہی۔ لرزتے ہاتھوں سے چائے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔'' اس نے زرنیل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں بس ہلکا سا سر درد ہے۔ چائے پی لوں تو سیٹ ہو جاؤں گا۔'' اس نے چونک کر کہا اور سائیڈ ٹیبل سے کپ اٹھا لیا۔ خاموشی کا راج تھا۔ چائے پی کر وہ اس کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور ریموٹ لے کر ٹی وی لگا لیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگی۔ سامنے میاں بیوی کا رومینٹک سین چل رہا تھا۔ ''یار بیویاں شوہر کو جان اور جانو کہہ کر پکارتی ہیں ایک تم ہو کہ صرف میرا نام لیتی ہو۔'' اس نے دبی دبی مسکراہٹ سے اساورہ کو دیکھا تو وہ حیا سے گلنار ہوگئی۔ سین بدل کے اب دوسرا چل رہا تھا۔

''اف یہ انڈین ڈرامے فتنے اور فساد کی جڑ......! عورت کتنی زہر لگتی ہیں مجھے جھوٹی اور منافق عورتیں۔ جھوٹ بولنے والی عورت کبھی اعتبار کے قابل نہیں ہوتی۔'' غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے ٹی وی بند کیا اور ریموٹ صوفے پر اچھال دیا۔ اساورہ پر کپکپی طاری ہوگئی اور آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''ارے کیا ہوا تمہیں میں نے تمہیں نہیں ڈانٹا۔'' اس کے ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنے سینے پر رکھے۔ جانے اساورہ کے دل میں کیا آیا کہ وہ پھوٹ

پھوٹ کر رو دی۔ زرنیل بری طرح بوکھلا گیا۔

''ارے ارے کیا ہوا۔'' جلدی سے اٹھ کر اس نے اسے گلے لگایا۔ تب اس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے سارے دکھ اس کو بتاتی چلی گئی۔

''جانتے ہیں آپ کہ میں ہر فن مولا ہوں یہ مجھے ماں نے نہیں سکھایا بلکہ گھر سے فرار نے سکھایا۔ صرف اور صرف گھر سے باہر رہنے کے لیے اور انجانے خوف کے زیر اثر میں نے سب سیکھا۔ میں شفقت اور محرومی کی ماری لڑکی ہوں۔ میں نے آپ سے بھی جھوٹ بولا کہ آپ بھی میرے پاپا کی طرح غصے میں آ کر توڑ پھوڑ نہ شروع کر دیں لیکن میرا انتخاب آپ اس لیے تھے کہ آپ مکمل مردانگی کا شاہکار بھی ہیں اور حسب نسب میں بھی میرے ہم پلہ ہیں۔ ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں تو ہم میں جھگڑا یا کوئی اختلاف رائے نہیں ہوگا۔ میرے اعصاب تھک گئے ہیں مگر سچ تو یہ ہے اب مجھے آپ سے شدید محبت ہوگئی ہے اور میں آپ کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آپ پلیز مجھے معاف کر دیں بدلے میں مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے۔'' رندھی آواز میں بولتی اساورہ کو زرنیل نے ایک نظر دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے۔ اس کے اقرار محبت نے اس کے دل میں پھول کھلا دیے تھے۔ وہ اسے لیے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''یعنی ہماری جوڑی پرفیکٹ ہے اور میں مکمل مردانگی کا شاہکار ہوں۔'' وہ اپنے چہرے کو چھو چھو کر دیکھ رہا تھا اور اساورہ رونا بھول کر اس کی عجیب سی حرکات حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔

''جان زرنیل! محبت میں دھوکا میں نے بھی کھایا ہے اور ایک عورت کی وجہ سے عورت ذات سے نفرت کر بیٹھا۔ یہ بھول کر کہ میری ماں بھی تو پیکر وفا ہے مگر پھر ایک عورت نے ہی آ کر مجھے پھر سے محبت سکھائی۔ میرے ویران دل میں پھر سے محبت کی آبیاری کی، محبت کی ننھی منی کونپلوں سے میرا پورا دامن بھر گیا اور مجھے اس سے عشق ہو گیا۔'' اس نے اساورہ کی حیرانی سے کھلی آنکھوں کو نرمی سے ہونٹوں سے چھوا۔

''جانِ زرنیل! رشتے تقدس مانگتے ہیں، اعتبار مانگتے ہیں، شادی کے بعد میں نے محبت کے صحیح مفہوم کو سمجھا۔ رہی بات بیماری کی تو وہ دوسرے دن ہی میں نے کنفرم کر لیا تھا۔ کل تو محض تمہیں چھیڑنے کے لیے تذکرہ کر رہا تھا اور رہی بات مانگنے کی تو مجھے تو تم سے تمہاری طرح پیارے پیارے بچے چاہئیں کہ پھر ہم اپنے بچوں کی اچھے سے تربیت کریں اور اپنی ساری محرومیاں ان کی خواہشات پوری کر کے مٹائیں۔ ٹھیک ہے ناں۔'' زرنیل نے بت بنی اساورہ کے ہونٹوں کو چھوا تو وہ بری طرح شپٹا گئی۔

''آپ بہت بڑے چیٹر ہیں میں نے آپ سے بات نہیں کرنی کل رات سے میری جان سولی پر لٹکی تھی اور آپ مزے لے رہے تھے اور ہاں آپ نے مجھے پہلی رات رونمائی کا تحفہ بھی نہیں دیا۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا تو زرنیل دھیرے سے مسکرایا اور پھر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک مخملی ڈبیا نکال کے اس میں سے ایک پیارے سے دل والا گولڈ کا لاکٹ نکالا جس میں سفید نگینوں سے A اور Z لکھا تھا۔ اس کی گردن میں لاکٹ پہناتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔ ''کوئی اور فرمائش میری جان۔''

''اعتبار محبت۔'' اس نے ہاتھ پھیلا کر بے اختیار کہا تب اس نے اس کی ہتھیلی پر اپنے ہونٹ رکھ کر اپنا اعتبار محبت اسے سونپ دیا اور رات ان کے اس حسین ملن پر چپکے سے مسکرا دی۔

☆......☆

افسانہ

# قصور کس کا

مصباح مسکان رؤف

''اے سارا! ناشتہ دو''۔ تیزی سے روٹی بیلتی سارا کے کانوں میں جونہی یہ آواز پڑی تو اس کے ہاتھ سست پڑ گئے' اس نے بے بسی سے بند دروازے کی سمت دیکھا جس کے پار سے آتی آواز اس کے دل میں نشتر کی طرح چبھی تھی۔

''اب ناشتہ دے بھی دو' مجھے اسکول سے دیر ہو رہی ہے''۔ کوئی بولتا بولتا اس کے سر پر آن پہنچا۔

''دے رہی ہوں بیٹا! تم بیٹھو''۔ اس نے جلدی سے روٹی توے پر ڈالی تھرماس اور کپ ٹیبل پر رکھا۔

''روز تمہاری وجہ سے دیر ہوتی ہے اسکول سے' جلدی اٹھ جایا کرو''۔ وہ بڑبڑایا۔ سارا اپنے آنسو پیتی' لب کاٹتی توے کی طرف پلٹ گئی۔ یہ سارا کا اکلوتا بیٹا حمزہ تھا جو کہ تیسری جماعت میں پڑھتا تھا' ایک لائق اور اساتذہ کا ہر دل عزیز طالب علم۔

سارا شروع سے ہی کم گو تھی مگر شادی کے بعد ملنے والا سسرال سونے پہ سہاگہ ثابت ہوا' روایتی سخت مزاج اور شکی ساس نے تو اس کے لبوں پہ خاموشی کا قفل لگا دیا' شوہر بھی ماں کا فرمانبردار و تابع دار ملا جو کہ بیوی سے بات بھی ماں کی مرضی کے بغیر نہ کرتا تھا' اس کا جیٹھ سال پہلے ہی اپنی فیملی کے ساتھ الگ ہو گیا تھا لہٰذا گھر کے سارے کام اس کے ذمے تھے' وہ بے چاری خاموشی سے سر جھکائے سارا دن کاموں میں جتی رہتی' ذرا سی غلطی پر ساس وہ بے بھاؤ کی سناتی کہ سارا کا جھکا سر مزید جھک جاتا' وہ کبھی بھی ساس کی کسی زیادتی پر بولنے کی جرأت نہ کرسکی' اگر شوہر ساتھ دیتا تو شاید وہ ہمت کر ہی لیتی مگر یہاں تو...... جب سارا کو اولاد کی خوشی ملی تو اس کی اداس زندگی میں جیسے خوشیوں کی لہر دوڑ گئی کہ پہلی اولاد وہ بھی بیٹا۔

''شاید پوتے کو پا کر ماں جی کا دل بدل جائے ان کا رویہ میرے ساتھ اچھا ہو جائے''۔ سارا نے خوشی سے سوچا مگر اس کی سوچ غلط ثابت ہوگئی' ماں جی نے تو وہ کیا جو سارا کے تصور میں بھی نہ تھا۔

''سارا بچے کے سارے کام تم خود کرو گی' اس کو کھلانا' پلانا' نہلانا' دھلانا سب کچھ اس کے علاوہ باقی سارا دن یہ میرے پاس ہی رہے گا''۔ ساس نے پوتے کو لاڈ کرتے ہوئے سارا کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا تو سارا پریشان ہوگئی اس نے کچھ کہنا چاہا تو ماں جی نے اسے ٹوک دیا۔

''یہ میرا پوتا ہے۔ بہو اس کے بارے میں ہر فیصلہ میں ہی کروں گی' یہ کہاں رہے گا' کیسے رہے گا' سب میری مرضی ہے سمجھیں تم......؟'' دوٹوک انداز میں اسے جتایا گیا کہ وہ صرف بیٹے کے کام کاج کی حد تک اس کی ماں ہے' اس کے علاوہ اس ماں کا اپنی اکلوتی پہلی اولاد پہ کوئی حق کوئی اختیار نہیں' سارا دن حمزہ دادی کے پاس رہتا' سارا بیٹے کی صورت تکنے کو ترس جاتی' اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا مگر ماں جی نے تو حد ہی کر دی' جب حمزہ نے بولنا شروع کیا تو اس نے



ہر وقت سامنے رہنے والی دادی کو ماں کہا۔ دادی نے بھی اس کی تصحیح کرنے کی بجائے اسے پکا کر دیا اور سارا کا نام بھی اسے سکھا دیا' بیٹا دادی کو امی اور سگی ماں کو اس کے نام سے پکارنے لگا اس دن سے آج تک حمزہ ہمیشہ ماں کو نام سے بلاتا تھا۔

حمزہ کے بعد سارا کو خدا نے دو بیٹیاں دیں مگر اس عورت نے کبھی پوتیوں کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا' وہ ہر وقت پوتے کے لاڈ اٹھاتیں' اسے ہی پیار کرتیں پوتیاں دادی کی توجہ اور محبت کو بھائی پر نچھاور ہوتا دیکھتیں اور حسرت سے دیکھتیں ہی رہتیں' باپ نے بھی بیٹے کو بے حد لاڈ دیا جس کے نتیجے میں وہ ضدی' بدتمیز اور ہٹ دھرم ہو گیا مگر اتنی توجہ اور لاڈ نے اس میں اعتماد پروان نہ چڑھنے دیا اور وہ ڈرپوک ہو گیا' حمزہ 12 سال کی عمر میں تیسری میں تھا کیونکہ دادی نے لاڈلے پوتے کو دیر سے اسکول داخل کروایا' یہ 12 سالہ بچہ رات تو رات ذرا سا اندھیرا ہونے پر بھی گھر تو کیا کمرے سے بھی اکیلا باہر نہیں نکلتا تھا' دادی پوتیوں کے منہ پر انہیں برا بھلا کہتی ہے کہ یہ میرے بیٹے کا بوجھ بڑھانے آ گئی ہیں ان کی جگہ بیٹے ہوتے تو باپ بھائی کا سہارا بنتے' ساس نے یہی کام اس کے جیٹھ کے بیٹے یعنی اپنے پہلے پوتے کے ساتھ بھی کیا تھا' وہ تو اس کی جیٹھانی نے ہمت کی اور کہہ کہہ کر الگ گھر لے لیا تاکہ بیٹے کو کنٹرول کر سکے اس کا بیٹا سولہ سال کا ہو گیا تھا جیٹھانی اس کی تمام عادتوں پر تو نہیں مگر کچھ کچھ پر قابو پا چکی تھی لیکن خود کو ماں کہلوانے میں ابھی بھی ناکام تھی کیونکہ بیٹا باقاعدگی سے ہر اتوار دادی سے ملاقات کرنے آن پہنچتا اور ایسے میں ماں کی کم ہی سنتا ہے' سارا یہی سوچ سوچ کر ہر وقت دلگرفتہ رہتی ہے کہ جب اس کی جیٹھانی الگ ہو کے بیٹے کو نہیں سدھار سکی اپنی عزت نہیں کروا سکی تو وہ یہاں ساس کی موجودگی میں جہاں پر ہر وقت دادی پوتا اکٹھے ہر جگہ ہوتے ہیں کیسے اپنی خواہش پوری کر سکتی ہے؟ جہاں دادی پوتیوں کو بوجھ سمجھتی ہے کہتی ہے کہ یہ میرے بیٹے کا بوجھ اور ذمہ داریاں بڑھانے آ گئی ہیں ان کی جگہ بیٹے ہوتے تو کم از کم باپ بھائی کا سہارا ہوتے وہ اپنی بچیوں کو ان کا حق کیسے دلا سکتی ہے؟

☆☆☆☆

''دادو! میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی''۔ لائبہ نے دادو اور اریبہ کو جانے کے لئے تیار دیکھ کر معصوم صورت بنا کر اپنی خواہش کا اظہار کیا تو خوشی سے مسکراتی دادو کی پیشانی پہ اسے دیکھ کر اور اس کی بات سن کر ڈھیروں بل پڑ گئے۔

''تمہارا کوئی کام نہیں وہاں، جاؤ اندر کمرے میں''۔ دادی نے جواباً غصے سے تیوریاں چڑھاتے ہوئے گویا حکم جاری کیا جس نے معصوم بچی کی آنکھوں اور چہرے پر اداسی پھیلا دی۔

''ہم وہاں انجوائے کرنے جا رہے ہیں لائبہ ان کی پارٹی خراب کرنے نہیں جو تمہیں ساتھ لے جائیں''۔ اریبہ نے شیشے میں اپنے سفید سوٹ کے فراک کو گھوم کر دیکھتے ہوئے طنز کیا تو لائبہ کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

''یو آر رائٹ آپی شی از لکل لائک آ مانسٹر''۔ اریبہ کی تائید میں احمد نے بھی اس کی تائید کی تو لائبہ سر جھکائے نم آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

''مما آپ کہاں ہیں آپ میرے پاس کیوں نہیں آتیں، اریبہ آپی کے پاس دادو ہیں، بھائی کے پاس پاپا مگر میرے پاس تو کوئی نہیں ہے نا، میں اکیلی ہوں مما کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا، پاپا بھائی کو ٹوائز لے کے دیتے ہیں، گھمانے لے کے جاتے ہیں، دادو بھی اریبہ اور بھائی کے لاڈ کرتی ہیں، اپنے ساتھ لے کے جاتی ہیں، مما مجھے کیوں کوئی لاڈ نہیں کرتا، مجھے پاپا ٹوائز کیوں نہیں لے کے دیتے، بولیں نا مما کیوں کرتے ہیں سب میرے ساتھ ایسے''۔ لائبہ

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللّٰہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبداللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُم مریم | نایاب جیلانی | ایماء راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اپنے کمرے میں بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے ماں کی تصویر جو کہ اسے اسٹور روم سے ملی تھی دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھی ماں سے شکوہ کر رہی تھی اس ناانصافی کا جس کا اس گھر میں کسی کو احساس تک نہیں تھا، لائبہ کی ماں نے ساس کی بدزبانی اور ظلم و زیادتی سے تنگ آ کر خلع لے لی تھی، مگر ساس نے تینوں بچوں کو زبردستی اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا، بڑی بیٹی اریبہ 9 سال اور چھوٹی لائبہ 7 سال کی جبکہ بیٹا 6 سال کا تھا چونکہ اریبہ اور احمد گول مٹول قدرے صاف رنگت کے حامل تھے اس لئے ان کے مقابلے میں لائبہ کی گندمی رنگت کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو جاتی، سب کی توجہ اور پیار نے اریبہ کو کافی پر اعتماد بنا دیا اس کے برعکس احساس کمتری اور عدم توجہ کے باعث لائبہ شرمیلی اور کم گو ہو گئی پڑھائی میں بھی کمزور حتیٰ کہ ہر معاملے میں اریبہ سے کم تر۔

''مجھے پتا ہے اریبہ بہت پیاری ہے نا، وائٹ وائٹ سنو وائٹ جیسی اور میں ڈراؤنی ہوں نا، مانسٹر جیسی، اسی لئے کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا''۔ روتے روتے اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹک گیا۔

''مگر مما! میں خود تو ایسی نہیں ہوئی نا مگر میں کیوں ایسی ہوں؟ میں کیوں اریبہ کی طرح پیاری نہیں ہوں، لائق نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے کیوں پیارا نہیں بنایا، میں نے کیا غلطی کی تھی''۔ معصوم دل فریاد کر رہا تھا اس کے دل میں اٹھتے سوالوں کا جواب دینے والا یہاں کوئی نہیں، سب اپنے اپنے کاموں میں مگن تھا، بالکل بے قصور ہو کر سزا سہنے والی اس ننھی جان کے آنسو پونچھ کر اسے گلے سے لگانے کے لئے کوئی بھی تو نہیں تھا اس کے پاس، سوائے ماں کی ایک تصویر کے جسے وہ کسی قیمتی خزانے کی طرح سنبھال کر سب سے چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔

''مما! آپ آ جائیں نا، میں آپ کے ساتھ دور چلی جاؤں گی، ہم دونوں سیر بھی کیا کریں گے ٹوائز لینے بھی جائیں گے اور رات کو آئس کریم کھانے بھی جایا کریں گے، آپ آئیں گی نا مما پرامس میں آئندہ نہیں روؤں گی، مگر آپ پرامس کریں کہ آپ جلدی آئیں گی''۔ ہمیشہ دکھی ہو کے لائبہ ماں کی تصویر سے روتے ہوئے یونہی شکوے کرتی اور آخر میں خود ہی اپنے آنسو اس امید پر صاف کر لیتی کہ اگر وہ نہیں روئے گی تو اس کی مما جلدی آ جائیں گی مگر اس معصوم کو کیا پتا کہ اس کی امید کبھی پوری نہیں ہونے والی کیونکہ اس کی ماں اپنی نئی زندگی میں بہت خوش تھی، اسے تو کبھی بھولے سے بھی پچھلی زندگی اور بچوں کی یاد نہیں آتی، مگر لائبہ یہ کیسے جان سکتی کیونکہ اس کا دل تو ماں کے لئے دھڑکتا اور اس کے آنے کی آس پہ ہی دھڑکتا تھا۔

☆☆☆☆

''حمزہ کرن کیوں نہیں آئی؟'' ٹیوشن کی باجی فروا نے حمزہ کو اکیلا دیکھ کر سوال کیا۔

''باجی! وہ اس کی نانو آئی تھیں تو وہ اس کے ساتھ چلی گئی ہے، اس کی مما کہہ رہی تھی کہ وہ دو دن بعد آئے گی باجی کو بتا دینا''۔ حمزہ نے کاپیاں بیگ سے نکالتے ہوئے بتایا تو اس کا جواب سن کر فروا کا تیز چلتا قلم رک گیا، اس نے حیرت سے سامنے بیٹھے حمزہ کو دیکھا جو اب بک کھول کر مطلوبہ صفحہ تلاش کر رہا تھا۔

''اس کی نانو...... اس کی مما...... یہ کیا بات ہوئی...... تمہاری کچھ نہیں لگتیں ......؟'' فروا نے حیرت سے استفسار کیا۔

''نہیں باجی...... وہ''۔

''باجی! یہ اپنی مما کو نام سے بلاتا ہے اور دادی کو مما کہتا ہے''۔ حمزہ سے پہلے اس کا پڑوسی بولا تو سب بچوں نے مڑ کر حمزہ کو دیکھا۔

''کیوں حمزہ یہ کیا طریقہ ہے......؟'' اس نے

وضاحت طلب کی۔

''باجی میں شروع سے ایسے ہی بولتا ہوں'' ۔حمزہ نے معصومیت سے اپنی صفائی پیش کی۔

''تو کبھی کسی نے منع نہیں کیا اس طرح بولنے پر......؟'' فروا کو حیرت ہوئی۔

''نہیں باجی، سارا تو کہتی ہے غصہ بھی ہوتی ہے کہ ایسے نہ بولو مگر مما کہتی ہیں کہ یہ ایسے ہی بولے گا خبردار جو اسے ٹوکا'' ۔

''بڑوں کو عزت دیتے ہیں نام سے تو نہیں بلاتے حمزہ'' ۔اس نے سمجھانا چاہا۔

''جی باجی! عزت دیتا ہوں نا مما کہتا ہوں'' ۔

''وہ تو دادی کو کہتے ہو نا، اپنی مما کو تو نہیں'' ۔

''باجی! دادی تو بڑی ہیں نا ان کو زیادہ عزت دینی چاہئے'' ۔حمزہ نے جواب دیا تو سب بچے ہنسنے لگے۔

''خاموش ہو کر اپنا کام کرو سب اور حمزہ آپ بھی کام کرو'' ۔اس نے غصے سے سب کو ڈانٹا تو سب خاموشی سے اپنے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئے جبکہ وہ سر جھکا کے کام لکھتے حمزہ کو دیکھتی رہ گئی کہ کیسے لوگ ہیں اس کے گھر والے، کیا سکھا رہے ہیں اولاد کو۔

چھٹی ہوئی تو سب بچے جلدی جلدی جانے کے لئے کھڑے ہوئے اور بستے کندھوں پر ڈالے سلام کر کے چلے گئے سوائے لائبہ کے جو کونے میں بیٹھی آرام سے ڈرائنگ کر رہی تھی فروا کی نظر کونے میں بیٹھی لائبہ پر پڑی تو وہ اس کے پاس آ گئی۔

''ارے لائبہ! آپ نے گھر نہیں جانا......؟''

''باجی! میرا دل کرتا ہے میں یہیں رہ جاؤں آپ کے پاس، گھر نہ جاؤں'' ۔لائبہ نے معصومیت سے اپنا خیال ظاہر کیا تو وہ پریشان ہو گئی۔

''کیوں کیا بات ہے لائبہ......! آپ گھر کیوں نہیں جانا چاہتیں......؟'' وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''باجی! وہ گھر مجھے اچھا نہیں لگتا'' ۔لائبہ نے کاپی بیگ میں ڈالتے ہوئے سادگی سے بتایا تو بے اختیار فروا کے ذہن کے پردے پر لائبہ کا شاندار گھر آ گیا، لائبہ محلے کی سب سے امیر فیملی سے تعلق رکھتی تھی بڑی شاندار کوٹھی، دو گاڑیاں ملازم، ساری سہولتیں اور آسائشیں، فروا کو حیرت ہوئی کہ لائبہ نے ایسا کیوں کہا ہے......؟

''نہیں بیٹا! ایسے نہیں کہتے، وہ آپ کا گھر ہے، وہاں آپ کے پاپا ہیں، دادو ہیں اور پھر آپ کے بہن بھائی بھی تو ہیں وہاں'' ۔فروا نے اسے بہلانا چاہا۔

''وہ سب ایک دوسرے کے لئے ہیں فروا باجی، میرا تو کوئی نہیں ہے، پاپا دادو صرف اریبہ اور احمد سے پیار کرتے ہیں مجھ سے نہیں کیونکہ میں پیاری نہیں ہوں نا ان دونوں کی طرح اور آپ کو پتہ ہے باجی، میں یہاں ہوم ورک کر کے جاتی ہوں مگر اریبہ اسے ریز کر دیتی ہے پتہ نہیں کس وقت لیکن اس کی وجہ سے مجھے ٹیچر سے مار پڑتی ہے وہ دونوں بہت گندے ہیں، میں انہیں اچھی نہیں لگتی وہ مجھے مارتے بھی ہیں اور پاپا اور دادو سے ڈانٹ بھی پڑواتے ہیں اس لئے میں وہاں نہیں جانا چاہتی، میں تو صرف اپنی ماما کے ساتھ جاؤں گی ان سب کو چھوڑ کے، پتہ ہے میں اور میری مما اکٹھے رہیں گے، ان سب سے بہت دور'' ۔

لائبہ معصومیت سے بتاتے ہوئے جیسے مما کے ساتھ تصور میں کہیں دور پہنچ چکی تھی، فروا جانتی تھی کہ اس کی مما نے کافی عرصے پہلے خلع لے لی تھی مگر اس کے پاپا اور دادی کا رویہ اس کے ساتھ ایسا ہو گا یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا، اس کے اپنے اس سے دور تھے کہ اس کا رنگ باقی دونوں بچوں کی طرح فیئر نہیں تھا، یہ احساس اس معصوم بچی کے ذہن میں تھا اور کیسا تکلیف دہ احساس ہے یہ کہ آپ کو اس جرم کی سزا دی جائے جو آپ کا ہے ہی نہیں، سگی اولاد میں فرق آخر کیوں کرتے ہیں لوگ؟ شکل اور رنگ محبت کی بنیاد

کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ تو خالق کائنات کی مصلحت ہے کہ وہ جسے چاہے جیسی مرضی رنگت صورت دے، امیری غریبی، قد، رنگ، نقوش یہ سب انسان کے ہاتھ میں بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔

دنیا والے تو بعد میں ہیں پہلے تو گھر کے لوگ ہوتے ہیں لیکن اگر گھر کے لوگ ہی شکل وصورت کو وجہ بنا کر ایک دوسرے میں امتیاز کرنے لگیں کسی کو برتر تو کسی کو کمتر سمجھنے لگیں تو دنیا والوں کو کون روکے گا، پھر سگے ماں باپ، سگے رشتے رشتوں میں یہ فرق کھڑے کرنے لگیں تو کیا وقعت رہے گی رشتوں کی اور کیا محبت باقی رہ جائے گی رشتوں میں، دلوں میں۔

"کیوں کرتے ہیں اپنے ایسا...... اپنے ہو کر ایسا دکھ دیتے ہیں کہ انسان جیتے جی مر جاتا ہے، ایک بیٹا اپنی ماں کو نام سے پکارتا ہے ماں جس کے قدموں کے نیچے جنت ہے، اس جنت کی عزت نہیں کرتا تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اس بیٹے کا جو ماں کو دکھ دے رہا ہے یا اس کی دادی کا جس نے پوتے کی تربیت ایسی کی، اس کا باپ قصور وار ہے جو ماں کی زیادتی پر خاموش تماشائی بنا بیٹھا رہا یا پھر اس کی ماں کا قصور ہے جو بیٹے سے عزت کروانے کی ہمت بھی نہ کر سکی۔

ایک بیٹی جو باپ، دادی اور بھائی بہن کی بے اعتنائی ماں کے آنے کی امید پر سہہ رہی ہے کیا یہ اس کا قصور ہے کہ وہ دونوں بھائی بہن جیسی رنگت اور ذہانت لے کر پیدا نہیں ہوئی یا اس کی ماں قصور وار ہے جو اولاد کی خاطر ساس کی زیادتیوں پر سمجھوتہ نہ کر سکی۔ اس کا باپ قصور وار ہے جو اپنے سگے بچوں میں انصاف نہ کر سکا یا اس کی دادی جو بیٹے کی زندگی میں بہو کی شراکت برداشت نہ کر سکی اور بہو سے بیر باندھ کر بیٹے کی زندگی تو خراب کی ہی، اس کی اولاد میں بھی فرق ڈال کر نفرت کی بنیاد رکھ دی، آخر قصور وار ہے کون......؟"

☆☆......☆......☆☆

## قارئین متوجہ ہوں

☆ اکثر قارئین کی شکایات کے مطابق کہ یہاں پر پرچہ دستیاب نہیں ہے۔

☆ ایجنٹ کی سہولت کے لیے پرچہ نہ ملنے کی صورت میں آپ ادارے سے رابطہ کریں۔

☆ اپنے شہر اور علاقے کا نام۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر پرچہ دستیاب نہیں ہے، ہو سکے تو بک اسٹال کا کنٹیکٹ نمبر لکھ کر ادارے کو بتائیں۔

☆ ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ ردا آپ کو بروقت مل سکے۔

**رابطہ کریں**

ردا پبلی کیشن

021-34535726

**خط و کتابت کا پتہ:**

D-129۔ بلاک 2

پی۔ای۔سی۔ایچ۔سوسائٹی، کراچی

سدرہ شاہین

افسانہ

# کٹورا

"یہ لے دال! اس کو صاف کر کے پکا لے وہ مجھے رانی کے گھر سے آتے ہوئے گلی سے پچیس روپے ملے تھے تو دال لے آئی کہ اگر دین آج آٹا لے آیا تو روٹی کے ساتھ دل کھانے سے کچھ منہ کا ذائقہ بدلے۔"

لمبی دھڑنگی، ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی جسم پر فاقوں کا لیبل لگائے آنکھوں میں بے بسی لیے ہوئے بی بی کی ساس نے بی بی کو چھوٹا سا شاپر تھماتے ہوئے کہا جس میں کوئی مٹھی بھر دال تھی۔

بی بی نے خاموشی سے شاپر لیا۔ دال کو گھر کے واحد برتن واحد سہارے کٹورے میں ڈالا اور اس میں سے خراب دانے نکالنے لگی۔

بی بی اس گھر میں مہینہ پہلے ہی تو دلہن بن کر آئی تھی۔ دلہن بھی ایسی جس کے نہ کوئی، لاڈ، نہ چاؤ اور نہ مان نہ ہی رسم۔ بس ماں بیٹا جا کر نکاح پڑھا کر لے آئے۔ یہاں آ کر نہ کوئی حسین خیال اگر کوئی احساس اسے گدگدا بھی دیتے تو اگلے ہی لمحے دین کے چہرے پر چھائی غم کی پرچھائی، روزی روٹی کی فکر اس کے احساسات کو برف کی مانند سرد کر دیتی، اسے یاد تھا۔ شادی کے چند دن بعد انہوں نے پاپے کھائے تھے، وہ بھی کسی شاہی کھانے کی طرح وہ بھی کٹورے میں پانی سے بھگو بھگو کر اور پھر کچھ دن فاقے کاٹے تھے آج کل بھی وہ صرف فاقے ہی کھا رہے تھے کیونکہ دین کو کوئی دیہاڑی نہیں مل رہی تھی اگر کبھی قسمت کی یاوری ہوتی تو دین کو اچھی دیہاڑی مل جاتی اور وہ آٹے کے ساتھ دال بھی لے آتا اور ان کے وارے نیارے ہو جاتے اور وہ دال روٹی کسی شاہی کھانے کی طرح کھاتے اگر کبھی کام تھوڑا ملتا تو آٹا لے آتا کہ چلو پیٹ میں روٹی تو جائے اکیلی اور اگر ایسا بھی نہ ہوتا تو اکیلی دال لے آتا کہ خالی پیٹ کی صدائیں روکنے کے لیے کچھ تو ہو اور دال کے ہمیشہ تین حصے بنتے جن کو وہ لوگ اپنی قسمت کا رزق سمجھ کر کھا لیتے، کبھی ایسا دن بھی آتا کہ دین شہر کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا مگر اسے کوئی کام نہ ملتا۔ بجری، ریت، گاڑیوں کے شیشے صاف کرتا حتیٰ کہ کسی ہوٹل کے گندے غسل خانے بھی صاف کر دیتا کہ اسے اپنوں کا پیٹ بھرنا تھا، اپنی بوڑھی لاغر ماں کے جسم کی توانائی کو برقرار رکھنا تھا، اپنی نئی نویلی دلہن کی آنکھوں کی روشنیوں کو بجھنے نہیں دینا تھا مگر جب وہ خالی ہاتھ تھکا ماندہ کسی اداس پرندے کی طرح گھر کو لوٹتا جو دن بھر دانے دونکے کے لیے ادھر ادھر منڈلاتے رہتے ہیں تو اس کی ماں کا لاغر جسم اور بھی ڈھے سا جاتا جیسے کسی نے بچی کھچی توانائی بھی نچوڑ ڈالی ہو اور بیوی کی آنکھوں کے دیپ ایسے بجھ جاتے جیسے چودھویں کے چمکتے چاند کے آگے کوئی سیاہ بادل آن ٹھہرا ہو مگر وہ پھر بھی کوئی صدا نہ کرتے اور نہ ہی کراہتیں بلکہ گھڑے کا پیٹ خالی کر کے اپنا پیٹ بھرتے اور رب کا شکر ادا کرتے کہ چلو منہ کی خشکی تو دور ہوئی۔ اب تو دین اور ساس کی طرح بی بی کے جسم پر بھی ایک لرزا سا طاری رہنے لگا تھا مگر آج دو دن کے فاقے کے بعد دال دیکھ کر دل کو ذرا ڈھارس سی ہو گئی تھی۔

دال چنتی بی بی کے کانوں میں ذرا سی آہٹ کی آواز آئی



تو دل کی دھڑکنوں میں ذرا سا ارتعاش ہوا اور دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئیں۔ دل کی دھڑکنوں کو سنبھلتے، سنبھلتے کٹورا زمین بوس ہو گیا اور ساری دال زمین کی دھول چاٹتی نکل گئی۔ وہ سمجھی تھی کہ دین آ گیا ہے مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ دین نہیں آیا بلکہ اس کی ساس سے اس کی شامت ضرور آ گئی تھی۔

"نی خصم نو کھائیں۔ یہ کیا کر دیا؟"

اس کی ساس لپک کر آئی، اس کی گھاس چٹیا کو پکڑ کر زور کا جھٹکا دیا اور پھر چھوڑتے ہی کمر پر ایک دھموکا بھی جڑ دیا۔ بی بی کو لگا جیسے اس کی گردن ہی ٹوٹ گئی ہو، بی بی نے بے بسی سے زمین کی دھول مٹی کو دیکھا جوان کی بھوک کے آخری سہارے کو کھا گئی تھی اور جس کی وجہ سے آج اس نے پہلی بار اپنی ساس سے مار کھائی تھی۔

"چل اب چن اس دال کو۔"

ساس نے حکم صادر کیا اور اپنے کھچڑی بالوں کا جوڑا بنایا اور باہر نکل گئی۔

تب ہی مغرب کی اذان کی صدائیں گونجنے لگیں۔ بی بی نے اپنا میلا کچیلا دوپٹہ سر پر اوڑھا اور لبوں کو کچلتی دال چننے لگی۔ سلور کا چھوٹا سا کٹورا بھرتے، بھرتے اس کے نینوں کے بڑے بڑے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے۔

جب تک وہ دال چن کر فارغ ہوئی سورج کی آخری نارنجی کرنیں بھی کہیں دور جا سوئی تھیں اور چودھویں کے چاند کی روشنی کا راج گھر کی در و دیوار پر ہو چکا تھا اپنے آنسو چھپاتی بی بی پرانی مٹی سے بنی ہنڈیا میں ٹالی کے پتوں سے دال پکانے لگی، پکانے بھی کیا صرف ابالنے لگی۔ کیونکہ اس کے گھر کی غربت، مرچ مسالے، ٹماٹر، دھنیا سب کھا گئی تھی۔ بچا تھا تو صرف تھوڑا سا نمک، اس نے مرچ مسالہ، ٹماٹر اور دھنیا سب کی جگہ برائے نام نمک ڈالا جب اس کے سر کا سرتاج دین اپنے گھر کی بوسیدہ ٹاٹ والی دہلیز پار کرتا ہوا اندر داخل ہوا، بی بی کی بے اختیار نگاہیں دین کے ہاتھوں میں کچھ ڈھونڈنے لگیں مگر واپس ناکام پلٹ آئیں کیونکہ اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی کہ آج پھر دال کے ہی تین حصے ہوں گے۔ اس نے جلدی سے کٹورا اٹھایا، گھڑے سے پانی بھر کے دین کو پیش کر دیا۔ دین کے پانی پی چکنے کے بعد اس نے کٹورے میں دال ڈالی اور اس کے تین حصے کر ڈالے جس میں دین کا حصہ ہمیشہ کی طرح سب سے زیادہ، ساس کا اس سے کم اور خود بی بی کا سب سے کم۔ پھر اس نے کٹورا دین کے آگے رکھ دیا۔ جو چپ سادھے اپنی بے بسی پر ماتم کناں تھا، اس نے حسرت سے کٹورے میں بے حصوں کو دیکھا۔ پھر اپنا حصہ انگشت شہادت سے کھانے لگا۔ جی تو چاہا کہ تینوں حصے کھا جائے مگر پھر اپنی بوڑھی لاغر ماں اور اپنی نئی نویلی دلہن کا خیال آتے ہی کٹورا اپنی غم زدہ ماں کو بڑھا دیا۔ آخر میں باری بی بی کی تھی جس نے آنسوؤں سے لبریز نینوں کے کٹوروں سے کٹورے میں دیکھا، جہاں اس کا حصہ پڑا تھا جو بی بی کو لگا اس کی بے بسی پر قہقہے لگا رہا ہو۔ اس نے اپنا غم دباتے اپنی انگشت شہادت کو چچ میں ڈالا اور اپنا پیٹ دال کے چند دانوں سے بھرنے کی ناکام کوشش کی۔

دال کے چند دانے کھا کے وہ خاندان رب تعالیٰ کا شکر ادا کر کے سو چکا تھا۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب بی بی کی آنکھ بھوک سے ماتم کرتے پیٹ کی آہ و بکا پر کھلی مگر وہ کھاتی بھی تو کیا، پھر اس کی بے اختیار نظر کچے گھڑے اور کٹورے پر جا ٹھہری۔ وہ بھوک کی وجہ سے لرزتے وجود کو گھسیٹتی اس گھڑے اور کٹورے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے لپک کر کٹورا اٹھایا جوان کے پیٹ کی بھوک کی کل کائنات تھا اور پھر پانی سے بھر کے پی ڈالا۔ اس کی بند ہوتی آنکھیں ذرا سی کھلیں، پیٹ کی کربناک صدائیں ذرا بھر کو رکیں، خشک لب ذرا سے تر ہوئے تو اسے بے اختیار کٹورے پر جی بھر کے پیار آیا اس نے کٹورے پر اپنے نازک لب رکھ دیئے کہ یہ ان لوگوں کا غم گسار تھا۔ ان کے فاقوں کے دنوں کا ساتھی تھا۔ نہ جانے کتنے ہی دنوں کے فاقے کے غم ابھی اور اس کٹورے نے بانٹنے تھے۔ ان کا آخری وسیلہ بننا تھا۔ نہ جانے کتنے ہی فاقوں اور......!!

......☆......

سائرہ عبدالغفار

افسانہ

# یقینِ محبت

اشعر اور رازی کی ملاقات ایئر پورٹ پر ہوئی
تھی بالکل اتفاقیہ طور پر مگر تھوڑی ہی دیر میں دونوں یوں
گھل مل گئے جیسے نجانے کتنے عرصے کی شناسائی ہو۔
"بھئی تم میرے گھر چلو لنچ پر آج میری بیگم نے



خوب اہتمام کرر کھا ہوگا''۔اشعر نے مسکرا کر آفر دی۔
''ارے نہیں یار! خواہ مخواہ بھابی کو تکلیف ہوگی اور ویسے بھی''۔رازی ذرا دیر کو چپ ہوا۔
''ویسے بھی کیا؟''
''ویسے بھی مجھے کباب میں ہڈی بننے کا کوئی شوق نہیں ہے''۔رازی کی بات پر اشعر نے بے اختیار قہقہہ مارا۔
''ارے میاں رزاق الدین......''
''رازی!''رازی فوراً بولا۔
''پلیز مجھے رازی بلاؤ میرے سبھی اپنے مجھے رازی ہی بلاتے ہیں''۔اشعر نے اسے چاہت سے دیکھا تھا' ابھی محض دو گھنٹے قبل ہی تو ملا تھا اور ابھی سے اپنا بھی بن گیا تھا۔
''ٹھیک ہے بھئی رازی! آپ کباب میں ہڈی مت بنیئے مگر یہاں آپ کی رہائش کہاں ہے؟ اپنوں سے میل ملاقات تو رہے گی ناں؟''اشعر نے ایک آنکھ میچتے ہوئے پوچھا۔
''بالکل ملاقات کیوں نہیں رہے گی' ملاقات تو ضرور ہوگی' میں نے تمہارا نمبر اپنے پاس محفوظ کرلیا ہے' ہوٹل میں چیک ان کرتے ہی تمہیں میسج کردوں



گا''۔ رازی بولا۔
''چلو ٹھیک ہے پھر ملیں گے''۔ اشعر اس سے ہاتھ ملاتا ہوا چلا گیا' رازی نے ایک گہری سانس خارج کی اور ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر آ گیا۔

☆☆☆☆

رزاق الدین عرف رازی نے کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیمسٹری کرنے کے بعد باہر کا رخ کیا تھا' اس کے تایا کا کینیڈا میں اپنا سپر اسٹور تھا جسے انہوں نے کڑی محنت اور سالوں کی ریاضت سے کھڑا کیا تھا' رازی کو وہ اپنا داماد بنانا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے شروع سے ہی اسے اپنے بہت قریب رکھا تھا' تایا کی اس سے محبت مثالی تھی وہ چھٹیوں میں تقریباً ہر سال کینیڈا کا چکر لگا آتا تھا' خنساء اس کی تایا زاد بے انتہا خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھی رازی خود کو کینیڈا کی محبت بھری ہواؤں کے حصار میں قید محسوس کرتا تھا' مگر اس حصار میں ایک دراڑ پڑ گئی تھی' ایم ایس سی کے دوران رازی کی ایک کلاس فیلو صوبیہ نے اس سے اظہار محبت کیا تھا رازی اس کے اس بولڈ اقدام پر بھونچکا اور حیران رہ گیا تھا۔
''کیا ...... کیا کہا تم نے ......؟'' رازی بڑی مشکلوں سے پوچھ پایا تھا۔
''یہی کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور آپ سے شادی کی خواہش مند ہوں''۔ صوبیہ بہت آرام سے نظریں جھکائے اپنا مدعا بیان کر رہی تھی۔
''تم ہوش میں ہو نا''۔ رازی نے معصومیت سے پوچھا تو صوبیہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔
''یہ ناممکن ہے''۔ رازی نے شدومد سے دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے کہا وہ رو دینے سا ہو رہا تھا۔
''محبتوں میں بڑی شدت ہوتی ہے رازی صاحب اور یہ جذبہ ایسا زور آور ہوتا ہے کہ اچھے اچھوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے''۔ صوبیہ دھیمے سروں میں کہتی وہاں سے چلتی بنی اور رازی وہ ہونق بنا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆☆

''اتنے سالوں بعد کراچی کیسے آنا ہوا؟'' اشعر کو رازی نے اپنے ہوٹل میں بلوایا تھا۔
''بس کسی کی یاد کھینچ لائی''۔ رازی نے چھری سے سلائس کاٹتے ہوئے مبہم لہجے میں کہا۔
''اوہو! آپ بھی شوق فرماتے ہیں''۔ اشعر شوخ ہوا۔
''نہیں شوق تو نہیں فرماتا مگر بس سوچتا ہوں جانے کہاں ہو گی' کیسی ہو گی؟'' رازی بے چین لہجے میں بولا۔
''تو یار! پوچھ لو ناں؟ رابطہ کرو اس سے''۔ اشعر پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔
''کیسے کروں؟'' رازی کے لہجے میں کرب تھا۔
''کیسے کروں مطلب؟'' اشعر نا سمجھی سے بولا۔
''مطلب یہ کہ میں یہاں سے سات سال پہلے چلا گیا تھا اور یہاں میں اسے ڈھونڈنے کے لئے آیا ہوں تو بالکل خالی ہاتھ ہوں' نہ میرے پاس اس کا نمبر ہے نہ گھر کا پتہ' مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں اسے کیسے تلاش کروں گا''۔ رازی نے ایک ہاتھ سے سر تھام لیا تھا۔
''اوہ ...... آپ تو مجنوں کی اولاد نکلے میاں جی!'' اشعر تاسف سے بولا تو رازی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
''چلو ناشتہ کرو' کوئی جگاڑ کرتے ہیں''۔ اشعر بولا تو رازی کو کچھ تسلی محسوس ہوئی۔

☆☆☆☆

رازی یونیورسٹی گیا اور وہاں اس نے صوبیہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی' وہاں سے صوبیہ کا جو پتہ ملا وہاں سے وہ فیملی چار سال قبل کہیں اور شفٹ ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆

بالآخر آج اشعر زبردستی رازی کو اپنے گھر لے ہی آیا تھا وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

"ارے یہ تم ہو ناں؟ کیا نام تھا تمہارا ریاض...... اسی قسم کا کوئی نام تھا تمہارا؟" رازی حیرت سے گنگ کھڑا صوبیہ کو دیکھ رہا تھا' وہ بلاشبہ صوبیہ ہی تھی۔

"صوبیہ تم؟ واٹ آ سرپرائز"۔

"ارے صوبیہ تم ملیں رازی سے؟" اشعر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں رزاق الدین عرف رازی نام تھا تمہارا...... ارے اشعر میں ان کی کلاس فیلو رہ چکی ہوں"۔ صوبیہ نے تفصیل بتائی تو اشعر بولا۔

"ارے واہ پھر تو رازی کو بالکل بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوگی"۔ رازی کے چہرے پر بے حد دھیمی اور پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اگلے ہی لمحے معدوم ہوگئی۔

"ارے صوبیہ یاد آیا' موصوف رزاق الدین عرف رازی یہاں کسی لڑکی کی تلاش میں وارد ہوئے ہیں"۔ لنچ کے دوران اشعر نے صوبیہ کو بتایا۔

"اچھا......" صوبیہ نے مسکراتی نظروں سے رازی کو دیکھتے ہوئے لمبا سا اچھا کہا' رازی کے حلق میں نوالہ اٹک گیا' اشعر نے فوراً پانی پیش کیا' رازی دانستہ صوبیہ سے نظریں چرا رہا تھا۔

"تم لوگ تو ایک ہی کلاس میں تھے یقیناً تم بھی جانتی ہوگی اس لڑکی کو' رازی کی مدد کرو ناں بھئی"۔ اشعر نے صوبیہ کو کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

"ارے نن...... نہیں...... وہ...... وہ لڑکی یونی کی نہیں تھی"۔ رازی بمشکل بولا' صوبیہ مسکرانے لگی۔

☆☆☆☆

اگلے دن رازی اپنا سامان پیک کر رہا تھا' صوبیہ اسے یوں ملے گی اتنی خوش باش اتنی سکھی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا

☆☆☆☆

جس دن وہ کراچی سے کینیڈا جا رہا تھا اس دن صوبیہ نے اسے فون کر کے جانے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔

"پلیز مت جاؤ! میں مر جاؤں گی"۔ اس کی آواز بھیگ رہی تھی رازی کو لگا وہ کانپ بھی رہی ہے۔

"دیکھو صوبیہ! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اب دوبارہ کہہ رہا ہوں کہ میں کسی اور سے کمیٹڈ ہوں اور میں اسی سے شادی کروں گا' تم بہت اچھی لڑکی ہو تمہیں کوئی بھی اچھا لڑکا مل جائے گا"۔ رازی رسان سے بولا۔

"کیا تم اچھے لڑکے نہیں ہو؟" معصومیت سے پوچھا گیا۔

"نہیں...... میں اچھا لڑکا نہیں ہوں"۔

"رازی کچھ محبتیں اتنی زور آور ہوتی ہیں کہ وہ خود کو منوا کر ہی دم لیتی ہیں اور ہمارے ہر جذبے' ہر خیال ہر سوچ پر حاوی ہو جاتی ہیں' تم جانا چاہتے ہو چلے جاؤ مگر یاد رکھنا کہ میرے آنسو بار بار تمہارے جذبوں' تمہارے خیال اور تمہاری سوچوں پر دستک دیں گے' آج شام کو چار قل پڑھ کر مجھے بخش دینا' کیونکہ میرا اب زندہ رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے"۔

صوبیہ نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا تھا رازی نے اس کا نمبر ملانے کی کوشش کی مگر اس کا موبائل آف تھا۔ کینیڈا پہنچ کر وہ سب بھول بھال گیا' خنساء کے ساتھ اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی' شادی کے بعد اس کی زندگی بے حد حسین ہوگئی تھی' شادی کے چھ ماہ بعد خنساء اور رازی کی پہلی بار لڑائی ہوئی تھی تب خنساء کے رونے پر بے اختیار اسے صوبیہ یاد آئی اور اس بری طرح یاد آئی کہ وہ سر پکڑ

کر بیٹھ گیا‘ اس کے بعد صوبیہ کی یاد اس کے آخری الفاظ مرنے کی دھمکی اپنی محبت واویلا سب بری طرح یاد آتا رہا‘ جب بات برداشت کی حد سے باہر ہونے لگی تو وہ بزنس کا بہانہ کر کے پاکستان آ گیا۔

☆☆☆☆

ابھی وہ سامان پیک کر ہی رہا تھا کہ فون بجا‘ انجانا نمبر دیکھ کر اس نے یس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگا لیا۔

”ہیلو“۔

”ہیلو رازی! میں صوبیہ بات کر رہی ہوں“۔

رازی نے بے اختیار ایک گہرا سانس کھینچا۔

”جی!“ رازی کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟“ رازی کو سمجھ نہیں آئی کہ کیا جواب دے۔

”بولو ناں مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟“ صوبیہ نے اصرار کیا۔

”تمہاری محبت اتنی زور آور تھی کہ...... میرے جذبوں سوچوں اور خیالوں پر حاوی ہو گئی تھی اس لئے......“ رازی کا دل چاہ رہا تھا کہ موبائل دیوار میں دے مارے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے‘ اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔

”میری محبت اتنی زور آور نہیں تھی رازی! میرا یقین مانو...... اگر اس میں دم ہوتا تو وہ تمہیں اس لمحے بیڑیاں پہنا دیتی تم تو میرے مرنے کا بین کر بھی نہیں رکے‘ میری محبت تو محض ایک ڈھکوسلہ تھی‘ بھرم بازی تھی‘ دھوکہ تھی‘ فریب تھی‘ بالکل بودی محبت تھی میری“۔ صوبیہ طنزیہ ہنسی۔

”تم نے خودکشی نہیں کی؟“ رازی نے پوچھا۔

”بزدل لوگ خودکشی نہیں کیا کرتے‘ میں بھی نہیں کر پائی اشعر کا پرپوزل آیا تو سوچا کہ یہ بھی تو خودکشی ہی ہے بس فرق اتنا ہی ہے کہ میرے کے بعد روتے اور میں خوش مطمئن رہتی جبکہ اشعر سے شادی کرنے کے بعد سب خوش و مطمئن تھے اور میں روتی رہتی مگر......“

”مگر؟“

”مگر اشعر کی محبت نے اس کے جذبوں نے مجھے فتح کر لیا۔ اس کی محبت میں اتنی صداقت تھی کہ میں نے طمانیت و سرشاری محسوس کی‘ خوشی اور سکون سب مل گیا“۔ صوبیہ کی آواز فون پر بھی مسکراتی محسوس ہو رہی تھی۔

”پھر تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا آخر؟“ رازی رو رہا تھا۔

”میں نے...... رازی ٹھکرایا تو تم نے تھا مجھے‘ میری انا‘ میرے پندار کو ٹھیس تم نے پہنچائی تھی‘ میں نے کیا کیا؟“

”وہ آنسو تمہارا دیا ہوا تحفہ تھے رازی اور امانت میں خیانت نہیں کرنی چاہئے ناں“۔ صوبیہ آرام سے بولی۔

”تم اپنی بیوی کے ساتھ خوش نہیں ہو؟“ لمحاتی توقف کے بعد صوفیہ نے پوچھا۔

”میں بہت خوش تھا بہت زیادہ...... مگر......“

”مگر؟“

”مگر پھر تم بیچ میں آ گئیں...... تم نے میرا سکون میری خوشیاں سب برباد کر دیں صوبیہ! سب برباد کر دی ہیں“۔ رازی نے ایک مکا دیوار میں دے مارا۔

”رازی! اپنے حصے کا بھگتان تم بھگت چکے‘ جاؤ لوٹ جاؤ تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی‘ اسے اپنے جذبوں کا یقین دلاؤ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی“۔ صوبیہ نے فون رکھ دیا تھا۔ رازی نے پیکنگ ختم کی اور ایئر پورٹ کی طرف قدم بڑھا دیئے اسے یقین تھا کہ وہ خنساء کو منا لے گا اور خنساء اس کی محبتوں پر یقین کر لے گی۔

☆☆......☆☆......☆☆

قمروش شہک

سلسلے وار ناول

# صحرائوں کی گلیوں میں عشق

مگراز ابیلا نے ان کا اشارہ ہاتھ سے ہوا میں اڑا دیا تھا۔

"ذکی سے اب کوئی پردہ نہیں ہے سنیتا بائی، انیجولی یہ عابد جوفا کے ساتھ پارٹنر شپ کی آفر بھی دینے آیا تھا۔"



''اچھا سچ''۔ سنیتا بائی خوشی سے نہال ہو گئیں۔
''اچھا میں یہ کہنے والی تھی کہ میرا بینک اکاؤنٹ خالی ہے سید آغا شہباز علوی کو کہو میرے اکاؤنٹ میں خطیر رقم ڈلوائیں''۔
''ٹھیک ہے آج ہی اس بڈھے سے بات کرتی ہوں''۔ وہ مکروہ ہنسی کے ساتھ بولیں اور پھر ذکی کو دیکھا۔
''اور ذکی میاں کیسی لگی تمہیں ہماری محفل؟''
''بیوٹی فل''۔ ذکی نے چمکتی گہرے آنکھیں سنیتا بائی پر ڈالیں۔
''تو پھر دھندے کی بات ہو جائے؟''
''آف کورس، یہ لیں یہ میرا پہلا چیک ہماری پہلی ملاقات کا''۔ ذکی نے اپنی جیب سے پچاس لاکھ کا چیک

## قسط نمبر 3



سیتابائی کے آگے کیا جسے سیتابائی نے کسی بھوکی چیل کی طرح جھپٹا تھا۔
پچاس لاکھ کا چیک دیکھ کر سیتابائی کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی۔
''ذکی میاں! یہ ملاقاتیں ہر روز ہونی چاہئیں''۔
''ضرور...'' ذکی نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔
''پھر آگے کیا ارادہ ہے ڈیئر؟'' ذکی نے ازابیلا کو دلکشی سے دیکھا تھا۔
''آگے یہ ارادہ ہے کہ اب تمہاری ملاقات جلد عابد جوفا سے ڈائریکٹ کرواؤں گی، کل ہی تمہاری اور عابد جوفا کی میٹنگ کرواتی ہوں''۔ ازابیلا نے ایک جان لیوا ادا سے اس کے چہرے پر اپنی انگلی پھیری تھی۔
''او کے پھر چلیں''۔
''کیوں آج رات یہیں رک جاؤ، اس رات کو آج ہم دونوں رنگین بنادیں، شراب بھی ہے شباب بھی ہے اور جو یہ دونوں مل جائیں تو رات حسین و جوان ہوسکتی ہے''۔ ازابیلا اور تھوڑا اس کے پاس کھسکی تھی۔
سیتابائی اس دوران وہاں سے کھڑی ہوگئی تھی اور سب لوگوں کو ایک ایک کر کے رخصت کر رہی تھی۔
ذکی نے نہایت خوبصورتی سے اس کے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا اور اپنی مٹھی میں زور سے دبا کر نہایت جارحانہ انداز میں اس کو اپنی سمت کھینچا تھا۔
''بہت جلد وہ رات آئے گی جب صرف میں اور تم ہوں گے جہاں ہوا کا گزر بھی نہیں ہوگا اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہارے جسم کو ہوا بھی چھوئے اس لئے اس رات کا انتظار کرو''۔ ذکی نے ازابیلا کو جس جارحانہ انداز میں اپنے سے قریب کرلیا تھا اس سے کہیں زیادہ اسے خود سے الگ بھی کیا تھا کہ وہ پیچھے مخمل کے گاؤ تکیے سے تکی تھی بلکہ وہیں نیم دراز بھی ہوگئی تھی۔
''ہائے میرے ٹام کروز تمہاری یہی ادائیں یہ بیٹھا در دمیرا سب کچھ لے گیا''۔
ذکی نے مسکراتی نظر اس پر ڈالی اور چہرے کا رخ موڑ لیا تھا۔

☆............☆............☆

آج صبح سے ہی بلقیس آراء نے اس کو ہدایتیں دینا شروع کر دی تھیں۔ آج شام کے ناشتے میں انہوں نے اجیارہ کے لئے آنے والے رشتے والوں کے لئے سارا ناشتہ باہر سے ہی منگوایا تھا۔ اسے اتفاق کہہ لیں یا بلقیس آراء کے لئے خوش قسمتی کہ صبح آٹھ بجے آفس جاتے شہیر کے ساتھ دعا بھی تیار ہو کر اپنے میکے چلی گئی تھی۔
''شکر ہے تمہاری بھاوج نہیں ہے آج''۔ بلقیس آراء نے آسمان کی طرف دیکھ کر شکر ادا کیا تھا۔
''اماں! ایسے کیوں کہہ رہی ہیں''۔ اجیارہ نے اپنے دوپٹے کو سر پر ٹھیک سے اوڑھا تھا۔
''تم رہنے دو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا، ایک سال میں بہت جان گئی ہوں اس غریب کی بچی کو''۔ بلقیس آراء کے لب و لہجے میں دعا کے لئے غصہ تھا۔
''پتہ نہیں اماں! تم کیا کہہ رہی ہو اور کیا سوچ رہی ہو، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا''۔ وہ الجھن بھری نظروں سے بلقیس آراء کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔
''تم رہنے دو اور جاؤ سارا ناشتہ ایک بار پھر ٹرالی میں ٹھیک سے دیکھ لو، اگر سموسے یا رول ٹھنڈے ہو گئے

# یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

**Click on http://paksociety.com to Visit Us**

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



ہیں تو مائیکروویو میں دوبارہ گرم کر لینا، وہ لوگ آتے ہی ہوں گے"۔ بلقیس آراء جلدی جلدی کہتی ہوئی وہاں سے ڈرائنگ روم میں آئی تھیں تاکہ ڈرائنگ روم کو ایک بار اور دیکھ لیں کہ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔ بلقیس آراء نے صوفے پر چوکور، تکون اور دل کی شیپ میں رکھے گئے خوبصورت سے کشن کو ایک بار پھر ٹھیک کیا تھا کہ اسی اثنا میں دروازے پر بیل ہوئی تھی، بلقیس آراء نے اپنا کاٹن کا دوپٹہ ٹھیک کیا اور خوشی خوشی دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔

"السلام علیکم!" انہوں نے دروازہ کھولا جہاں زینت کے ساتھ دو خواتین اور ایک پیاری سی اجیارہ کی ہم عمر لڑکی تھی۔

"وعلیکم السلام!" ان میں سے ایک خاتون نے خوشدلی سے جواب دیا تھا۔

"آیئے ناں اندر"۔ بلقیس آراء سائیڈ میں ہوگئی تھیں۔ زینت ان تینوں خواتین کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کے خود اندر کچن میں آئی تھی۔

"ماشاءاللہ بہت پیاری لگ رہی ہے ہماری اجیارہ"۔ زینت نے اجیارہ کے گلابی گال کی بلائیں لی تھیں۔

"اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے، آمین"۔ ساتھ ہی اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے دل سے دعا دی تھی۔

"بلقیس آراء بہن! بہت چھانٹ کے یہ رشتہ میں نے صرف تمہاری بیٹی کے لئے نکالا ہے"۔ زینت نے اجیارہ کو مسکرا کے دیکھتے ہوئے پاس کھڑی بلقیس آراء سے کہا۔

"زینت! اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا اللہ میری بچی کا نصیب اچھا کرے مجھے اور کیا چاہیے"۔

"انشاءاللہ بہت خوش رہے گی ہماری اجیارہ، بلقیس آراء بہن تم فکر ہی مت کرو یہ لوگ بہت اچھے ملنسار خوش اخلاق لوگ ہیں اور لڑکا وہ تو سونا ہے سونا، ہماری اجیارہ کو نا صرف بہت خوش رکھے گا بلکہ ہر خواہش بھی پوری کرے گا، یہ لوگ زیادہ انتظار نہیں کریں گے شادی کرنے میں جلدی ہی کریں گے"۔

"اچھا ہے زینت! میں بھی یہی چاہتی ہوں جلد از جلد اجیارہ کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں"۔

"ہوں..." زینت نے بلقیس آراء کی بات کی تائید کی۔

"اچھا اجیارہ! تو انہیں تصویر میں پسند آگئی ہے لڑکے نے بھی اوکے کہہ دیا ہے، آج سمجھو صرف فارمیلٹی پوری کرنی ہے، چلو آجاؤ اجیارہ بیٹی"۔ اجیارہ کے دل کی کیفیت ہی عجیب سی ہو رہی تھی، پہلی دفعہ اس کا رشتہ آیا تھا پہلی دفعہ وہ کسی کے سامنے اس طرح جا رہی تھی تو دل میں کچھ ڈر کچھ خوشی کے ملے جلے جذبات تھے۔

اجیارہ، زینت اور بلقیس آراء کے ساتھ اندر داخل ہوئی، اجیارہ کو دیکھ کر تینوں خواتین کی آنکھوں میں پسندیدگی کے واضح رنگ تھے۔

"ماشاءاللہ! تصویر میں جتنی پیاری لگ رہی تھیں حقیقت میں اس سے زیادہ خوبصورت ہو"۔ لڑکے کی والدہ نے کہا، انہوں نے تو زینت کو آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھ کر فورا اوکے بھی کر دیا تھا۔

"کیا کرتی ہو بیٹا آپ؟"

"وہ جی سیدہ آپا میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ..." اجیارہ سے پہلے زینت بول اٹھی تھی۔

"ہاں ہاں زینت ہم جانتے ہیں کہ آپ نے ہمیں اجیارہ بیٹی کے بارے میں سب بتا دیا تھا مگر ہم اجیارہ سے سننا چاہتے تھے"۔ سیدہ بیگم (لڑکے کی والدہ) نے مسکرا کے نرمی سے کہا تھا، زینت پرسکون ہو کر خاموش ہو

گئیں۔

''بتایئے بیٹی کیا کرتی ہیں آپ؟''

''جی پچھلے سال ہی میں نے انٹر کمپلیٹ کیا ہے''۔

''آگے گریجویشن کیوں مکمل نہیں کی؟'' ساتھ آئی لڑکی نے پوچھا۔

''جی... وہ...'' اجیارہ نے گھبراتے ہوئے بلقیس آراء کو دیکھا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ و ہچکچاہٹ کے صاف رنگ نمایاں تھے جوان تینوں خواتین سے پوشیدہ نہیں رہ سکے تھے۔

''ارے رے سوہا دیکھو اجیارہ گھبرا گئی ہیں، بیٹا کوئی بات نہیں ہمیں سب معلوم ہے، زینت نے آپ لوگوں کے بارے میں سب بتایا ہے، ہمارا مقصد آپ کو تنگ کرنا بالکل نہیں تھا''۔ سیدہ بیگم نے کہا۔

''جی اجیارہ! ہمیں آپ بہت پسند آئی تھیں مجھے اپنے ہینڈسم بھائی کے لئے آپ جیسی ہی بھابی چاہئے''۔ سوہا نے مسکراتے ہوئے اجیارہ کا شرمایا گھبرایا چہرہ دیکھا۔

''رفعت آپ کچھ نہیں کہیں گی؟'' سیدہ بیگم نے اپنی نند کی خاموشی نوٹ کی تھی۔

''کیوں نہیں سیدہ بھابی! میں تو آپ لوگوں کے چپ ہونے کا انتظار کر رہی تھی''۔

بلقیس آراء پرسکون و مطمئن ہوگئی تھیں ان کی بیٹی بہت خوش رہے گی ان لوگوں میں جا کر جو نہایت ہی سلجھے ہوئے تھے۔

اجیارہ باہر آئی کچن کی طرف اور ٹرالی میں پلیٹوں کو پھر سے صاف کر کے لے جانے ہی لگی تھی کہ اچانک سے دعا آ گئی۔

''ارے دعا بھابی! اچھا ہوا آپ آ گئیں''۔

''خیریت ہے اندر ڈرائنگ روم میں کوئی آیا ہے''۔ دعا نے ناشتے سے بھری ٹرالی دیکھنے کے بعد اجیارہ کی تیاری دیکھی۔

''آپ اندر چلیے، آپ کو سب پتہ چل جائے گا''۔ اجیارہ بہت خوش تھی اور اس کی یہ خوشی دعا سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

''بتاؤ تو آخر معاملہ کیا ہے اتنی خوش لگ رہی ہو جیسے گوہر نایاب ہاتھ لگا ہو''۔ انہوں نے طنزیہ نظروں سے اجیارہ کے گلابی چہرے کو دیکھا تھا مگر اجیارہ اتنی خوش تھی کہ اس کی طنزیہ نظروں، طنزیہ باتوں کو محسوس ہی نہیں کر سکی تھی۔

''وہ ایکچولی زینت خالہ میرا ایک رشتہ لائی ہیں بہت اچھے لوگ ہیں''۔

''بلقیس آراء بہن! ہمیں آپ کی بیٹی بہت پسند آئی ہے اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے ہمارے پاس، ہماری کوئی ڈیمانڈ کوئی خواہش نہیں سوائے اس کے کہ آپ ہماری جھولی میں اجیارہ بیٹی ڈال دیجئے''۔ رفعت نے کہا تھا جس کی تائید سیدہ بیگم نے بھی کی تھی۔

''یہ تو آپ لوگوں کا بڑا پن ہے رفعت بہن! مگر مجھ سے جو ہوگا میں اجیارہ کو دوں گی''۔ بلقیس آراء کے دل میں اور عزت بڑھ گئی تھی ان لوگوں کے لئے۔

''چلیں پھر جیسی آپ کی خوشی، لیکن ایک بات کہ میں جلد از جلد شادی کروں گی یہ میری بیٹی سوہا ہے جس کا رشتہ رفعت کے بیٹے کے ساتھ بچپن سے ہی طے ہے تو رفعت بھی چاہ رہی ہیں وہ اپنی بہو اپنے گھر

لے جائیں تو میں بھی چاہ رہی تھی کہ طلال اور سوہا کی شادی ایک ساتھ ہی کردوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں؟"
"نہیں بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے"۔
"السلام علیکم!"
"وعلیکم السلام!"
دعا نے ان تینوں خواتین کو زیرک نگاہ سے دیکھا جو اپنے پہننے اوڑھنے بات کرنے کے انداز سے ہی کسی اچھی فیملی کی لگ رہی تھیں۔
"اچھا ہوا دعا تم بھی آگئیں، آؤ ان سے ملو"۔
دعا چلتی ہوئی بلقیس آراء کے پہلو میں ہی بیٹھ گئی۔
"یہ میری بہو ہے"۔
اجیارہ ناشتے کی ٹرالی اندر گھسیٹتی ہوئی لے آئی اور سب کی ناشتے کی پلیٹیں بنانے لگی تھی کہ دعا نے منع کر دیا اور خود ان لوگوں کو ناشتہ سرو کرنے لگی۔ اس کا شاطر دماغ کیا کیا پلان بنا رہا تھا بلقیس آراء اور اجیارہ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔ وہ تھوڑے سے وقت میں ہی بڑی ہوشیاری چالاکی سے سوہا سے اس کے گھر اس کے بھائی کی ساری معلومات لے چکی تھی۔
"اوہ اجیارہ! میں آج تمہارے لئے بہت خوش ہوں، اتنا اچھا اتنا بہترین رشتہ ہی تم ڈیزرو کرتی تھیں"۔ مہمانوں کے جانے کے بعد دعا نے اجیارہ کو دونوں بازوؤں سے تھام کر گھما ڈالا تھا، اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی اجیارہ کے چہرے پر مزید لالی سی بکھرنے لگی، وہ جو شک و شبہات اس کے بلقیس آراء کے دل و دماغ میں تھے وہ سب پانی ہوتے نظر آئے تھے، اس کی خوشی میں دعا بھابی خوش تھیں تو اس کی خوشی مزید دوچند ہو گئی تھی۔
"میں تو ابھی سے تمہاری شادی کی شاپنگ شروع کر دوں گی بلکہ یوں کریں گے کہ تمہارے شہیر بھائی سے اچھے خاصے پیسے لے کر ہم دونوں خود طارق روڈ، جامع کلاتھ، رابی سینٹر چلیں گے تمہاری پسند سے تمہارے شادی کے لئے کپڑے خریدیں گے"۔
بلقیس آراء پیچھے دروازے پر ایستادہ تھیں، وہ خوشی سے چمکتا دعا کا چہرہ دیکھ رہی تھیں، انہوں نے خوامخواہ دعا کے لئے دل میں غلط فہمی پال رکھی تھی۔
"دعا بھابی آپ اور اماں ہی چلے جایئے گا مجھے تو کچھ خریدنا ہی نہیں آتا"۔ اجیارہ نے مسکراتے ہوئے دعا کو دیکھا۔
"نہیں تم چلو گی تمہاری شادی ہے تو ہر چیز تمہاری پسند کی ہی ہونی چاہئے"۔ دعا کے کہتے ہی بلقیس آراء پر نظر پڑی تھی اور وہ ان کے پاس آئی تھی۔
"کیوں اماں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں"۔
"میں کتنا غلط سمجھتی تھی تمہیں، مجھے معاف کر دو دعا بیٹی"۔ بلقیس آراء کے لب و لہجے میں شرمندگی تھی۔
"ایسا مت بولئے اماں! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے"۔ دعا نے بلقیس آراء کے دونوں ہاتھ تھام کے انہیں گلے سے لگایا۔

''میں اجیارہ کے لئے بہت خوش ہوں، میں بھی چاہتی تھی اس کی شادی ہو اچھی جگہ، ایسا رشتہ آئے جو ہماری اجیارہ کے لئے سوٹ کرتا ہو''۔ دعا نے چاہ سے پیچھے پلٹ کر اجیارہ کو دیکھا تھا، اجیارہ چلتی ہوئی آئی تھی۔

''تھینکس دعا بھابی!''

''اب یہ شکریہ وغیرہ کرنا چھوڑو اور یوں کرو اماں اور تم تو تیار ہو، میں بھی ریڈی ہوں، میں اندر سے اپنا پرس لے کر آتی ہوں پھر ہم تینوں بازار چلتے ہیں''۔ دعا نے اجیارہ کے رخسار پر ہلکے سے تھپکی دی تھی اور وہاں سے نکل کر اپنے بیڈروم میں آئی تھی۔

''میں نہ کہتی تھی اماں! دعا بھابی جیسی نظر آتی ہیں ویسی ہیں نہیں، دیکھا آپ نے وہ کس قدر خوش ہیں، آپ نے اپنے دل میں یونہی خدشات وہم پال لئے تھے''۔ اجیارہ نے بلقیس آراء کو دیکھا تھا۔

''ہوں، ٹھیک کہتی ہو تم میں نے ہی دعا کو غلط سمجھنے کی غلطی کرلی تھی''۔ بلقیس آراء نے پرسوچ نظروں سے اجیارہ کے چمکتے دمکتے گلابی چہرے کو دیکھا تھا۔

''اور تم لوگوں کی یہ غلطی تم دونوں کو کتنی بھاری پڑنے والی ہے اس کا اندازہ بھی نہیں ہے تم دونوں کو''۔ پیچھے کھڑی دعا نے دل میں کہتے ہوئے نہایت کڑوی اور زہریلی نظروں سے ان ماں بیٹی کو دیکھا تھا۔

☆............☆............☆

''میں یہاں صرف تمہاری وجہ سے آیا ہوں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں سخت بور ہو رہا ہوں اس وقت''۔ سبکتگین حیدر ترمذی نے بڑی بے چارگی سے خوش سے ابراش عسکری کو دیکھا تھا۔

''چپ کر کے اس وقت فنکشن کو انجوائے کرو اور ایک بات اور وہ یہ کہ تمہاری شکل پر جو یہ بارہ بج رہے ہیں ناں میں اس پر بالکل ترس کھانے والا نہیں ہوں، ہر دم آفس میں الجھے رہتے ہو ناں اس لئے اتنی شاندار پارٹی کی قدر نہیں ہے''۔ ابراش عسکری نے اس کے چہرے پر چھائی بے چارگی کو یکسر اگنور کر دیا تھا۔

''یقیناً تمہیں اس پارٹی کی بہت قدر ہے اور کیوں ہے وہ بھی مجھے نظر آ رہا ہے''۔ جامعہ کی اکثر و بیشتر لڑکیاں ہی ہوں گی جن کی ابراش عسکری سے ہیلو ہائے نہیں رہی ہوگی مگر ہر لڑکی ابراش عسکری کی خوبصورتی اس کے بے پناہ حسن کے قصیدے پڑھتی نظر آ رہی تھی، ان میں سے بہت سی خوبصورت اور امیر زادیاں تو اس کے پاس آئی تھیں نا صرف بلکہ ہائے ہیلو کہنے کا انداز بھی نہایت بے باک تھا، ابراش عسکری غرور کی سب سے اونچی مسند پر بیٹھا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ ہر لڑکی اس کو اپنا بوائے فرینڈ تو کوئی شریک حیات بنانا چاہتی ہے مگر اس مغرور سے ابراش عسکری کا دل تھا تو اس جامعہ کی سب سے بولڈ کانفیڈنٹ طلسم ناز، ابراش عسکری اور طلسم ناز دونوں محبت و عشق میں بہت آگے نکل چکے تھے مگر بقول ابراش عسکری کے عشق و محبت اپنی جگہ اور فلرٹ کرنا اپنی جگہ، جسے وہ زندگی گزارنے کا حق سمجھتا ہے۔

''ہائے سوئٹی! اتنی لیٹ، میں کب سے تمہارا ویٹ کر رہا ہوں''۔

طلسم ناز کو فنکشن میں آنے میں تھوڑی دیر ہوگئی تھی۔

''بس وہ راستے میں اچانک گاڑی خراب ہوگئی تھی''۔

''پھر کس کی کمبختی آئی جو تمہارے عتاب کا نشانہ بنا''۔

’’آف کورس ڈرائیور، میں نے اس کو اتنی سنائیں اگلی پچھلی ساری نسلیں یاد رکھیں گی‘‘۔ گردن اکڑا کر جتنے غرور سے طلسم ناز نے کہا تھا سبکتگین حیدر ترمذی اسے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا ورنہ جب وہ ان کے پاس آئی تھی سبکتگین حیدر ترمذی نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر نظر ہٹا لی تھی، وجہ اس کا ڈریس، ٹائٹ سی بلیک جینز پر ریڈ چھوٹی سی ٹی شرٹ جس میں سے آدھی باڈی کی کمر جھانک رہی تھی، عریاں بازو جس پر کوئی ٹیٹو سا بنایا ہوا تھا، شولڈر کٹ براؤن گولڈن بالوں والی یہ باربی ڈول غرور اور نخروں میں ابراش عسکری سے دو قدم آگے تھی۔

’’اور تم تو جانتے ہو کہ مجھے ڈیفیکٹڈ چیزوں سے سخت نفرت ہے اس لئے مائی ڈیئر! میں نے اسی وقت نیو ماڈل کی گاڑی منگوالی تھی اور میں وہ خود ڈرائیو کر کے آئی ہوں‘‘۔ وہ اترا کے بڑی شان سے اپنی تعریف کر رہی تھی۔

’’جانتا ہوں ایسے ہی تو تم پر دل ہار نہیں بیٹھا‘‘۔ ابراش عسکری نے نہایت چاہت بھری نظروں سے طلسم ناز کے خوبصورت دلکش چہرے کو تکا تھا۔

’’وہ اس لئے کہ تم کو میری جیسی اس پورے جامعہ تو کیا پورے جہان میں نہیں ملے گی‘‘۔ مغرورانہ مسکراہٹ آنکھوں میں اعتماد لئے وہ ابراش عسکری کو دیکھ کر اپنے شولڈر کٹ بالوں کو جھٹک کے بولی تھی۔

’’اف اتنا کانفیڈنٹ...‘‘ ابراش عسکری نے اپنی ابرو اچکائی، وہیں برابر میں کھڑے سبکتگین حیدر ترمذی نے بھی عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

’’کیوں نہیں ہونا چاہئے، آخر کو ملک کے مایہ ناز بزنس ٹائیکون نبیل بادامی عباس کی اکلوتی بیٹی اور کروڑوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث ہوں اور سب سے بڑھ کر اتنے بے پناہ حسن کی مالک... تم بتاؤ کیا کمی ہے مجھ میں؟‘‘

’’نعوذ باللہ...‘‘ سبکتگین حیدر ترمذی اپنے ہونٹوں سے بے آواز بول کر رخ موڑ گیا تھا۔

’’ایک منٹ ایک چیز بھول رہی ہو تم میرے خیال سے‘‘۔

’’وہ کیا؟‘‘ اس نے سوالیہ نظروں سے ابراش عسکری کا خوبصورت چہرہ دیکھا۔

’’میرا پیار، میری بے پناہ محبت و چاہت‘‘۔

’’وہ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہے، تم تو میرے لئے بہت اسپیشل ہو‘‘۔ کہتی ہوئی اس کے بازو سے لگی۔

’’اچھا چھوڑو، ان سے ملو میرے فرینڈ سبکتگین‘‘۔ ابراش عسکری نے اپنے برابر میں کھڑے سبکتگین حیدر ترمذی سے اس کا تعارف کرایا تھا۔

’’ہیلو...‘‘ طلسم ناز نے سبکتگین حیدر ترمذی کی طرف مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی ہائی سوسائٹی میں کسی نامحرم سے ہاتھ ملانا کوئی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ فخر محسوس کرتے تھے اپنی کلاس پر۔

’’السلام علیکم!‘‘ سبکتگین حیدر ترمذی نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ یکسر نظر انداز کر دیا بلکہ اس کے ہیلو کے جواب میں ’’السلام علیکم‘‘ کہا تھا۔

طلسم ناز کو یہ اپنی بے عزتی محسوس ہوئی تھی، اس نے اپنا ہوا میں معلق ہاتھ پیچھے کر لیا، طلسم ناز کی چہرے کی ناگواریت ابراش عسکری نے محسوس کر لی تھی بلکہ بے ساختہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

’’ایم سوری طلسم! میں تم کو بتانا بھول گیا کہ میرے اس دوست کو گرلز الرجک جیسی مہلک بیماری ہے‘‘۔

''اچھا تو تمہارے یہ دوست یہاں کیا کر رہے ہیں، یہاں تو جگہ جگہ بے باک حسن، عریاں مناظر بکھرے پڑے ہیں''۔ طلسم ناز نے ہنستے ہوئے طنز کیا تھا۔

''میری زبردستی پر یہاں آیا ہے یہ تا کہ یہاں اپنے لئے کوئی لڑکی پسند کرلے اور شادی ہو، اس کی ماما کو ان کی شادی کی بہت فکر ہے''۔ ابراش عسکری نے سبکتگین حیدر ترمذی کے بےزار چہرے کو نظر بھر کے دیکھا۔

''پھر تو ابراش تمہاری زبردستی اور تمہاری یہ کوشش ناکام ہی ٹھہری''۔

''وہ کیوں؟''

''وہ یوں، کیوں کہ یہاں تمہارے فرینڈ سبکتگین صاحب کی ٹائپ کی پسندکی لڑکی ملنا مشکل ہے، بلکہ میرا تو جہاں تک خیال ہے آج شام کی اس فیورل فنکشن میں ان کی ٹائپ کی لڑکیاں ہی نہیں آئی ہوں گی''۔

''ٹھیک کہتی ہیں آپ مس طلسم ناز صاحبہ! آج کی اس ''شام'' کے فیورل فنکشن میں مجھے میرے ٹائپ کی لڑکی نہیں ملے گی''۔ سبکتگین حیدر ترمذی نے ''شام'' کا یہ لفظ جان کر بولا تھا، اس نے اِدھر اُدھر بکھرے ان بے باک وعریاں حسن کو طنزیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

ابراش عسکری سمجھا یا نہیں مگر طلسم ناز اس کا طنز بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی، وہ اچھی خاصی سنا بھی دیتی سبکتگین حیدر کو مگر فی الحال چپ کر گئی۔

اور نظر اس لڑکی پر جا ٹھہری جو ان سب سے الگ اور منفرد تھی، جو اپنی فرینڈ سے کسی بات پر ہنس رہی تھی۔

''غنوئی...'' سبکتگین حیدر ترمذی کے گداز عنابی لبوں سے یہ نام دھیرے سے ادا ہوا تھا۔

☆..........☆..........☆

ریڈ کلر کی چھوٹی سی شرٹ اور ٹائس میں اونچی ہیل پہنے وہ ٹھک ٹھک کرتی کمرہ نمبر 201 کے دروازے کے پاس آ رکی تھی۔ وہاں رک کر اس نے اپنے چھوٹے سے ریڈ پرس سے شیشہ اور ریڈ ڈارک لپ اسٹک نکالی اور ہونٹوں پر ریڈ لپ اسٹک کا ایک اور گہرا کوڈ دیا، اپنا چہرہ پھر سے دیکھنے کے بعد اس نے دونوں چیزیں پرس میں ڈالیں اور دھیرے سے دروازے پر دستک دی تھی۔

''کم آن از ابیلا ڈارلنگ!'' اندر سے عابد جوفا کی مخموری سی آواز آئی تھی۔ از ابیلا نے لاک کو گھمایا تھا اور ہولے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔

بیڈ پر نیم دراز عابد جوفا ہاتھ میں لیپ ٹاپ لئے کچھ دیکھ رہا تھا، وہ شاہانہ چال چلتی ہوئی عابد جوفا کے برابر میں بڑی بے تکلفی سے براجمان ہوئی تھی۔

''اور سنایئے رات کا فسانہ''۔ اس نے عابد جوفا کے بالوں میں اپنی مرمریں انگلیاں گھمائی تھیں۔

''دیکھ لو تمہاری نظروں کے سامنے ہے''۔ اس نے لیپ ٹاپ کا رخ از ابیلا کی جانب کر دیا۔ اسکرین پر پانچ چھ وہی لڑکیاں تھیں۔

''میں تو دیکھ چکی ہوں ان سب کو، آپ بتایئے آپ کو کیسی لگی ہیں یہ ساری نو عمر کلیاں''۔

''ساری کی ساری ایک سے بڑھ کر ایک، ماننا پڑے گا دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جاؤ مگر تمہارے پاکستان میں تو جیسے ہر طرف حسن بکھرا پڑا ہے، ہر سو شباب ہی شباب ہے، بس انہیں تھوڑا اور سنوار دو تو جیسے قیامت ہی ہو جاتی ہیں۔ ان سب لڑکیوں کو میں نے رات بھر دیکھا ہے اپنی پیاس بجھائی ہے مگر ایسا لگتا ہے نشہ

اور تھکن ابھی تک اتری نہیں ہے"۔ عابد جوفا نے نہایت بے باکی اور للچائی نظروں سے ازابیلا کے خوبصورت و حسین سراپے کو دیکھا تھا۔

"وہ کیوں؟" ازابیلا نے اپنے بالوں کی ایک لٹ کو اپنی انگلی میں لپیٹا تھا۔

"تم جو ابھی تک نہیں آئی تھیں"۔ عابد جوفا نے اس کی عریاں کمر میں اپنا بازو ڈال کر اسے مزید خود سے قریب کر کے اس کے ریشمی بالوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

"لائر کل رات یہ لڑکیاں اور پرسوں رات وہ شبنم تھی آپ کے ساتھ، پھر بھی کہتے ہیں میری کمی لگی آپ کو"۔ اس نے نخرہ دکھاتے ہوئے شکوہ کیا۔

"ارے میری جان کل کی رات پرسوں کی رات کو جانے دو، آج کی رات کی بات کرو، ابھی رات جوان ہے حسین ہے، شراب ہے اور شباب بھی"۔ عابد جوفا نے لیپ ٹاپ کو سائیڈ میں پھینکا اور ایک جھٹکے سے ازابیلا کو اپنے سے قریب کر کے اسے اپنے پہلو میں گرا لیا تھا۔

☆.............☆.............☆

سبکتگین کی نظر اچانک ہی سبرینہ پر پڑی تھی، وہ غنویٰ اور عائزہ کے ساتھ بیٹھی کولڈ ڈرنک پی رہی تھیں۔

"خالہ کراچی میں ہیں"۔ سبکتگین حیدر ترمذی نے خود سے ہی سوال کیا تھا، وہ ان کے پاس جانا چاہتا تھا، اسے آج بھی یاد تھا بچپن میں سبرینہ اسے کتنا چاہتی تھیں، اسی کا دم بھرتی تھیں، امبرین سے زیادہ وہ اس کا خیال رکھتی تھیں، ایک ہی گھر میں ایک ساتھ رہتے ہوئے اس نے اپنی ماما اور مما خالہ میں کبھی کوئی فرق نہیں کیا تھا۔ تھیں تو وہ اس کی تائی مگر وہ انہیں ہمیشہ سے مما خالہ ہی کہہ کر پکارتا تھا۔ سبکتگین حیدر ترمذی جب دس سال کا ہوا تھا ان کے گھر ایک پیاری سی معصوم چہرے والی گڑیا آئی تھی جسے سبکتگین حیدر ترمذی پورے گھر میں اٹھائے اٹھائے لئے پھرتا تھا۔

"کہاں غائب ہو گئے"۔ ابراش عسکری نے سوچوں میں گم سبکتگین حیدر ترمذی کے آگے ہاتھ لہرایا تھا۔

سبکتگین حیدر ترمذی چونک کر ابراش عسکری کو تکنے لگا تھا۔

"اوہ... بھائی کہاں کھو گئے ہو"۔ ابراش عسکری نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا مگر اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

سبرینہ اور غنویٰ عائزہ کو اللہ حافظ کہہ کر جا رہی تھیں۔

"کچھ نہیں مجھے اب چلنا چاہیے کیونکہ مجھے نہیں لگتا تم بور ہونے والے ہو"۔ سبکتگین حیدر ترمذی نے آگے کچھ اور کہا، وہاں سے جانے کی ٹھانی تھی وہ سبرینہ اور غنویٰ کے پیچھے جا رہا تھا۔

"یہ تمہارا فرینڈ ہے"۔ طلسم ناز نے نہایت ناگوار نظروں سے جاتے ہوئے سبکتگین حیدر ترمذی کو دیکھنے کے بعد بری طرح ابراش کو گھورا تھا۔

"ہاں کیوں کیا ہوا، کوئی پرابلم؟" ابراش عسکری سمجھ گیا تھا کہ طلسم ناز کو سبکتگین حیدر ترمذی سخت ناپسند آیا تھا مگر جان کر انجان بن گیا تھا۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں"۔ اس نے ابراش عسکری کے بازو پر اپنی ہتھیلی کی مٹھی بنا کر ایک مکا زور سے جڑا تھا۔

"اتنا ان مینرڈ ہے جسے ذرا بھی تمیز نہیں ہے کہ ہائی سوسائٹی میں کیسے موو کرنا چاہیے، یقیناً کوئی مڈل کلاس

فیملی سے بی لونگ کرتا ہوگا جسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ فنکشن پارٹیز وغیرہ میں کیسے سروائیو کرنا چاہیے"۔ طلسم ناز کا موڈ سخت آف ہو چکا تھا۔ یہ کوئی پہلا شخص تھا جس نے اسے اگنور کیا تھا طلسم ناز کو، اور جو سب سے زیادہ برا لگا وہ تھا کہ اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا جسے سبکتگین حیدر ترمذی نے بری طرح نظرانداز کر دیا تھا، طلسم ناز تو سرتاپا سلگ کر رہ گئی تھی اور پھر سبکتگین حیدر ترمذی کے جانے کے بعد ابراش عسکری پر برس پڑی۔ ابراش عسکری بس اس کے غصے پر ہنسے ہی جا رہا تھا۔

"سخت زہر لگ رہے ہو اس طرح دانت نکالتے ہوئے"۔ طلسم ناز نے ایک بار پھر اپنا چھوٹا سا پرس اس کے سینے پر مارا اور تپ کر جانے ہی لگی تھی۔

"ارے یار! سوری کیوں اتنی اچھی پارٹی خراب کر رہی ہو۔ سبکتگین ایسا ہی ہے تم دل پر مت لو"۔ ابراش عسکری نے اس کی نازک سی کلائی تھام لی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے اس جاہل انسان کی کسی بات کو اپنے دل پر لینے کی"۔ طلسم ناز نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی اس سے چھڑائی تھی۔

"ویسے اب تم زیادتی کر رہی ہو"۔

"کیا مطلب کیسی زیادتی؟" وہ ناسمجھ نظروں سے ابراش عسکری کو تکنے لگی تھی۔

"وہ یہ کہ جسے تم جاہل اور مڈل کلاس جیسا انسان سمجھ رہی ہو بزنس کی دنیا میں وہ شخص اپنا ایک نام ایک مقام رکھتا ہے، حیدر کمپنی کا نام سنا ہے، کئی انڈسٹریز کا اکلوتا وارث ہے، سبکتگین حیدر ترمذی"۔

"سوواٹ"۔ اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے تھے۔ ابراش عسکری خاموش ہو کر رہ گیا، کہنے کو تو وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ تمہارے فادر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں سبکتگین حیدر ترمذی سے کنٹریکٹ کی ڈیل کرنے کے لئے جو ابھی تک ناکام ہیں مگر وہ یہ بات بول کر بات کو آگے نہیں بڑھانا چاہتا تھا اور نہ ہی پارٹی خراب کرنا چاہتا تھا۔

"اچھا چھوڑو اس لمبی بحث کو، ہم کیوں اپنا موڈ خراب کر کے اس حسین پارٹی کو خراب کریں، چلو آؤ اگلا پرفارمنس ہمارا ہے اسٹیج پر رومیو جولیٹ کا، آج اسے یادگار بناتے ہیں"۔ ابراش عسکری اس کا ہاتھ تھامے اندر ڈریسنگ روم کی جانب بڑھا تھا، طلسم ناز بھی بلاوجہ یہ فنکشن کسی کی وجہ سے مس نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے اپنے موڈ کو خوشگوار بناتی اس کے ساتھ ہو لی۔

سبکتگین حیدر ترمذی کار ڈرائیو کر رہا تھا اور آگے جاتی اس وائٹ مرگلہ کا پیچھا کر رہا تھا جسے خاقان ترمذی ڈرائیو کر رہے تھے۔ گاڑی ایک مشہور ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی تھی۔ تینوں باہر نکلے اور اندر کی جانب بڑھے تھے، سبکتگین حیدر ترمذی نے گاڑی لاک کی اور خود بھی ان کے پیچھے پیچھے ہوٹل کے اندر داخل ہوا تھا۔

سبکتگین حیدر ترمذی ٹھیک ان کی ٹیبل کے پیچھے والی ٹیبل پر آبیٹھا تھا۔

"ہاں تو غنوئی بیٹا آرڈر کیجئے، آج کا ڈنر میری طرف سے"۔ خاقان ترمذی نے اپنی جان سے عزیز اکلوتی بیٹی غنوئی کو مسکرا کے دیکھا تھا۔

"سوچ لیجئے ڈیڈ! میں آج آپ کا خوب خرچہ کرانے والی ہوں"۔ غنوئی نے خاقان ترمذی کو ڈرانے والے انداز میں کہا۔

''ڈونٹ وری مائی چائلڈ! ہماری جیب بھی آج بہت بھاری ہے''۔
''وہ اس لئے کیونکہ اس ماہ ابھی تک آپ کے ڈیڈ نے مجھے پاکٹ منی نہیں دی ہے''۔ سبرینہ نے خاقان ترمذی کو مسکراتی آنکھوں سمیت گھورا تھا۔
''پوائنٹ نوٹ کیا جاتا ہے''۔ غنویٰ نے سبرینہ کے آگے کورنش بجائی۔
''تو پھر آرڈر کریں''۔
''یس آف کورس...''
خاقان ترمذی نے ویٹر کو آواز لگائی۔
''جی سر!''
''غنویٰ بیٹا!'' خاقان ترمذی نے اشارہ کیا۔
''شاشلک ود پاستا، بروسٹ اینڈ بلیو بیری آئسکریم''۔ غنویٰ نے مینیو کارڈ سبرینہ کی جانب بڑھا دیا تاکہ وہ بھی کچھ آرڈر کریں۔
''نہیں آج ہم سب تمہاری پسند کا ہی ڈنر کھائیں گے''۔
''اور ہاں فرنچ فرائز لانا مت بھولئے گا''۔ جاتے ہوئے ویٹر کو غنویٰ نے ٹوکا۔
''جی میم!'' ویٹر نے مودبانہ انداز میں کہا۔
''سر آرڈر پلیز!'' ویٹر سبکتگین حیدر ترمذی کے پاس احتراماً آ کھڑا ہوا تھا۔
''ون کافی ود کریم''۔ اس نے آرڈر دیا۔
''او کے سر!''
تھوڑی ہی دیر میں سبکتگین حیدر ترمذی کی ٹیبل پر ہاٹ کافی ود کریم کا کپ ٹرے میں رکھ دیا گیا تھا۔
ویٹر نے غنویٰ کا آرڈر بھی ٹیبل پر سجا دیا تھا۔
گرم گرم کافی سے اڑتے بھاپ کے اس پار غنویٰ کے معصوم چہرے، مغرور آنکھوں کو سبکتگین حیدر ترمذی بغور دیکھ رہا تھا۔
غنویٰ بہت خوش تھی آج اور اس کی اس خوشی میں خاقان ترمذی اور سبرینہ بہت خوش تھے، انہیں بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر کچھ عزیز نہیں تھا۔

☆............☆............☆

''ماما!''
''ہوں...'' انداز نہایت مصروف والا تھا۔
سبکتگین حیدر ترمذی کی نظریں اپنے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھیں۔ امبرین کے مصروف لب و لہجے پر اس نے اپنی ذہین آنکھیں لیپ ٹاپ سے ہٹا کر امبرین کو دیکھا تھا جو مہینہ بھر کا راشن لکھ رہی تھیں، پھر نظر ہٹا کے اسکرین پر دوبارہ ٹکا دیں۔
''میں غنویٰ سے شادی کرنا چاہتا ہوں''۔ سبکتگین حیدر ترمذی نے جتنے پرسکون انداز میں کہا تھا اس سے کہیں زیادہ زور کا جھٹکا امبرین کو لگا تھا بلکہ پین اور ڈائری ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر ان کے قدموں کی سلامی دینے لگا تھا۔

''غنویٰ......!'' امبرین نے نام دہرایا۔

''سبرینہ آپا سے تمہاری ملاقات کب ہوئی، کیا وہ کراچی میں ہیں، مگر میں نے تو سنا تھا وہ ہمیشہ کے لئے باہر چلی گئی ہیں، کب آئیں وہ یہاں اور تم ان سے کہاں ملے، سبکتگین وہ کیسی ہیں، ٹھیک تو ہیں ناں''۔

''اف...''، سبکتگین حیدر ترمذی نے مسکرا کے انہیں دیکھا۔

''اتنے سارے سوالات، ریلیکس ماما!''

''اتنی بڑی خبر سنا کے تم کہہ رہے ہو ریلیکس رہوں، کتنے سال بیت گئے انہیں دیکھے''۔ امبرین کی آنکھوں میں غم کی شدت سے آنسو آ گئے تھے۔

سبکتگین حیدر ترمذی نے اپنا لیپ ٹاپ آف کیا اور ایک سائیڈ پر رکھ کر امبرین کے پاس آ بیٹھا اور ان کے دونوں ہاتھ تھام کر ان کی آنکھوں میں دیکھا جن سے بہتے آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے۔ وہ سمجھ سکتا تھا محسوس کر سکتا تھا ان کا درد، ان کی تکلیف، بہن کی جدائی نے انہیں کتنا دکھ تھا، وہ سب جانتا تھا، صرف ایک انجانی غلطی، کچے ذہن و نوعمری میں کی گئی نادانستہ کی گئی وہ غلطی ان دو بہنوں دو بھائیوں میں دراڑ ڈال گئی، دونوں ایک دوسرے سے جدا و خفا ہو کر الگ الگ ہو گئے۔

''ماما! فی الحال میں کچھ نہیں جانتا، وہ تو آج ابراش مجھے اپنے ساتھ زبردستی فیئر ویل پارٹی میں لے گیا تو میں نے مما خالہ اور غنویٰ کو دیکھا''۔ امبرین نے سبکتگین حیدر ترمذی کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''مگر میں یہ جانتا ہوں وہ رہتے کہاں ہیں کیوں کہ ہوٹل سے نکلنے کے بعد میں نے ان کا پیچھا کیا تھا''۔

''مجھے کب لے کر چل رہے ہو وہاں، میں دیکھنا چاہتی ہوں ملنا چاہتی ہوں اپنی بہن سے''۔ انہوں نے التجا بھرے لب و لہجے میں درخواست کی۔

''بہت جلد یا کل ہی''۔ اس نے مسکراتے ہوئے امبرین کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے ان کے رخسار پر بہتے آنسو صاف کئے تھے۔

امبرین نے فرط جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے سبکتگین حیدر ترمذی کی چوڑی ہتھیلی کی پشت پر بوسہ لیا تھا۔

''آئی لو یو ماما!''، سبکتگین حیدر ترمذی نے امبرین کی سیدھی مانگ پر بوسہ لیا تھا۔

''لو یو ٹو مائی سن!'' بھیگی آنکھوں سمیت وہ مسکرا دیں، اس پل جیسے انہیں جنت مل گئی، وہ بہت خوش تھیں۔

''اچھا یہ بتاؤ غنویٰ کیسی ہے؟''

''غنویٰ.....''، سبکتگین حیدر ترمذی کی آنکھوں میں چھپ سے اس کی شبیہ کا عکس ابھرا تھا۔

''شگفتہ ہونٹ، مغرور سی آنکھوں اور معصوم سا چہرہ جیسے کسی شاعر کی غزل''۔ سبکتگین حیدر ترمذی کے عنابی لبوں سے خود بخود غنویٰ کے لئے کیسے تعریف نکلی وہ خود نہیں جانتا تھا اور اس بے اختیاری نے امبرین کو جہاں خوش کیا تھا وہیں چونکا بھی دیا تھا، پہلی دفعہ ان کے اکلوتے چہیتے لخت جگر نے کسی لڑکی کی تعریف کی تھی، کسی کی خواہش کی تھی اور وہ بھی غنویٰ۔

ان کی نمی بھری آنکھوں میں گزرے بہت سال پہلے کا وہ منظر کسی فلم کی طرح چلنے لگا تھا، سبکتگین حیدر ترمذی اپنی اس بے اختیاری پر خود ہی مسکرایا اور امبرین کو دیکھ کر چونک گیا، ان کی پُرسوچ آنکھوں میں کیا ہے وہ سمجھ گیا

تھا۔

"ماما...!"

"ہوں"۔وہ چونک کر رہ گئیں۔

"میں غنویٰ سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"مگر میری جان یہ ناممکن ہے"۔انہوں نے دکھ سے دیکھا تھا جس چہرے پر کچھ دیر پہلے اپنی بہن کے مل جانے کی خوشی تھی اب وہاں تکلیف کی پرچھائیاں تھیں۔

"وہ کیوں؟"اس نے انجان بن کر پوچھا تھا۔

"کوئی وجہ؟"

"وجہ تم جانتے ہو"۔انہوں نے نگاہیں جھکا لیں۔سبکتگین حیدر ترمذی نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آئی گلاسز اتار کے ٹیبل پر رکھ دیئے۔

"یہ وجہ کوئی ایشو نہیں ہے"۔

"مگر یہی وہ وجہ بھی ہے جس نے ہم سب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا، جدا کر دیا"۔جانے کیسے ان کے ہونٹوں پر بے اختیار ہی شکوہ در آیا تھا، اتنے سال بیت گئے آج تک انہوں نے معمولی سا بھی شکوہ شکایت نہیں کی، پیشانی پر اس وجہ کو لے کر معمولی سی بھی شکن تک نہیں آئی مگر آج وہ خود سے کیے گئے سارے عہد بھول گئیں تھیں۔

سبکتگین حیدر ترمذی نے نہایت چونک کر امبرین کو دیکھا تھا، آج پہلی بار انہوں نے شکوہ کیا تھا، سبکتگین حیدر ترمذی کو اپنی سنگین غلطی پر آج جتنا پچھتاوا ہوا تھا کبھی نہیں ہوا، آج اس لمحے اس پل وہ خود سے نظریں نہیں ملا سکا۔

سبکتگین حیدر ترمذی کی گہری خاموشی کو امبرین نے شدت سے نوٹ کیا تھا۔

"آئی ایم سوری بیٹا! میری وجہ سے آپ کا دل دُکھا"۔وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا تھا اور گردن کو ہلکا سا خم دے کر چہرہ اِدھر اُدھر نفی میں ہلا دیا۔

"اٹس او کے مجھے کچھ برا نہیں لگا، مگر میں یہی چاہتا ہوں اور سچ بھی یہی ہے کہ میں غنویٰ سے شادی کر کے ٹوٹے رشتے داروں کو جوڑ سکوں، ان کی ناراضی ختم کروں، ہمارے بیچ سے ساری دوریاں ختم ہو جائیں"۔

"مگر میری جان یہ ناممکن ہے"۔انہوں نے ہارے ہوئے لب و لہجے میں کہا تھا۔

"ماما! ناممکن کچھ نہیں ہوتا ہے اور ہماری نیت صاف ہے تو انشاء اللہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوں گے"۔سبکتگین حیدر ترمذی نے امبرین کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر ان کی پشت پر نرمی سے بوسہ لیا تھا۔

"ان شاء اللہ"۔

"بھئی ہمیں بھی تو پتہ چلے کس مقصد میں کون کامیاب ہوگا؟"عفان ترمذی اسی دوران ہاتھ میں بریف کیس تھامے اندر داخل ہوئے تھے۔

امبرین کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ تھی وہ عفان ترمذی کو تکنے لگیں پھر سبکتگین حیدر ترمذی کو دیکھنے لگیں

جو مسکراتے ہوئے اپنا لیپ ٹاپ پھر سے کھول رہا تھا۔

☆............☆............☆

''مما!'' غنویٰ کی دلخراش چیخ نے سبرینہ کی کچی نیند توڑی تھی، خاقان ترمذی جو سونے کی تیاری کرنے لگے تھے انہوں نے بھی غنویٰ کی چیخ سنی تھی۔

''یا اللہ رحم... غنویٰ!'' سبرینہ تیزی سے اپنے بستر سے اٹھی تھیں اور بغیر سلیپر پہنے بھاگی تھیں، خاقان ترمذی بھی ان کے پیچھے پیچھے بھاگے تھے۔

''غنویٰ میری بچی''۔ سبرینہ غنویٰ کے بیڈ روم میں داخل ہوئیں، غنویٰ کو دیکھ کر ان کی روح کانپ اٹھی۔ غنویٰ کبھی بھی اپنے روم کی لائٹ آف کر کے نہیں سوتی تھی، وجہ اس کا ڈر وخوف تھا جو آج بھی چیخ چیخ کے اپنے ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

انہوں نے بیڈ کے پیچھے چھپی ڈر وخوف کے مارے اس کی جان جا رہی تھی، سکڑی سمٹی سی غنویٰ اپنا آپ چھپانے کی کسی انجان شے سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی، چہرہ لٹھے کی طرح بالکل سفید پڑ چکا تھا جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہ بچا ہو، سبرینہ تیزی سے اس کے قریب آئی تھیں۔

''غنوی، غنویٰ میری بچی میری جان، کیا ہوا؟''

خاقان ترمذی اور سبرینہ نے اس کو اٹھایا مگر وہ سہمی خوفزدہ سی چڑیا کی طرح سبرینہ کی آغوش میں ہی چھپی جا رہی تھی۔

''غنویٰ!''

''مما... وہ... وہ... آ گیا... وہ... وہ... پھر آ گیا... مجھے... بچاؤ... مما!'' ہچکیوں سے اس کا پورا وجود کپکپا رہا تھا، ٹوٹے پھوٹے سے یہ لفظ اس کا سانس پھلائے دے رہے تھے۔

''بس کچھ نہیں ہوا، میں ہوں ناں، کوئی نہیں ہے میرے تمہارے سوا''۔ آج تو ایسا لگ رہا تھا جیسے خود ان کے بھی حوصلے پست پڑ گئے ہیں، خاقان ترمذی نے دکھ بھری نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''دیکھو میری طرف کوئی نہیں ہے یہاں... میں ہوں، تمہارے ڈیڈ ہیں''۔ سبرینہ ہولے ہولے اس کا سر سہلا رہی تھیں مگر وہ کسی طرح سنبھالنے میں نہیں آ رہی تھی۔

''نہیں مما! مجھے بچالیں، وہ... آ گیا ہے''۔

''کوئی نہیں آیا ہے خواب دیکھا ہے ڈراؤنا، میری طرف دیکھو''۔ سبرینہ نے ذرا سختی سے کہتے ہوئے اس کو اپنی آغوش سے اٹھایا۔

''آنکھیں کھولو''۔

اس نے سختی سے آنکھیں بھینچی ہوئی تھیں، سبرینہ نے اس کا بھیگا چہرہ دیکھا، خاقان ترمذی نے سائیڈ ٹیبل سے خوب سارے ٹشوز اور گلاس میں بھر کے پانی دیا۔

''غنویٰ...!'' سبرینہ نے دھیرے سے نرمی سے پکارا۔ غنویٰ نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں، ان آنکھوں میں کچی نیند ٹوٹ جانے کے سرخ ڈورے تھے ساتھ بہت سا ڈر وخوف تھا۔

''مما...!'' کپکپاتے شنگرفی ہونٹوں پر زندگی سے ہار جانے کی ناامیدی تھی۔

''شش... '' انہوں نے اس کے کپکپاتے لبوں پر اپنی انگشت شہادت رکھ دی تھی اور آرام آرام سے اس کا

بھیگا چہرہ صاف کرنے لگی تھیں۔
"جب تک تم خود اپنے اس ڈر کو خود سے دور نہیں کرو گی یہ تم سے دور نہیں ہوگا، جو سوچتی جو بھی خواب میں دیکھتی ہو سب تمہارے ذہن کا وہم ہے اور کچھ نہیں، میری جان تمہارا علاج اس دنیا کے کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس نہیں سوائے تمہارے خود کے"۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھیں، غنویٰ کا شعور بیدار ہونے لگا تھا، سبرینہ کی باتیں ان کی موجودگی اس کے جسم میں توانائی کی پھر سے ایک نئی روح پھونک رہی تھی، ان کی موجودگی اس کے اور اس کے ڈر کے بیچ پھر سے ڈھال بن گئی تھی۔
"ڈیڈو!" غنویٰ نے رخ موڑ کر دیکھا تو دوسری طرف خاقان ترمذی بیٹھے تھے، وہ ان کے بازو سے لگی تھی، اس کا ٹوٹا حوصلہ بکھرا وجود اپنے مما ڈیڈو کو دیکھ کر پھر سے بڑھا تھا۔
"میرا بیٹا تو بہت بہادر اور حوصلے والا ہے ناں، بہت مضبوط ہے پھر یہ ذرا سے ڈراؤنے خواب سے کیسے ڈر گیا"۔ خاقان ترمذی نے اس کے جھکے سر پر شفقت کا بوسہ لیا تھا اور اس کا سر سہلانے لگے تھے، سبرینہ نے غنویٰ کی پشت پر ہاتھ رکھا۔
"پتہ نہیں ڈیڈو! میں کیوں ڈر جاتی ہوں بہت چاہتی ہوں کہ اس ڈر کو خود پر حاوی نہ ہونے دوں مگر میں ہر بار کی طرح کمزور پڑ جاتی ہوں"۔
"نہیں بالکل نہیں، اب آپ کو کمزور نہیں پڑنا ہے بلکہ کسی بہادر سپاہی کی طرح اس ڈر کا مقابلہ کرنا ہے"۔
پھر پوری بقیہ رات سبرینہ، خاقان ترمذی اس کے پاس بیٹھے رہے اس سے باتیں کرتے رہے۔

☆..........☆..........☆

"اب بتایئے عابد جوفا آگے کے کیا ارادے ہیں؟" ایک ہاتھ میں سگریٹ لئے وہ ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے ایک شعلہ دکھا گئی تھی اور اپنی دلفریب قاتلانہ اداؤں سمیت عابد جوفا کو تکنے لگی جو لیپ ٹاپ پر انہی لڑکیوں کی تصویریں دیکھ رہا تھا جو سلمان نے کڈنیپ کی تھیں۔
"میری جان! ارادہ تو یہ کر رہا ہے کہ سب کو ایک طرف کر کے تمہیں ہی یہاں سے لے جاؤں، بچ بڑی نشیلی چیز ہو"۔ عابد جوفا نے نہایت گھٹیا پن سے ہنستے ہوئے نہایت بے باک نظروں سے ازابیلا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔
"یہ تو ہے کہ میں بہت نشیلی چیز ہوں جبھی تو آج تک میرے حسن کے وار سے کوئی بچ نہیں سکا ہے"۔ اس نے اپنے گیلے شولڈر کٹ بالوں کو ایک جھٹکا دیا تھا۔
"اور مجھے لگتا ہے آپ کا پوری رات دل نہیں بھرا ہے"۔
"سو فیصد سچ کہہ رہی ہو ڈارلنگ! سوچ رہا ہوں دوپہر کی ٹکٹ کینسل کروا کے رات کی سیٹ بک کرا لوں، آج کا سارا ٹائم تمہارے ساتھ گزاروں"۔ عابد جوفا نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اٹھتے ہوئے اس تک آیا اور ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے سے بے انتہا نزدیک کر کے اس کے ہونٹوں پر خباثت کی مہر ثبت کر دی۔
"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے یہ تو میرے لئے اعزاز کی بات ہے کہ انڈونیشیا کا سب سے بڑا خریدار میرا ازابیلا کا دیوانہ ہے"۔ ازابیلا نے اس کے عریاں شانے پر ہاتھ پھیرا تھا۔
"مگر میری جان! مجھے ہے کیونکہ میرا یہاں پاکستان میں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے، مجھے جلد از جلد ان

سب لڑکیوں کو لے کر انڈونیشیا پہنچنا ہے، آگے جواب دینا ہے مگر میرا تم سے وعدہ ہے کہ بہت جلد میں تمہیں وہاں بلاؤں گا کیونکہ تمہارے جیسا نشہ حسن اب تک میں نے کسی لڑکی میں نہیں دیکھا“۔

”چلیں میں انتظار کروں گی مگر جب تک میں بھی اپنا کچھ کام نمٹا لوں“۔

”کون سا کام وہ ”ٹام کروز؟“

”ارے آپ کو کیسے پتہ؟“ وہ حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ڈیئر! جو ہماری نظروں میں آجائے اس کا پورا جغرافیہ اس کے ہمارے پاس آنے سے پہلے اس کا پورا بائیوڈیٹا آجاتا ہے“۔

”اوہ... پھر تو آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ”ٹام کروز“ اب تک میرے جال میں پوری طرح پھنسا نہیں ہے“۔

”پھنس جائے گا جب عابد جوفا جیسے انسان کو تم پاگل بنا سکتی ہو تو وہ کیا چیز ہے“۔ عابد جوفا نے اس کی مرمریں کمر میں اپنا بازو ڈالا، وہ اس پر جھکا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔

”اوہو بہت غلط ٹائم پر انٹری دی ہے“۔ عابد جوفا نے ازابیلا کو چھوڑا اور اپنے سیل فون کی جانب بڑھا۔ ازابیلا مسکراتی ہوئی قدآور آئینے کے پاس آکھڑی ہوئی، اپنے پرس سے میک اپ نکالا اور نہایت مہارت سے اپنے چہرے پر میک اپ کرنے لگی۔

عابد جوفا کو وہ ایئرپورٹ چھوڑ کر ان ساری نوعمر لڑکیوں کو پانی کی بوٹ میں روانہ کر کے سنیتا بائی کے پاس چلی آئی تھی۔

”اور سنا کیسی گزری رات“۔

”مت پوچھو سنیتا بائی، عابد جوفا کا تو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا مجھے چھوڑنے کو، پوری رات جگا کے رکھا ہے، بہت تھکن ہوگئی ہے“۔

”کیا کہہ رہے تھے“۔ انہوں نے ازابیلا کو نچھاور نظروں سے دیکھا تھا۔

”یہی کہ میں بہت سندر ہوں، بے پناہ خوبصورتی کی مالک ہوں وغیرہ وغیرہ“۔ ازابیلا نے اپنا والٹ اور موبائل سائیڈ میں رکھا تھا۔

”اور پیسے...“

”پچاس لاکھ روپے دیئے ہیں وہ بھی کیش، وہی اپنے بینک اکاؤنٹ میں Save کر کے آرہی ہوں“۔

”پچاس لاکھ...“ سنیتا بائی کی آنکھیں تو پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”اتنی بڑی رقم...“

”ہاں پچاس لاکھ“۔ ازابیلا نے سنیتا بائی کی حیران نظروں میں مسکرا کے دیکھا تھا۔

”اور میرا حصہ؟“ سنیتا بائی نے للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلایا تھا۔

”ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہارا حصہ تمہیں نہ ملے“۔ ازابیلا نے اپنا والٹ اٹھایا اور اس میں سے پچیس لاکھ کا چیک نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا“۔

”میں سوچ رہی ہوں جب تو مجھے پچیس لاکھ دے سکتی ہے اور عابد جوفا تجھے پچاس لاکھ دے سکتا ہے تو جب بریزے کو دیکھے گا تو میرا خیال ہے اپنی آدھی دولت اس کے نام کر دے گا“۔

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



"نہیں سنیتا بائی! خدا کے لیے ابھی بریزے کو عابد جوفا کے پاس بھیج بھی مت دینا، وہ ایک جنگلی ہے، بریزے کی صبح لاش ملے گی تمہیں، یہ تو میں نے اسے پوری رات برداشت کیا ہے بریزے کو چیر پھاڑ کر رکھ دے گا وہ وحشی درندہ"۔ ازابیلا نے سنیتا بائی کو سختی سے منع کر دیا تھا۔

"ارے میں تو مذاق کر رہی تھی ایسے ہی تھوڑی کم داموں میں بریزے کو نکال دوں گی، میں نے تو اسے سہد وڑانچ کے استقبال کے لیے سنبھال کے رکھا ہے"۔

"مرضی ہے تمہاری سنیتا بائی! میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ بریزے ابھی بند کلی ہے، تھوڑا اور کھلنے دو پھر چاہے ہر ایک کے آگے مسلنے کو ان کے قدموں میں ڈال دینا"۔

"میری کٹورانی ایسی ہی بند کلیوں کے دام زیادہ ہوتے ہیں اور تو نے بھی تو مجھے بند کلیاں ہی لا کر دی ہیں"۔

"تم بھول رہی ہو ان بند کلیوں اور اس بند کلی بریزے میں زمین آسمان کا فرق ہے اور جب اس سے کام نہ کرانے کے اتنے پیسے مل رہے ہیں تو ابھی ضرورت ہی کیا ہے اسے کہیں بھیجنے کی"۔ اس میں بھی ازابیلا کا اپنا مفاد چھپا تھا، جو سنیتا بائی جیسی چالاک شاطر عورت سمجھ نہیں سکی تھی۔

"اچھا چل چھوڑ یہ بتا..."

"کس بند کلی بریزے کی بات ہو رہی ہے، ذرا ہمیں بھی تو پتہ چلے"۔ اچانک ہی شبنم کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا تھا، ازابیلا نے تو جیسے اسے مکھی کی طرح اڑا دیا تھا جب کہ چند لمحوں کے لیے سنیتا بائی چونک کر اس کو دیکھنے لگی تھی۔

"کسی کی نہیں بس یونہی"۔

"سنیتا بائی! یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ تم کوئی بات بھی یونہی نہیں کہتی ہو"۔ شبنم اٹھلاتی ہوئی سامنے والے سنگل صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"ہاں تو کیا پوچھ رہی تھیں تم؟" ازابیلا نے شبنم کو یکسر نظر انداز کیا اور سنیتا بائی کو دیکھا۔

"ہاں میں یہ پوچھ رہی تھی کہ عابد جوفا اور ٹام کروز کی ملاقات کرائی تو نے؟"

"نہیں عابد جوفا نے کہا ہے وہ اگلے مہینے پھر ایک چکر لگائے گا تو ٹام کروز سے ملے گا"۔

"چل اچھا ہے ہمارا کاروبار جتنا بڑھے گا فائدہ ہمیں ہی ہو گا"۔

"ہاں... اب میں چلوں کچھ دیر سوؤں گی پھر شام کو کلب بھی جانا ہے"۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ٹھک ٹھک کرتی اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

پیچھے سے شبنم نے بہت گہری نظروں سے جاتی ہوئی ازابیلا کو تکا تھا۔

"تو کہیں جا رہی ہے"۔ سنیتا بائی نے شبنم کی نک سک سے تیاری دیکھی۔

"ہاں شاپنگ پر چلو اگر چل رہی ہو تو"۔ شبنم کھڑی ہو گئی۔

"نہیں بلکہ تو یوں کرنا میں کچھ منگواؤں گی وہ لا دینا"۔

"او کے لسٹ بنا کے دے دو لیتی آؤں گی"۔

☆..........☆..........☆

"کچھ پتہ چلا بریزے کا وہ اس وقت کہاں ہے؟" شاپنگ مال میں بلیک جینز بلیک جیکٹ پہنے کالے چشمہ

نھیں چھپائے، مزید کام اس کے سر پر رکھے ہیٹ نے کر دیا تھا جسے شبنم آج تک دیکھ نہیں پائی تھی۔ وہ شخص مال میں ہینگر میں لٹکی ٹی شرٹس دیکھ رہا تھا اور شبنم تھوڑے ہی فاصلے پر خود کے لئے ٹائٹس اور جینز پسند کر رہی۔

''آج سنیتا بائی اور ازابیلا بات کر رہی تھیں یہ تو میں نہیں جانتی کہ ان لوگوں نے بریزے کو کہاں چھپا کے رکھا مگر ہاں یہ کنفرم ہے کہ وہ جہاں بھی ہے آج تک وہاں سے باہر نہیں آئی ہے''۔

''اتنے وثوق سے یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو تم''۔

''میں ان لوگوں کو ایک ماہ سے فالو کر رہی ہوں اور آج سنیتا بائی کی باتوں سے پکا یقین بھی ہو گیا ہے''۔

''کیسی باتیں؟''

''جب سنیتا بائی نے کہا کہ اگر عابد جوفا جو بریزے کو دیکھ لے تو اپنی آدھی جائیداد اس کے نام کر دے گا، مگر پھر یہ بھی کہنے لگی کہ اس نے بریزے کو سہد وڑائچ کے استقبال کے لئے رکھا ہے''۔

گاگلز کے پیچھے چھپی ان آنکھوں میں شعلے سے دہکنے لگے تھے۔

''یہ سہد وڑائچ کون ہے، تم نے دیکھا ہے اسے، کہاں ہے وہ؟''

''نہیں میں نے صرف نام ہی نام سنا ہے اس کا بھی تصویروں میں دیکھا مگر میری انفارمیشن اتنی ہی ہے، سہد وڑائچ کے لئے کہ وہ آج سے دس یا پندرہ سال پہلے پاکستان آیا تھا اس کے بعد کبھی یہاں قدم بھی نہیں رکھا اس نے''۔ شبنم پنک ٹائٹس کو چیک کر رہی تھی۔

''کوئی وجہ.....''

''آئی ڈونٹ نو''۔ انداز اتنا مصروف والا تھا کہ کسی کو شک نہ ہو وہ کسی سے بات کر رہی ہے۔

''او کے''۔

''آپ نے عابد جوفا کو پکڑا کیوں نہیں، وہ تو واپس انڈونیشیا چلا گیا ان سب لڑکیوں کو لے کر''۔

''عابد جوفا، انیق واحدی اور سنیتا بائی اور ہاں ازابیلا بھی یہ سب وہ کڑیاں ہیں جن کی ڈور صرف ایک کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہے سہد وڑائچ۔ ان چھوٹی مچھلیوں کو پکڑنا ایسا ہے سو مچھلیاں کا اور جنم لینا اس لئے اگر ان سب کو پکڑنا ہے تو بڑی مچھلی کو پکڑنا پڑے گا جو باہر ملک میں بیٹھ کر ان سب کو اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے، جو اس کے ایک اشارے پر اپنی جان دینا بھی فخر سمجھیں گے''۔

''آپ کا کہنا بھی درست ہے، اچھا اب مجھے چلنا چاہئے بہت دیر ہو گئی ہے اور میری شاپنگ بھی مکمل ہو گئی ہے''۔ وہ ہینگر میں شرٹس اور ٹائٹس لے کر جانے لگی تھی۔

''ارے ہاں ایک اور انفارمیشن ہے میرے پاس''۔ وہ واپس پلٹی تھی اور آئرن کی اسٹک پر لٹکے کچھ اور ہینگرز کو بلاوجہ ادھر اُدھر کرنے لگی تھی۔

''کیسی انفارمیشن؟'' مقابل نے بھی مصروف والے انداز میں کہا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک ہینڈ واچ تھی جسے وہ چیک کر رہا تھا۔

''آج کل ازابیلا کی کسی ٹام کروز سے بہت عروج پر فرینڈ شپ چل رہی ہے اور اس کے علاوہ ٹام کروز اور عابد جوفا پارٹنر شپ کے بارے میں بھی سوچ رہے ہیں''۔

''ٹام کروز، یہ کون ہے؟''

''یہ تو میں نہیں جانتی مگر ازابیلا اس پر بہت جان دیتی ہے، ہالی ووڈ کے انگلش ایکٹر ٹام کروز سے بہت ملتا ہے وہ''۔

مقابل مسکرانے کے سوا کچھ نہیں کر سکا کیونکہ اس کو اس انفارمیشن میں اپنے کام کی کوئی بات نہیں لگی تھی۔

''او کے دیکھتے ہیں اس ٹام کروز کو بھی، اب ہمیں چلنا چاہئے''۔ وہ پھر رکا نہیں وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ شبنم کا بھی کام ختم ہو چکا تھا۔

☆............☆............☆

''پنک لپس... پنک لپس...''

ہونٹوں پر من مانیاں کر لے کر لے نادانیاں

ہونٹوں پر بے ایمانیاں کر لے کر لے نادانیاں

میری خواہشوں کو طلب ہے تیری آ قریب آ اب کر نہ دیری

تو آجا پاس یہ بلانے لگے ہیں میری راتوں کی نیندیں اڑانے لگے

کہیں کسی کے ہو نہ جائیں میرے یہ میرے یہ پنک لپس لپس...

فلور پر تھرکتی ناچتی عریاں سا لباس زیب تن کیے ازابیلا بڑے سر میں یہ گانا گا رہی تھی جس کی نظریں مستقل سامنے چیئر پر بیٹھے ذکی پر ہی ٹکی ہوئی تھیں اور چیئر پر براجمان ذکی کے عنابی لبوں پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی۔

ازابیلا کا گانا ختم ہو چکا تھا، اس نے مائیک ویٹر کو دیا اور بالوں کو ایک جھٹکا دیتی ذکی کی جانب بڑھنے لگی تھی۔

''جانتے ہو آج میں نے اپنے دل کی بات تم سے کہی ہے''۔ وہ ذکی کے مقابل رکھی چیئر پر بیٹھ چکی تھی۔

''اوہ ریئلی...''

''یس...''

''تو پھر کیا سوچا آج رات تمہاری خواہش پوری نہ کر دی جائے''۔ ذکی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے شولڈر کٹ ریشمی بالوں کی ایک لٹ اپنی انگلی میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

''صدیوں کے پیاسے سے کہہ رہے ہو کہ سامنے سمندر ہے جاؤ اپنی پیاس بجھا لو''۔ ازابیلا نے اپنے رخسار اور شانے کے درمیان ذکی کا ہاتھ دھیرے سے پھنسا لیا تھا جو اس کے بالوں کی طرف بڑھا ہوا تھا۔

''تو ٹھیک ہے تمہیں اور مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا، بہت جلد تم میری بانہوں میں ہو گی''۔ ذکی کی نشے سے چور آواز نے ازابیلا کے جسم میں ایک نئی روح سی پھونک دی تھی۔

''میں اس پل کا شدت سے انتظار کروں گی''۔ اس نے ذکی کا ہاتھ تھام کر اپنے سرخ لپ اسٹک سے سجے ہونٹوں سے چوم لیا تھا۔

جاری ہے

☆.....☆

ثوبیہ ملک

مکمل ناول

# تم میری دعا ہو

وہ نماز پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ پھر حسب معمول دعا مانگے بغیر ہی اس نے جائے نماز لپیٹ کر تخت پر رکھ دی اور کچن میں سے پالک لا کر کاٹنے لگی۔



"مما! میں آپ کی مدد کروں؟" سارہ نے ماں سے کہا۔

"نہیں میں کرلوں گی۔ تم جا کر ہوم ورک کرو۔" رباشہ نے نظر چھ سارہ پر ڈالی اور دوبارہ سے اپنے کام میں مگن ہوگئی جب کہ سارہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس چھوٹی سی بچی کو کبھی یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس کی ماں نے کبھی اسے گلے لگا کر پیار کیا ہو۔ یہاں تک کہ وہ سوتی بھی اکیلی تھی حالانکہ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹے اور اس کی مما اسے پریوں والی کہانی سنائے مگر اس کی مما تو اسے دیکھتے ہی غصہ کرنے لگتی۔ اس کا معصوم سا ذہن یہ سب سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کی مما اتنی عجیب کیوں ہیں؟

"شاید پاپا کی یاد آتی ہوگی مما کو کیونکہ کچھ دن پہلے مما نانو کے سامنے روتے ہوئے پاپا کو یاد کر رہی تھیں مگر میں بھی تو ان کی بیٹی ہوں۔"



''سارہ! میں نے آپ سے کیا کہا تھا اور آپ یہاں مزے سے آرام کر رہی ہیں۔'' رباشہ نے غصے سے کہا تو سارہ جو ابھی مزید ماں کے رویے کے بارے میں سوچتی فوراً اٹھ کر اپنی کاپی میں کام کرنے لگی۔ جب کہ رباشہ نے ایک مطمئن نظر اس پر ڈالی اور کچن میں آ کر پالک ابلنے کے لیے رکھ دیا۔

☆......☆

''زیبا بہن! تم رباشہ کو جاب کرنے کے لیے کیوں نہیں کہتیں۔'' ساتھ والی عظمیٰ خالہ نے رباشہ کی ماں سے کہا۔

''کیسی بات کر رہی ہو تم بھلا رباشہ کو کیا ضرورت پڑی ہے نوکری کے لیے دھکے کھائے۔ خیر سے بھائی بہن اور سب اس کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔'' زیبا نے ناگواری سے کہا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن بھائیوں کی شادی جب ہو جائے گی تو ان کی بیویاں کب تک برداشت کریں گی اور پھر رباشہ جو ہر وقت گم صم اور روتی رہتی ہے ذرا باہر نکل کر لوگوں میں گھلے ملے گی تو اداسی کے خول سے نکلے گی۔'' عظمیٰ پڑوسن نے اپنا مدعا دہرایا۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو مگر میرا دل بہت ڈرتا ہے۔ اپنی بچی کو اکیلے باہر بھیجنے سے۔'' زیبا نے اپنے دل میں موجود خوف کو بیان کیا۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ دنیا بھر کی لڑکیاں باہر نکلتی ہیں گھر سے۔''

''میں بات کرتی ہوں آج رباشہ اور اس کے بھائیوں سے پھر ہی کوئی فیصلہ کروں گی۔ پتا نہیں کتنے دکھ لکھیں ہیں میری بچی کی قسمت میں، کتنی مختصر سے عرصے کے لیے اس کی زندگی میں خوشیوں کی بہار آئی اور چلی بھی گئی اگر آج دائم زندہ ہوتا تو میری بیٹی کے چہرے پر اداسی ہوتی؟'' زیبا کے دل میں ہوک سی اٹھی تو عظمیٰ نے اسے تسلی دی ورنہ وہ خود بھی رباشہ کے لیے گہرا درد محسوس کرتی تھی۔

☆......☆

''امی! میں آپ کے لیے بوجھ بن گئی ہوں اسی لیے آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔'' رباشہ تو نوکری کا نام سنتے ہی چھم چھم آنسو برسانے لگی تو زیبا بیگم پریشان ہو گئیں اور اسے گلے سے لگا لیا۔

''رباشہ میری بچی تم نے ایسا سوچا کیسے تم میں تو ہماری جان بسی ہے تو بھلا کوئی اپنی دھڑکنوں کو بوجھ کہہ سکتا ہے۔'' زیبا آبدیدہ ہو گئی۔

''سوری امی!'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''ٹھیک ہے تم نہیں چاہتیں جاب کرنا تو زبردستی نہیں ہو گی۔ میں تو صرف اس لیے کہہ رہی تھی کہ تھوڑا گھر سے نکلو گی تو تمہاری طبیعت پر چھائی قنوطیت ختم ہو گئی اور فضول سوچوں سے بھی چھٹکارا ملے گا اور تم میری بات کو غلط رنگ دے بیٹھی۔ رباشہ میں چاہتی ہوں تم زندگی کو جیو کہ زندگی تمہیں جیے۔'' زیبا نے اسے سمجھایا۔

''امی! میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ میری طرف سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہو۔ سب کو خوش رکھ سکوں مگر کیا کروں دائم کے جانے کے بعد مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ دل چاہتا ہے کہ میں بھی دائم کے پاس چلی جاؤں۔'' وہ بولی تو زیبا نے شکوہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''آئندہ ایسا مت کہنا ورنہ میں تم سے بات نہیں کروں گی۔'' زیبا کہنا تو اور بھی بہت کچھ چاہتی تھیں

خاص کر سارہ کے بارے میں جو بے چاری باپ کے سائے سے محروم تھی مگر ماں کے ہوتے ہوئے ماں کی محبت سے بھی محروم تھی لیکن فی الحال وہ خاموشی سے رباشہ کے کمرے سے نکل آئیں۔

☆......☆

تیز بارش میں سارہ کتنی دیر سے کبھی اِدھر اچھل رہی تھی اور کبھی اُدھر۔

''سارہ اندر آؤ۔'' اس نے آواز دی مگر وہ اتنی کھیل میں مگن تھی کہ ماں کی آواز سن نہ سکی تو وہ غصے سے اس کے سر پر جا پہنچی۔

''آواز نہیں آرہی تمہیں؟'' وہ غصے سے چلائی تو سارہ ڈر کے مارے دو قدم پیچھے ہٹی۔

''ماما! ابھی بارش رکے گی تو میں اندر آجاؤں گی۔'' سارہ بولی۔

''میرے خیال میں آپ دو گھنٹے سے کھیل رہی ہیں۔ اس لیے فوراً اندر آجایئے۔'' رباشہ نے اسے گھورا مگر سارہ کو نہ جانے کیوں آج ضد ہوگئی تھی۔ مما کے بار بار کہنے پر بھی نہ مانی تو رباشہ کا ہاتھ اٹھ گیا۔

''سارہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہوگئی۔ وہ کچھ دیر ساکت نگاہوں سے ماں کو دیکھتی رہی اور پھر بھاگ کر اپنے روم میں چلی گئی جب کہ رباشہ نے اپنے ہاتھ کی جانب دیکھا اور خود وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔

☆......☆

''مما! بہت گندی ہیں۔ وہ مجھے پیار بھی نہیں کرتیں بس ہر وقت مجھ سے ناراض رہتی ہیں۔ میں اب ان سے بات نہیں کروں گی۔'' سارہ جو بخار میں پھنک رہی تھی۔ ماں سے دل ہی دل میں ناراض تھی۔

''سارہ! یہ لو سوپ پی لو پھر میرا بیٹا دوائی بھی لے گا تاکہ جلدی سے اچھا ہو جائے۔'' زیبا بیگم نے تو اس کو پیار کیا۔

''مجھے نہیں لینی دوائی اور نہ ہی سوپ پینا ہے۔'' سارہ نے کہا۔

''اچھے بچے ضد نہیں کرتے اور آپ تو میری بہت پیاری بیٹی ہو۔'' زیبا نے اسے بہلایا تو وہ اٹھ گئی بچی ہی تو تھی جس طرف لگایا مان گئی۔

''نانو! آپ کو پتا ہے میری دوست ہے ناں اس کے بھائی نے دوائی نہیں لی تھی تو وہ اللہ کے پاس چلا گیا تھا اگر میں بھی دوائی نہیں لوں گی تو میں بھی اللہ کے پاس چلی جاؤں گی۔ وہاں پر تو پاپا ہیں ناں مجھے ان کے پاس جانا ہے پھر نہ تو وہ مجھے ماریں گے اور نہ ہی ڈانٹیں گے بلکہ پیار کریں گے جب کہ یہاں تو مما مجھ سے پیار بھی نہیں کرتیں۔''

زیبا کے دل میں گھونسا سا پڑا۔ سارہ اپنی عمر سے بڑھ کر باتیں کرنے لگی تھی اور یہ سب رباشہ کی وجہ سے تھا اگر مزید اس کا رویہ سارہ سے خراب رہا تو یقیناً سارہ کی شخصیت مسخ ہو جائے گی۔

''نہیں میری جان! مما آپ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ وہ تھوڑی پریشان ہیں ناں۔'' زیبا نے سارہ کو اپنے سینے سے لگایا تو وہ نانو کے ساتھ لگ کر سو گئی۔ جب کہ باہر کھڑی رباشہ لرز اٹھی اس کی بے پروائی کی وجہ سے سارہ نہ صرف زندگی سے دور ہونا چاہتی تھی بلکہ ماں سے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگی تھی مگر ابھی اتنی بھی دیر نہیں ہوئی تھی۔

☆......☆

زندگی میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ان کے اصل مقام پر نہ رکھا جائے تو وہ بدصورت محسوس ہوتی ہیں۔ ایسے ہی انسان کی بھی مثال ہے۔ بہت سے ایسے فیصلے جو وہ کرنے کے لیے بہت سا وقت لیتا ہے مگر کبھی کبھی ایک پل ایسا آتا ہے کہ جس فیصلے کو وہ کر نہیں پا رہا ہوتا وہ پل اس سے کروالیتا ہے۔

"امی! میں انٹرویو کے لیے جا رہی ہوں۔ آپ دعا کیجیے گا۔" رباشہ نے ماں سے کہا جب کہ زیبا بیگم نے حیرانی سے رباشہ کی جانب دیکھا لیکن وہ اپنی بات مکمل کر کے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ کل رات کی تو بات تھی جب وہ ماں کو دودھ کا گلاس دینے کے لیے ان کے کمرے میں جانے لگی تو اپنے نام کی پکار پر رک گئی۔ کیونکہ صارم بھائی اس کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

"مما! ثناء نہیں مان رہی شادی کے لیے۔" عجیب سی بے چارگی تھی ان کے لہجے میں۔

"مگر کیوں؟" زیبا بیگم نے پوچھا۔

"امی! وہ سمجھتی ہے کہ رباشہ اور سارہ جب تک یہاں ہیں وہ بیاہ کر یہاں نہیں آئے گی۔" وہ بولا۔

"لیکن اسے یہاں کوئی پرابلم نہیں ہوگی اور پھر رباشہ کو تو تم اچھی طرح جانتے ہو وہ کس نیچر کی مالک ہے بھلا اس کی ذات سے کسی کو کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔" زیبا بیگم نے بیٹے کو قائل کرنا چاہا۔

"امی! آپ ایک کام کیوں نہیں کرتیں رباشہ کے لیے اچھا سا کوئی رشتہ تلاش کر کے اس کی شادی کر دیں۔ وہ کب تک یوں اکیلی رہے گی۔" صارم نے کہا تو باہر کھڑی رباشہ کو وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا وہ بغیر دودھ کا گلاس دیئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ جو لڑکی ابھی بیاہ کر اس گھر میں نہیں آئی تھی اس نے پہلے سے ہی اس کے وجود کو بھائیوں کی نظر میں بے وقعت کر دیا تھا اور آ جاتی تو کھڑے کھڑے اسے پکڑ کر نکال دیتی۔ ساتھ سوئی ہوئی سارہ کو اس نے سینے سے لگا لیا اور بے آواز کتنے ہی آنسو اس کے گال بھگوتے چلے گئے۔ پھر ایک فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو گئی کم از کم وہ کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ جب تک بیٹی کنواری ہوتی ہے ماں باپ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں مگر جب بیاہ دی جاتی ہے تو پرائی ہو جاتی ہے اور آج اسے واقعی سمجھ آ گئی تھی کہ وہ ان لوگوں کے لیے پرائی ہو گئی ہے۔

☆......☆

انٹرویو اس کی توقع سے بڑھ کر اچھا ہوا تھا اور دو ہفتے بعد اسے کال بھی آ گئی تھی۔ تو اس نے جلدی جلدی سارہ کو اسکول جانے کے لیے تیار کیا اور خود بھی تیار ہونے لگی۔

"سارہ! میں جلدی واپس آ جاؤں گی۔ آپ نانو کو تنگ نہیں کرنا اور جو وہ کہیں فوراً مان لینا۔" رباشہ نے اس کے گال پر بوسہ دیا۔

"مما! آپ کہاں جا رہی ہیں؟" سارہ نے تعجب سے پوچھا۔

"بیٹا! مما جاب پر جا رہی ہیں۔ شام کو واپس آ جائیں گی۔" اس نے سمجھایا۔

"مگر مما! آپ جاب کیوں کر رہی ہیں؟"

"میں اپنے بچے کے لیے کر رہی ہوں۔ اب دیکھو آپ کے لیے کتابیں وغیرہ بھی لینی ہوتی ہیں اور اسکول کی فیس بھی جمع کروانی ہے ناں تو اس کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مما جاب کریں گی تو ہی پیسے آئیں گے۔" رباشہ نے کہا تو سارہ نے سر ہلایا۔

''گڈ گرل۔'' رباشہ نے اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا اور خود بھی تیار ہو کر باہر نکل آئی اور رکشے والے کو ہاتھ دے کر روکا اور ایڈریس سمجھا کر چلنے کا کہا۔

وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کیبن کی طرف جا رہی تھی مگر سامنے سے آنے والی شخصیت کو شاید اس سے بھی زیادہ جلدی تھی۔ نتیجتاً دونوں کا بری طرح تصادم ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہوتی سامنے والے نے اسے تھام لیا جب کہ اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل سے تمام کاغذات نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ ایک تو وہ اس بری طرح سے ٹکرائی کہ سر سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اوپر سے سامنے والے کی نظریں اسے شدید کوفت میں مبتلا کر گئیں۔

''ہٹیے میرے راستے سے۔'' اس نے برہمی سے کہا جب کہ سامنے والے نے کچھ حیرانگی کا اظہار کیا۔

''مگر میرے راستے میں تو آپ آئی ہیں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ باندھے اور نظریں بدستور اس پر رکھیں تو رباشہ کا دل چاہا اس کی آنکھیں نکال دے مگر بہ مشکل خود پر کنٹرول کر کے اس نے تمام کاغذات کو دوبارہ فائل میں رکھ کر اسے گھورا اور بغیر کچھ کہے قدم بڑھا لیے۔

''اف یہ ادائیں! تمہاری خیر نہیں شاہ ویز آفندی۔ چلو نمٹ لیں گے تم سے بھی مس......!'' وہ اوپر جاتی رباشہ کو دیکھ کر بولا اور اپنی گاڑی کی جانب چلا آیا کیوں کہ اسے فوراً دبئی جانے کے لیے ایئرپورٹ پہنچنا تھا۔

☆......☆

آفس کا ماحول بہت اچھا تھا۔ تقریباً سب ہی وہاں اچھی نیچر کے مالک تھے۔ اس کی بھی کافی لوگوں سے دوستی ہوگئی تھی۔ آج اسے آفس آنے میں تھوڑی دیر ہوگئی تھی۔ وہ ابھی پہنچی ہی تھی کہ اسے ایم ڈی کا بلاوا آگیا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں پڑھتی ایم ڈی کے آفس میں پہنچی تو سامنے بیٹھے شاہ ویز آفندی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''تم یہاں......'' وہ شاید صدمے کی کیفیت میں تھی۔

''ایکسکیوزمی یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا۔'' شاہ ویز نے غصے سے کہا۔

''سوری سر! وہ میں......'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو اس نے سر جھکا لیا۔

''خیر یہاں میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ مجھے بالکل پسند نہیں کہ میرے آفس کا کوئی بھی ورکر لیٹ آئے اور یہ بات آپ اپنے دماغ میں اچھی طرح فیڈ کر لیں۔'' اس نے قدرے برہمی سے کہا جب کہ رباشہ نے سختی سے لب بھینچ لیے۔

''سوری سر! آئندہ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔'' رباشہ نے کچھ پل انتظار کیا کہ شاہ ویز آفندی اسے کچھ کہے گا مگر اس نے نظر انداز کر کے اپنا سر فائل میں دے دیا تو رباشہ نے اپنے قدم واپسی کے لیے موڑے مگر شاہ ویز کی آواز پر اسے رکنا پڑا۔

''میرے خیال میں آپ کو جانے کی اجازت تو نہیں دی گئی مگر لگتا ہے۔ مینرز کی کمی ہے آپ میں شاید۔'' شاہ ویز نے پرشوق نگاہوں سے اس کو دیکھا جب کہ رباشہ کو اپنا چہرہ جلتا ہوا محسوس ہوا۔

''سر! کوئی کام ہے کیا؟'' اس نے بہ مشکل لفظ ادا کیے۔

''کام بھی بتا دیں گے اتنی جلدی کیا ہے آخر۔ خیر یہ فائل ہے اسے اپنے پاس رکھیں۔ جب میں منگواؤں تو مجھے لا کر دیجیے گا۔'' شاہ ویز کو اس کی اتری صورت پر رحم آ گیا تو اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ مرے ہوئے قدموں سے اپنے روم میں چلی آئی اور ٹیبل پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ کس قدر اس شخص نے بے عزت کیا تھا۔

''کیا ہوا رباشہ؟'' نائلہ جو اس کی کولیگ تھی اسے روتے دیکھ کر وہاں چلی آئی۔

''کچھ نہیں وہ بس......'' رباشہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''ایسے کیسے کچھ نہیں ہوا؟ مجھے معلوم ہے سر نے ہی کچھ کہا ہوگا۔'' جب کہ رباشہ اس کے درست انداز پر حیران رہ گئی۔

''اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ارے بھئی جو بھی لڑکی اس آفس میں نئی آتی ہے وہ یوں ہی روتے ہوئے دکھائی دیتی ہے یہ جو شاہ ویز آفندی ہے ناں بہت ہی بگڑی ہوئی چیز ہے اس کی نگاہوں میں عورت محض ٹشو پیپر ہے۔ خیر تم اس سے ذرا بچ کے رہنا۔'' نائلہ نے اسے راز دارانہ لہجے میں بتایا تو مزید سہم گئی۔ زندگی میں پہلے مصیبتیں کم تھیں جو شاہ ویز آفندی ایک اور مصیبت آ گیا تھا۔ پھر جب تک مزید جاب کا بندوبست نہ ہو جاتا وہ یہاں سے جا بھی نہیں سکتی تھی۔

''اچھا میں ذرا یہ فائل دیکھ لوں۔'' نائلہ نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆......☆

پھر کافی دن تک شاہ ویز سے اس کا سامنا نہ ہوا مگر آخر کب تک؟ وہ اپنے کام میں مصروف تھی کہ نائلہ نے آ کر اسے پیغام دیا کہ شاہ ویز نے اسے بلایا ہے تو اس نے دوپٹے کو اچھی طرح سے اپنے اوپر لپیٹا اور اس کے روم میں چلی آئی مگر سامنے کے منظر نے اسے نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا۔ شاہ ویز اپنی سیکریٹری کے ساتھ کھڑا تھا جو اس کی شرٹ کے بٹن کے ساتھ کھیل رہی تھی اور شاہ ویز کا ایک ہاتھ اس کی کمر پر جب کہ دوسرا اس کے چہرے کی نرماہٹ کو محسوس کر رہا تھا۔

''مس رباشہ! یہ کون سا طریقہ ہے کسی کے کمرے میں آنے کا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ ناک کیا جاتا ہے۔'' کس قدر غصہ آیا تھا شاہ ویز کو جب کہ رباشہ نے نفرت بھری نگاہ ڈالی تھی اس پر۔ کس قدر چیپ انسان تھا اپنی چوری پکڑے جانے پر آنکھیں دکھا رہا تھا۔

''سوری سر! مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں......'' رباشہ نے ادھورا جملہ چھوڑ دیا تھا اور وہاں سے واپس قدم موڑ لیے۔ اپنے کیبن میں آ کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔

''کیا ہوا اتنی جلدی واپس آ گئیں؟'' نائلہ نے اسے اتنی جلدی واپس آتے دیکھ کر سوال کیا تو وہ تلخی سے مسکرا دی۔

''کچھ نہیں، سر مصروف تھے فی الحال۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ آج لنچ کا پروگرام ہے یا بھوکا رہنا پڑے گا۔'' رباشہ نے اسے ٹالا تو نائلہ کا دھیان بھی بٹ گیا۔

''کیوں نہیں بھئی آؤ نیچے چل کر کھاتے ہیں۔'' وہ دونوں اپنے کیبن سے نکل کر کینٹین کی جانب چلی آئیں اور ہلکی پھلکی گفتگو کے درمیان کھانا ختم کیا۔

☆......☆

گہرے جامنی رنگ کے کپڑوں میں وہ انتہائی دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ آج صارم بھائی کی تاریخ طے ہونی تھی تو اسے جلدی چھٹی چاہیے تھی۔ اسی سلسلے میں وہ شاہ ویز کے روم میں آئی تھی مگر اندر داخل ہونے سے پہلے وہ ناک کرنا نہیں بھولی تھی۔

''لیس کم آن۔'' اس نے کہا تو وہ اپنے دوپٹے سے کھیلتی ہوئی اندر آ گئی۔

''سر! مجھے آج ذرا جلدی گھر جانا ہے۔'' اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیوں؟''

''سر! میرے بھائی کی شادی ہو رہی ہے تو آج ان کی شادی کی تاریخ طے ہو رہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مس رباشہ! ایک تو آپ لوگوں کے پاس بہت سے بہانے ہوتے ہیں کام سے جان چھڑانے کے۔'' شاہ ویز نے قدرے رکھائی سے کہا۔

''سر! میں بہانہ نہیں بنا رہی مجھے واقعی جانا ہے۔ میرے گھر سے بار بار کال آ رہی ہے۔'' کس قدر بے بسی تھی اس کے لہجے میں مگر وہاں پرواہ کسے تھی۔

''ٹھیک ہے آپ دو گھنٹے بعد جایئے گا مگر یہ فائل مکمل کر کے۔'' شاہ ویز نے اس کے سراپے پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

''او کے سر!'' اس نے مرے ہوئے لہجے میں کہا اور فائل اٹھا کر اپنی ٹیبل پر آ بیٹھی۔ وہ جتنا جلدی کام نمٹانے کی کوشش کر رہی تھی اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے کام سمیٹ کر اس نے وہ نا ٹلہ کے ہاتھ فائل سر کے پاس بھیجی اور خود چیزیں سمیٹ کر وہاں سے نکل آئی۔

☆......☆

ٹھیک دو ہفتے بعد صارم کی شادی کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ پہلے بھائی کی شادی تھی تو گھر میں رونق بھی خوب تھی۔ اسی لیے وہ بھی تمام کوفت بھلائے بھائی کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ چونکہ آج مہندی تھی تو اس نے بھی اس دن کی مناسبت کے حساب سے پنک ایمبرائیڈری کے اسٹائلش سوٹ کے ساتھ ہلکی جیولری بھی پہن رکھی تھی جس میں اس کا دلکش اور سلونا روپ بہت حسین لگ رہا تھا۔ وہ مہندی کے تھال سجا کر نیچے سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اچانک لائٹ چلی گئی وہ جو اپنی دھن میں جلدی جلدی سیڑھیاں اتر رہی تھی کسی سے زور سے ٹکرائی جب کہ مقابل نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور اسی پل لائٹ بھی دوبارہ آ گئی شاید کسی نے جنریٹر چلا دیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اوپر اٹھائی تو دھک سے رہ گئی اسے لگا کہ شاید اس نے غلط دیکھا ہے مگر نہیں وہ تو شاہ ویز ہی تھا۔

''اف مجھے معلوم ہے کہ میں بہت ہینڈسم لگ رہا ہوں مگر اب اس طرح دیکھو گی تو نظر لگ جانے کا اندیشہ ہے۔'' اس نے شوخی بھرے لہجے میں کہا تو رباشہ کو بھی اپنی پوزیشن کا احساس ہوا تو فوراً اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی سیدھی ہوئی۔

''سر! آپ یہاں کیسے؟''

''تم نے تو بلایا نہیں تو ہم نے سوچا بن بلائے مہمان بن جائیں۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''ویسے شاہ میری بہت اچھی دوست ہے اس نے ہی بلایا ہے۔'' جب کہ رباشہ سر ہلا کر وہاں سے

جانے لگی مگر اس کا ہاتھ شاہ ویز کی مضبوط گرفت میں آ گیا تو وہ وہیں رک گئی۔
''یہ کیا بدتمیزی ہے چھوڑیئے میرا ہاتھ۔'' وہ غصے سے بول کر واپس پلٹی مگر مقابل کی شوخ نظروں نے اسے نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا شاہ ویز نے اس کے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے اڑاسا اور اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔
''بہت پیاری لگ رہی ہو۔ تمہارا یہ انوکھا روپ مجھے دیوانہ ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ دل کرتا ہے کوئی گستاخی کر بیٹھوں مگر تمہارا یہ گریز......'' وہ قدرے قریب جھکا تھا جب کہ رباشہ کو اپنی جان جاتی محسوس ہوئی اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا سارہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔
''مما! نیچے آیئے سب ویٹ کر رہے ہیں آپ کا۔'' رباشہ وہاں سے فوراً سارہ کا ہاتھ پکڑ کر بھاگی مبادا شاہ ویز دوبارہ کوئی حرکت نہ کر بیٹھے جب کہ شاہ ویز اس بچی کے منہ سے لفظ ''مما'' سن کر حیران تھا۔ تو کیا وہ بچی رباشہ کی تھی لیکن رباشہ کو دیکھ کر تو کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ ایک بچی کی ماں ہے مگر وہ بچی......! جتنا سوچ رہا تھا الجھتا جا رہا تھا۔

☆......☆

سات سہاگنیں آ کر ثناء کے ہاتھ پر مہندی لگا رہی تھیں۔ رباشہ جو اپنی ہی دھن میں تھی اٹھ کر ثناء کے ہاتھ پر مہندی لگانے لگی تو ثناء کی ماں نے فوراً سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ جب کہ وہ نا سمجھی کی کیفیت میں انہیں دیکھے گئی۔
''کچھ ہوش کرو یہ رسم صرف شادی شدہ عورتیں کرتی ہیں تم بھی شادی شدہ تو ہو مگر یہ بھی یاد رکھو کہ بیوہ ہو اور میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی سہاگن ہونے سے پہلے ہی اجڑ جائے۔ اس لیے مہربانی کر کے تم اپنا سایہ دور ہی رکھو میری بچی سے۔'' انہوں نے درشت بھرے لہجے میں کہا تو وہ اپنے آنسوؤں کو دل میں ہی اتارتی اسٹیج سے اتر آئی۔ بھلا ایسا ہو سکتا تھا کہ کسی کی وجہ سے اس کی قسمت بدل جائے مگر یہاں سب گونگے بہرے تھے۔ جنہوں نے ہندوانہ رسم کی نہ صرف بخوشی پیروی کی تھی بلکہ اسے دین کا حصہ بھی سمجھنے لگے تھے۔
''مما! کیا ہوا، آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟'' سارہ نے ماں کو اکیلے بیٹھے دیکھ کر پوچھا جب کہ رباشہ تلخی سے مسکرا دی۔
''بیٹا! میری کسی کو ضرورت ہی نہیں تھی وہاں تو اس لیے میں یہاں چلی آئی۔'' دو آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر اس کے بالوں میں جذب ہو گئے جب کہ کسی نے بہت دکھ سے یہ منظر دیکھا تھا۔
اگلے دن بارات تھی۔ سی گرین رنگ کے لباس میں میک اپ کے نام پر صرف لپ گلوز تھا اور آنکھوں میں کاجل ڈال کر اپنے سوگوار حسن میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ آج وہ غلطی سے بھی اسٹیج کی جانب نہیں گئی تھی اور کسی نے بھی اس کی کمی کو محسوس نہیں کیا تھا یا پھر ان کی خواہش بھی نہیں تھی۔
''ہیلو مس رباشہ! کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' شاہ ویز آفندی بلیک سوٹ میں غضب ڈھا رہا تھا جب کہ رباشہ نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
''مس رباشہ! ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' اس نے پوچھا۔
''جی سر!''

"وہ جو اس دن بچی تھی وہ آپ کی کیا لگتی ہے؟" نہ جانے کیا بے چینی تھی جو فوراً اس نے یہ سوال کیا تھا۔

"لگتا ہے آپ سارہ کی بات کر رہے ہیں وہ میری بیٹی ہے۔" کتنی محبت سے کہا تھا اس نے جب کہ شاہ ویز آفندی نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔

"تو آپ شادی شدہ ہیں؟" کس قدر بے یقین تھا وہ۔

"ظاہر ہے سر!" یہ سن کر شاہ ویز کو مزید وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا۔

"ارے سر! رکیے تو کھانا کھا کر جائیے گا۔" وہ آوازیں ہی دیتی رہ گئی مگر شاہ ویز آفندی وہاں رکا نہیں تھا جب کہ رباشہ محض کندھے ہلا کر رہ گئی۔

☆......☆

شاہ ویز آفندی، ریحانہ آفندی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں، باپ کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بری طرح بگاڑ دیا تھا۔ چونکہ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا تو دولت کو کھلے ہاتھوں لٹاتا پھرتا۔ وہ تھا بھی اتنا ہینڈسم اور چارمنگ شخصیت کا مالک کہ ہر لڑکی خود ہاتھ بڑھا کر اس سے دوستی کرتی اور وہ بھی فوراً ہاتھ تھام لیتا مگر صرف چند ماہ بعد ہی وہ اکتا جاتا اور ایک نیا چہرہ تلاش کرنا شروع کرتا لیکن یہ دوستیاں محض ایک حد تک تھیں اور اس نے کبھی اس حد کو کراس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ رباشہ اس کی زندگی میں آنے والی وہ واحد لڑکی تھی جس کی طرف اس نے خود سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا مگر اس نے جواباً اس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا تو شاہ ویز آفندی کا غصہ حد سے سوا تھا پھر اس نے رباشہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا لیکن جواب میں وہ بھی کوئی لحاظ رکھے بغیر اسے سنا دیتی تو شاہ ویز کو اس کی صاف گوئی اچھی لگنے لگی اور اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب وہ منفرد سی لڑکی اس کی نگاہوں سے دل میں سما گئی لیکن یہ انکشاف کہ وہ ایک بچی کی ماں ہے اس کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ گیا۔ بھلا جس کی لڑکی کے بارے میں اس نے ابھی سوچنا ہی شروع کیا تھا وہ تو کسی اور کی بیوی تھی۔ کتنی بے بسی تھی پہلی بار کسی کو چاہا بھی تو وہ بھی کسی کی بیوی کو۔ شاہ ویز نہ جانے کرب کی کون سی انتہا پر تھا کہ اپنا ہاتھ ڈریسنگ ٹیبل پر دے مارا نتیجتاً اس کے ہاتھ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔

"کیا ہوا شاہ ویز اور تمہارا یہ ہاتھ۔" ریحانہ آفندی نے زوردار آواز سنی تو اندر چلی آئیں مگر اپنے لخت جگر کو اس حالت میں دیکھ کر وہ دل تھام کر رہ گئیں اور جلدی سے فرسٹ ایڈ باکس لے آئیں اور اس کے زخم کا جائزہ لے کر اس کی ڈریسنگ کی پھر جا بجا بکھرے کانچ کو ملازمہ کو سمیٹنے کو کہا۔

"شاہ ویز کدھر خیال تھا تمہارا؟" کس قدر خفگی در آئی تھی جب کہ شاہ ویز نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچا۔

"سوری مام! اچانک سے لگ گئی پتا ہی نہیں چلا۔" وہ آہستگی سے بولا تو وہ ایک نظر ڈال کر کچن میں چلی آئیں اور دودھ گرم کر کے دوبارہ چلی آئیں۔

"یہ دودھ پی لو میں نے ہلدی ڈالی ہے اس سے درد میں افاقہ ہوگا۔" انہوں نے پیار سے اس کے بال بکھیرے تو شاہ ویز کو شرمندگی نے آن گھیرا۔

"سوری مام!" وہ بچوں کی طرح بولا تو انہیں ٹوٹ کر اپنے بگڑے ہوئے بیٹے پر پیار آیا۔

''اٹس اوکے۔ بٹ نیکسٹ ٹائم بی کیئرفل۔'' تو شاہ ویز نے بھی سر ہلایا اور آنکھیں موندھ لیں جب کے وہ کچھ پوچھے بغیر نکل آئیں کیونکہ اس وقت اسے آرام کی ضرورت تھی۔

☆......☆

''آج یہ میٹنگ میں نے اس لیے رکھی ہے کہ آپ سب کو اس پروجیکٹ کے بارے میں اچھی طرح بتا سکوں کہ یہ پروجیکٹ ہمارے لیے کتنا اہم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگلے ہفتے تک کوئی بھی چھٹی نہیں کرے گا اور اس کی پریزنٹیشن مس رباشہ آپ دیں گی۔''

''لیکن سر میں کیسے؟'' وہ بری طرح بوکھلا گئی تھی۔

''اس میں اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ہم سب ہیں آپ کی ہیلپ کے لیے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تو رباشہ نے بہ مشکل سر کو ہلایا اور دھیان سامنے اسکرین پر دیا جہاں شاہ ویز آفندی اہم پوائنٹ نوٹ کروا رہا تھا تقریباً ایک گھنٹے بعد میٹنگ ختم ہوئی تو وہ نائلہ کے ساتھ لنچ کرنے کینٹین چلی آئی۔

''ویسے آج کل سر کافی سدھر گئے ہیں۔'' نائلہ نے کہا۔

مجھے تو نہیں لگتا یہ بندہ کافی ڈرامے باز ہے کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' رباشہ کو مہندی والے دن کا واقعہ یاد آیا۔

''ہوسکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر مجھے تو کافی بدلے ہوئے لگ رہے ہیں۔ دیکھا نہیں سر کے آفس میں کتنے دنوں سے کوئی دوست نہیں آ رہی ملنے۔'' نائلہ نے رول کا بائٹ لیتے ہوئے کہا۔

''چھوڑو ہمیں کیا مجھے تو اس وقت پریزنٹیشن کی پریشانی ہو رہی ہے۔'' جب کہ نائلہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو اس نے گہری سانس لی اور خود کو ریلیکس کیا۔

☆......☆

جس قدر اس نے پریزنٹیشن اچھی دی تھی اس کی توقع تو شاید اسے بھی نہیں تھی۔ پروجیکٹ فوراً منظور ہو گیا تھا۔ سب نے ہی اسے سراہا تھا ڈھیر ساری مبارک دی تھی لیکن شاہ ویز آفندی جسے کروڑوں کا فائدہ ہوا تھا اس نے جھوٹے منہ بھی اس کی محنت کو سراہنا گوارا نہ کیا اور یہ بات رباشہ نے بہت محسوس کی تھی۔

''مجھے کیا ضرورت ہے اس شخص کو منہ لگانے کی۔'' اس نے دل میں کہا شاید وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرنے لگی تھی مگر وہ سر جھٹکتی مٹھائی لے کر گھر چلی آئی۔ ابھی گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ ثناء بھابی کی ناگوار آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''خود تو میڈم گھر سے نکل جاتی ہے اور مصیبت ہمیں سہنی پڑتی ہے۔ صبح سے تیمارداری میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ مجھے بھی کل سے بخار ہے مگر یہاں کسے پروا۔'' رباشہ نے مٹھائی کا ڈبہ وہیں صحن میں رکھا اور سارہ کے کمرے میں چلی آئی۔

''کیا ہوا بھابی سارہ کو۔'' ثناء نے کوفت بھرے انداز میں رباشہ کو دیکھا۔

''دیکھو بی بی! اگر بچی پیدا کر ہی لی تھی تو کم از کم اس کی دیکھ بھال تو کرنا سیکھ لیتیں۔'' رباشہ نے بغیر کوئی جواب دیئے سارہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اسے لگا کسی انگارے کو چھو لیا ہو۔ اس نے جلدی سے باؤل میں ٹھنڈا پانی لے کر اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کا بخار کم ہوا تو وہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تو ڈاکٹر نے مکمل چیک اپ کرنے کے بعد کچھ دوائیں لکھ کر دیں۔ وہ

میڈیکل اسٹور سے لے کر وہ تھکی ہاری گھر لوٹ آئی۔ پورے دن کی مسلسل بھاگ دوڑ نے اسے اچھا خاصا تھکا ڈالا تھا۔ سارہ کو دوا دے کر اس نے سلایا اور کچن میں آکر پانی پیا اور وہیں کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں موند ھ لیں۔

''رباشہ! یہاں اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ اندر اپنے کمرے میں آرام کر لیتیں۔'' زیبا بیگم جو ابھی ابھی اپنے بھائی کے گھر سے لوٹی تھیں بیٹی کو یوں بے آرام دیکھ کر فوراً بولیں۔

''بس امی! تھک گئی ہوں بہت۔'' رباشہ نے بے زاری سے کہا۔

''اچھا باہر آؤ میرے پاس میں سر میں تیل ڈال دیتی ہوں۔ سارا دن تو کام کرتی ہو اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے بالکل۔'' زیبا بیگم نے اسے تخت پر جگہ دیتے ہوئے کہا اور سر میں مالش کرنے لگیں تو رباشہ کے دماغ میں سکون سا اترنے لگا۔

''یہ سارا کہاں ہے۔ نظر نہیں آرہی؟'' زیبا کو اچانک نواسی کا خیال آیا۔

''سو رہی ہے۔ بخار تھا اسے۔'' زیبا بیگم فوراً اٹھی تھیں مگر رباشہ نے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

''امی! میں دکھا آئی ہوں ڈاکٹر کو اور دوائی بھی دے دی ہے۔ انشاء اللہ صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔'' رباشہ کے بتانے پر زیبا بیگم کو تسلی ہوئی تھی۔

☆......☆

آج تقریباً ایک ہفتے کی چھٹی کے بعد وہ آفس پہنچی تھی۔ کیونکہ پورا ہفتہ ہی سارا کی طبیعت ناساز رہی تھی۔ ابھی اسے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شاہ ویز آفندی نے اسے اپنے روم میں طلب کیا۔ وہ گھبراتے ہوئے وہاں پہنچی تو شاہ ویز کافی غصے میں تھا۔

''مس رباشہ! آپ کس قدر غیر ذمے دار ہیں اگر آپ کو سیر و تفریح کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کم از کم اطلاع ہی دے دی ہوتی مگر آپ جیسی نان سیریس ورکر کی وجہ سے مجھے کس قدر ہتکی کا سامنا کرنا پڑا۔'' وہ شدید برہم ہوا تھا جب کہ رباشہ کو اپنے ہاتھ پاؤں پھولتے محسوس ہوئے۔

''پلیز سر! آپ میری بات تو سنیں۔'' وہ بولی تھی۔

''جسٹ شٹ اپ۔'' وہ زور سے چلایا تھا۔ نہ جانے کس بات کا غصہ تھا جو وہ اس پر نکال رہا تھا جب کہ اس کا صبر بھی جواب دے گیا۔

''بس کر دیں آپ بھی۔ کم از کم خواتین سے بات کرنے کا سلیقہ ہی سیکھ لیں۔'' وہ بھی دوبدو بولتی اپنے آفس میں چلی آئی اور تھوڑی دیر بعد دوبارہ اس کے روم میں آئی تھی اور ایک لفافہ اس کی جانب پھینکا۔

''یہ کیا ہے؟'' شاہ ویز نے اچنبھے سے دیکھا۔

''میرا ریزائن لیٹر۔ مجھے نہیں کرنی آپ کے پاس جاب جہاں کوئی عزت ہی نہ ہو وہاں نوکری کرنے کا کیا فائدہ۔ مسٹر شاہ ویز آفندی میں اور لڑکیوں کی طرح آپ کی جی حضوری نہیں کرسکتی میں اچھی طرح جان چکی ہوں آپ کس طرح کے آدمی ہیں مگر یاد رکھیے گا میں ذرا مختلف لڑکی ہوں۔ سو کیئر فل۔'' شاہ ویز نے کس قدر دلچسپی سے اس کی بات سنی تھی اور ریزائن لیٹر پڑھ کر پھاڑ دیا تھا اور پھر ہنستا چلا گیا۔

''مس رباشہ! مجھے بہت ہی افسوس کے ساتھ آپ کو بتانا پڑے گا کہ آپ کم از کم ایک سال تک

یہاں سے نہیں جاسکتیں جس کی تصدیق آپ نے خود اس فائل میں کی ہے۔'' شاہ ویز نے اس کے سائن شدہ پیپر اس کے سامنے رکھے تھے جس کے مطابق وہ ایک سال تک اس کمپنی کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی اور یہی اس کمپنی کی پالیسی میں شامل تھا۔ وہ غصے سے اسے گھورنے لگی جب کہ وہ مزے سے اس کی بے بسی کا مزہ لینے لگا۔

''ویسے تمہارا بس نہیں چل رہا کہ مجھے شوٹ کردو۔'' جواب میں وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل آئی۔

☆......☆

شاہ ویز کو جب سے نائلہ کی معرفت رباشہ کی بیٹی کے بیمار ہونے کا پتا چلا تھا۔ اسے خود پر شدید غصہ آیا تھا۔ کم از کم اسے رباشہ سے وجہ تو معلوم کرنی چاہیے تھی ناحق اس نے رباشہ کو بری طرح زچ کیا تھا۔ نہ جانے کون سا جذبہ تھا کہ وہ رباشہ سے ملنے اس کے گھر چلا آیا۔

''واٹ آ سرپرائز، شاہ ویز تم یہاں۔'' ثناء جو اس کی دوست تھی اسے یہاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''ہاں وہ یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا تم سے ملتا ہی جاؤں۔'' شاہ ویز نے رباشہ کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''بس کردو جانتی ہوں تمہیں کہ کتنے اچھے ہو تم۔'' ثناء نے کہا تو وہ دلکشی سے مسکرادیا کہ اتنے میں رباشہ وہاں چلی آئی اور شاہ ویز کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''سر آپ......!'' حیرت کے باعث اس کی پوری آنکھیں کھل گئیں جب کہ ثناء اس کے منہ سے لفظ ''سر'' سن کر الجھن کا شکار ہوگئی۔

''ارے تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو کیا؟'' وہ بولی۔

''اصل میں بھابی میں ان کے آفس میں کام کرتی ہوں۔'' جب کہ ثناء معنی خیزی سے مسکرائی۔

''تو یہ وجہ ہے خیر میں ذرا چائے کا انتظام کرتی ہوں۔'' وہ رباشہ پر گہری نظر ڈال کر نکل آئی۔

''رباشہ! میں تم سے سوری کرنے آیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری بیٹی بیمار ہے۔ پلیز میں اس دن کی ہونے والی فضول گوئی کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔'' وہ شرمندہ دکھائی دیا تھا۔

''اوکے سر! میں تو بھول گئی۔ خیر آپ بیٹھیے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''رباشہ! تمہارے شوہر کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے کبھی تم نے ملوایا ہی نہیں۔'' شاہ ویز نے اچانک پوچھا تو رباشہ نے اپنے آنسوؤں کو بہ مشکل روکا۔

''سر! کاش میں آپ کو ملوا سکتی۔'' وہ اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہاں سے نکل آئی جب کہ ثناء نے اسے یوں جاتے دیکھا تو تشویش کا شکار ہوگئی۔

''اسے کیا ہوا؟'' اس نے شاہ ویز سے پوچھا مگر وہ اس وقت خود اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس کے سوالوں کا جواب دیتا۔ اس لیے بغیر کچھ کہے وہاں سے گاڑی میں آ بیٹھا۔ جب کہ ثناء آوازیں دیتی رہ گئی۔

☆......☆

کبھی کبھی زندگی میں انسان کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے بہت کوشش کرتا ہے مگر وہ اس کی نہیں ہو پاتی مگر اچانک سے وہی چیز آپ کو مل جائے تو اس وقت کی خوشی کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ یہی کچھ شاہ ویز کے ساتھ ہوا تھا وہ رباشہ کو سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر یہ جان کر کہ رباشہ کو وہ حاصل کرسکتا ہے دل خوشی سے

جھوم اٹھا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کل تک وہ صنف نازک کے دل سے کھیلتا آیا تھا اور آج اس کا اپنا دل کسی اور کا ہو گیا تھا۔
"مما! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" شاہ ویز نے ماں کے گرد بازو حمائل کیے۔
"مما! ایک لڑکی ہے رباشہ۔" وہ کچھ پل کے لیے چپ ہو گیا۔
"اچھا تو یوں کہو ناں کہ میرے بیٹے کو واقعی ہی کوئی پسند آ گئی ہے فائنلی۔" ریحانہ آفندی ہنستے ہوئے بولیں تو وہ مسکرا دیا۔
"مما! وہ......! مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ رباشہ کی ایک بیٹی بھی ہے اور اس کا شوہر دو سال پہلے انتقال کر گیا ہے۔" وہ رکا تھا ماں کے تاثرات جانچنے کے لیے مگر ریحانہ آفندی کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔
"مما! وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ سب سے الگ آپ اس سے ملیں گی تو آپ کو یقیناً اچھا لگے گا۔" شاہ ویز نے ان کو یقین دلانے کے لیے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا تو انہوں نے غصے سے جھٹک دیا۔
"تمہیں پوری دنیا میں ایک بیوہ عورت ملی تھی شادی کرنے کے لیے۔ کیا ہو گیا ہے شاہ ویز تم تو جوتے بھی اعلیٰ برانڈ کے استعمال کرتے ہو اور لڑکی پسند کی بھی تو کسی کی اترن۔" وہ گویا پھنکاریں تھیں۔
"انیف مما! بہت ہو گیا آپ کو رباشہ کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ وہ تو مجھے پسند بھی نہیں کرتی اس کی نظر میں آپ کا بیٹا بہت ہی آوارہ ہے۔" کس قدر دکھ سمٹ آیا تھا۔
"یہی تو ہتھکنڈے ہوتے ہیں امیر لڑکوں کو پھانسنے کے۔ دیکھو شاہ ویز! میں ڈھونڈوں گی اچھی لڑکی تمہارے لیے۔" انہوں نے پیار سے پچکارا۔
"مگر مجھے صرف رباشہ چاہیے اور کوئی بھی نہیں۔" وہ اٹل لہجے میں بولا اور زور سے دروازہ بند کیا جب کہ ریحانہ بیگم نے کچھ سوچا اور مسکرا دیں۔

☆......☆

رباشہ کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا تھا مگر وہ قطعاً تیار نہیں تھی۔ اس کو بہت سے خدشات لاحق تھے جو کہ ٹھیک بھی تھے جس میں پہلا خدشہ سارہ کے لیے باپ کا پیار تھا اور پھر صائم کے جانے کے بعد تو اس نے خوشیوں کے دروازے خود پر بند کر لیے تھے۔ زیبا بیگم اسے سمجھا سمجھا کے تھک گئی تھیں کہ انہیں اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ہی اسے اپنے گھر کا دیکھنا چاہتی ہیں اور اگر آج اس کے بیوہ ہونے کے باوجود اچھے رشتے آ رہے ہیں تو یہ بہت خوش قسمتی کی بات تھی اگر خدانخواستہ کل اسے اکیلا رہنا پڑ گیا تو وہ تنہا زندگی کیسے گزارے گی۔ آخر کل کو اسے سارہ کی شادی بھی کرنی تھی اور بھائی......! وہ تو اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ جب ان کو فرصت ملتی اس کا حال دریافت کر لیتے لیکن اگر وہ ایک نگاہ بھی اس پر نہ ڈالتے تو وہ اکیلی تنہائی کا عذاب سہتی وقت سے پہلے ہی مر جائے گی۔
عجیب دوراہے پر اس کی زندگی آ گئی تھی۔ ثناء بھابی کی چبھتی نگاہیں وہ کس مشکل سے برداشت کرتی تھی وہ ہی جانتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دھوپ میں بیٹھی پراگندہ سوچوں میں گم تھی کہ اچانک ثناء بھابی اس کے پاس آ بیٹھیں۔
"کن سوچوں میں گم ہو؟" ثناء نے اس کے آگے چٹکی بجائی۔

''کچھ نہیں بھابی! بس ویسے ہی آج چھٹی تھی آفس کی تو آرام کرنے لگی تھی۔ کوئی کام تھا مجھ سے؟'' اس نے پوچھا۔

''ضروری ہے کوئی کام ہوگا تو ہی آؤں گی۔ بس دل چاہ رہا تھا تم سے باتیں کرنے کو۔'' رباشہ نے حیرت سے دیکھا وہ لگاوٹ کا اظہار کر رہی تھیں۔

''رباشہ! آنٹی نے بتایا ہوگا تمہیں رشتے کے بارے میں۔'' وہ رکی تھی تو گویا پیار جتانے کی یہ وجہ تھی۔

''کیا سوچا پھر تم نے؟''

''بھابی! کیا سوچوں گی میں بھلا اور امی کو میں انکار کر چکی ہوں۔'' وہ مختصر بولی۔

''کس قدر بے وقوف ہو تم رباشہ! اتنا اچھا رشتہ ہے۔ لڑکے کا اپنا بزنس ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ خود چاہتا ہے کہ تم اس کی دلہن بنو یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم ایک بچی کی ماں ہو اور کیا چاہیے تمہیں مجھے تو تمہارا یہ انکار بے وجہ ہی لگ رہا ہے۔ خیر میں تمہارے اس بے وقوفانہ عمل میں ہرگز ساتھ نہیں دوں گی۔ آخر کو مجھے فکر ہے تمہاری اسی لیے میں نے آنٹی کو لڑکے والوں کو مثبت جواب دینے کا کہا ہے اور تمہیں پتا ہے جو میں ایک بار فیصلہ کرلوں اس سے پیچھے نہیں ہٹتی اور مجھے امید ہے کہ تم میری بات کی لاج رکھو گی۔''

''مگر بھابی......'' وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی مگر ثناء نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''رباشہ! جو لوگ وقت پر صحیح فیصلہ نہیں کرتے ناں وہ یوں ہی چھاؤں کی تلاش میں بھٹکتے رہتے ہیں اور پھر یہ دھوپ انہیں جلا کر خاکستر کر دیتی ہے مگر پھر بھی زندگی انہیں گزارنی پڑتی ہے تو کیا تم چاہتی ہو کہ اپنی زندگی یوں گزارو۔ اب یہ تمہارا فیصلہ ہے کہ تم زندگی کو دھوپ میں گزارتی ہو یا ٹھنڈی چھاؤں تلے۔'' ثناء کیا کہہ گئی تھی اسے ایک دم دھوپ میں بیٹھے جلنے کا احساس ہوا تھا۔

☆......☆

آخر کار ثناء بھابی نے اپنی ہی منوائی تھی اور اگلے ہفتے اس کا نکاح تھا۔ وہ آفس میں اپنے سب کولیگ سے ملنے کے بعد شاہ ویز آفندی کے آفس چلی آئی تھی۔

''بہت مبارک ہو مس رباشہ! ہمیں نہیں بلائیں گی۔'' شاہ ویز نے رباشہ کو گہری نظروں سے دیکھا جو سفید لباس میں بہت پاکیزہ لگ رہی تھی۔

''جی سر! آپ ضرور آیئے گا۔'' رباشہ نے کہا۔

''ویسے آپ کے ''ان'' کی تصویر تو ہوگی۔'' وہ ہمیشہ بغیر سوچے ہی بولتا تھا۔

''میں نے نہیں دیکھا انہیں۔'' رباشہ کو یاد آیا کہ وہ تو نام تک نہیں جانتی۔

''بہت عجیب لڑکی ہو تم۔''

''میں بس ایسی ہی ہوں۔'' وہ بے دلی سے بولتی اپنا پرس اٹھا کر وہاں سے جانے لگی تھی مگر اپنی کلائی شاہ ویز کے ہاتھ میں دیکھ کر رک گئی۔

''رباشہ! مانا کہ تم اداسی میں بھی بہت پیاری لگتی ہو مگر پلیز کبھی مسکرا بھی دیا کرو۔'' رباشہ نے نظر اٹھا کر شاہ ویز کی جانب دیکھا تھا نہ جانے کیا ہوا تھا کہ وہ بغیر کچھ سوچے اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد احساس ہوا تو کس قدر شرمندگی نے آن گھیرا تھا وہ نظریں چراتی وہاں سے نکل آئی تھی۔ جب کہ

شاہ ویز نے اپنے کندھے کو چھوا جہاں ابھی بھی اس کے آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔

☆......☆

وہ ابھی تک شرمندہ دکھائی دیتی تھی بھلا کیا سوچتے ہوں گے سر شاہ ویز آفندی اس کے بارے میں۔ کتنی بار وہ خود کو ملامت کر چکی تھی اپنی اس حرکت پر مگر شرمندگی تھی کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ابھی نہ جانے اور کتنی دیر ایسے ہی بیٹھی رہتی کہ سارہ کی آواز نے اسے چونکا ڈالا۔

"مما! ثناء آنٹی بول رہی ہیں کہ آپ جمعہ کو دلہن بنیں گی۔" سارہ نے اشتیاق سے پوچھا جب کہ اس نے لب بھینچ لیے۔

"آپ نے کھانا کھالیا کیا؟" اس نے بات پلٹ دی۔

"جی مما! کھالیا۔"

"اچھا ادھر آؤ میرے پاس مما آپ کو کہانی سنائیں گی۔" وہ اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہوگئی اور آہستگی سے سر میں انگلیاں چلانے لگی۔

☆......☆

تقریباً ساری تیاری مکمل تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد نکاح خواں نے آکر اس سے ایجاب قبول کروائی اور وہ برستی آنکھوں سمیت اس گھر کو چھوڑ کر اپنے پیا کے ساتھ گاڑی میں آبیٹھی تھی۔ وہ نگاہیں جھکائے سب کے درمیان آبیٹھی تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا تھا کہ کسی نے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا تھا۔ جب کہ وہ اس لمس پر حیران ہوئی تھی۔ ساتھ بیٹھے وجود کا لمس جانا پہچانا تھا اس نے یونہی نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اپنے مقابل شاہ ویز کو دیکھ کر اپنی پلکیں جھپکانا بھول گئی۔

"یار! ایسے دیکھو گی تو میں کسی کا بھی لحاظ کیے بغیر کچھ کر بیٹھوں گا۔" اسے اپنا ذہن ماؤف ہوتا محسوس ہوا تھا۔ جب کہ شاہ ویز کے کزن اسے چھیڑنے میں مصروف تھے اور وہ ہر کسی کو مزے سے جواب دے رہا تھا۔

"اتنی بے قراری دیکھی نہ تھی ہم نے۔" شاہ ویز کے کزن عمر نے چھیڑا۔

"تو اب دیکھ لو۔" وہ بھی شاہ ویز آفندی تھا دو بدو جواب دینے والا۔ اسی طرح ہنستے مسکراتے اسے شاہ ویز کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی گویا پھولوں کی بارش ہوگئی تھی۔ عجیب خواب ناک سا ماحول تھا۔ بیڈ کے اردگرد گلاب کی لڑیاں تھیں۔ پنک کلر کی بیڈ شیٹ کے ساتھ ہم رنگ پردے تھے۔ سائیڈ ٹیبل پر شاہ ویز کی تصویر تھی جس میں وہ دلکشی سے مسکرا رہا تھا۔ وہ گھونگٹ میں سر جھکائے مختلف سوچوں میں گم تھی۔ آنے والے کے بارے میں سوچ کر ہی اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ کیونکہ وہ اس شخص کی وارفتگیوں کے بارے میں اچھی طرح آگاہ تھی۔ جب کہ اب تو وہ مکمل حق رکھتا تھا۔ دروازے کے کھٹکے پر وہ مزید خود میں سمٹ گئی۔ جب کہ آنے والا کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا۔ پھر تمام بلب روشن کر دیئے گویا کمرے میں جو سحر پھونکا گیا تھا وہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو سامنے شاہ ویز کی مما عجیب نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔

"کس کا انتظار کر رہی ہو؟" عجیب لہجہ تھا اس کے خاک پلے نہ پڑا۔

"دیکھو لڑکی تم یہاں آتو گئی ہو مگر یاد رکھنا یہ پھولوں کی سیج میں نے تمہارے لیے کانٹوں کی نہ بنا دی تو

میرا نام ریحانہ آفندی نہیں۔ میرے بیٹے نے تو کبھی جھوٹا نہیں کھایا نہ جانے کیسے کسی کی اترن کو خود پر اوڑھ رہا ہے لیکن خیر چند دن کا شوق ہے اور اس کے شوق بدلتے رہتے ہیں اور اسے بھی میں اپنے بیٹے کی نادانی سمجھ کر معاف کر دوں گی۔'' لفظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ جو اس کے کانوں میں انڈیلا گیا تھا۔ وہ جانے کے لیے مڑی تھیں جب کہ وہ اپنے وجود کے بوجھ کو بہ مشکل سنبھالے ہوئے تھی۔ پھر وہیں روتے روتے وہ کب نیند کی وادیوں میں کھو گئی اسے پتا بھی نہ چلا اور رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔

☆......☆

وہ بڑی مشکل سے دوستوں سے جان چھڑا کر اپنے کمرے میں جانے ہی لگا تھا کہ مما کے کمرے سے کسی چیز کے گرنے کی آواز زور سے آئی تھی وہ پلٹ کر وہاں آیا تو ریحانہ بیگم کو درد سے نڈھال گرتے ہوئے پایا۔

''مما کیا ہوا؟'' وہ ماں کے آنسو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔

''پتا نہیں کیسے واش روم سے پھسل کر گر گئی۔ بہت درد ہو رہا ہے کمر میں۔'' وہ آنسو بہانے لگیں تو وہ ماں کو سہارا دے کر فوراً ہاسپٹل کی جانب بھاگا۔ جہاں ڈاکٹروں نے فوراً ریحانہ بیگم کو خصوصی ٹریٹمنٹ دیا۔ پھر بھاگ دوڑ میں اسے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور یہاں تک کہ پوری رات ہاسپٹل میں گزارنے کے بعد ریحانہ بیگم کو صبح نو بجے ڈسچارج کر دیا گیا تو وہ انہیں لے کر گھر کی جانب لوٹا۔

☆......☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کے جسم کا ہر عضو درد سے نڈھال تھا شاید ایک جگہ بیٹھے رہنے سے اس کی کمر تختہ ہو گئی تھی۔ بہ مشکل خود کو گھسیٹ کر اس نے الماری سے سادہ سوٹ نکالا اور واش روم میں شاور لینے چلی گئی کیونکہ وہ ابھی تک اپنے عروسی لباس میں تھی۔ وہ حیران بھی تھی کہ شاہ ویز پوری رات کمرے میں نہیں آیا تھا گویا اس کے خدشات سچ ثابت ہو رہے تھے۔ مختلف سوچوں کو جھٹکتی وہ خشوع خضوع کے نماز ادا کرنے لگی مگر جب ہاتھ اٹھائے دعا کے لیے تو پھر واپس ہاتھ گرا دیے اور جائے نماز لپیٹ کر بیڈ پر آ بیٹھی۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ نے دستک دی تو اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

''چھوٹی بی بی آپ کا ناشتہ لے آؤں؟'' ملازمہ نے کہا۔

''رہنے دو بس ایک کپ چائے لے آؤ۔'' اس نے اپنے دکھتے سر پر ہاتھ رکھا تو ملازمہ سر ہلا کر چلی گئی پھر تھوڑی ہی دیر میں چائے لا کر دی تو وہ گھونٹ گھونٹ اپنے حلق میں انڈیلنے لگی۔ چائے ختم کر کے کپ سائیڈ پر رکھا اور آنکھیں موند ھ لیں۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کسی نے بہت آہستگی سے اس کے ماتھے پر اپنے لب رکھے تھے وہ چونکی اور پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''شاہ ویز......!اس کے لب ہلے تھے۔''

''یار! تھوڑا انتظار اور کر لیتیں۔'' وہ اس کے لباس تبدیل کرنے پر کہہ رہا تھا مگر وہ کچھ بولنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ گویا اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ شوہر کے روپ میں شاہ ویز آفندی ہے۔

''پہلے تو میں تم سے سوری کرنا چاہتا ہوں۔ رات میں مما اچانک گر گئیں تو ساری رات ان کے ساتھ ہاسپٹل میں گزاری۔ بس جیسے ہی آیا ہوں فوراً تمہارے پاس چلا آیا۔'' اس نے رباشہ کی ٹھوڑی اوپر کی مگر وہ بدستور نگاہیں نیچے کیے ہوئے تھی۔

''رباشہ! تم خوش تو ہو ناں؟'' اس نے پوچھا تھا مگر وہ خاموش تھی اسے سمجھ نہ آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔

''کچھ تو بولو پلیز۔'' اس نے اکسایا تو وہ گہری سانس لیتی کھڑکی کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

''مجھے اس وقت اپنی کیفیت خود بھی سمجھ نہیں آرہی کہ میں خوش ہوں یا ناخوش۔ جن حالات میں یہ شادی ہوئی ہے اس میں میری ہرگز کوئی خواہش شامل نہیں۔ میں جانتی ہوں میرے لفظ آپ کو ہرٹ کررہے ہیں مگر کیا کروں کہ میں ویسا فیل نہیں کرسکتی جیسا کہ آپ کررہے ہیں کیونکہ میں ایک بچی کی ماں ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اگر یہ میری پہلی شادی ہوتی تو میں خود کو خوش قسمت سمجھتی مگر میں خود کو آپ کے قابل نہیں سمجھتی۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ وہ آپ ہیں جس سے میرا نکاح ہورہا ہے تو میں ہرگز رضامندی نہ دیتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔'' وہ آہستگی سے اپنا مدعا بیان کررہی تھی جب کہ شاہ ویز کو اس کے لفظوں نے دکھ دیا تھا۔

''تم سے کس نے کہا کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ میں نے خود اپنی مرضی سے تم سے شادی کی ہے۔ بلیومی۔'' وہ یقین دلا رہا تھا۔

مگر گزشتہ رات جو الفاظ ریحانہ بیگم نے دہرائے تھے وہ کیا تھے؟

''رباشہ! میں تمہیں بہت چاہنے لگا ہوں۔ میں تو ان مردوں میں شامل تھا جو عورتوں کو اپنے لیے تسکین کا سامان سمجھتے ہیں مگر تمہاری حیاء نے مجھے احساس دلایا کہ عورت کا رتبہ کتنا بڑا ہے۔ جب اللہ نے ہی عورت کے قدموں میں جنت رکھ دی تو اس سے بڑھ کر اور کیا میں کہوں۔'' وہ کچھ دیر کے لیے رکا تھا۔

''رباشہ! میری زندگی میں جو بھی لڑکیاں آئی ہیں وہ آزاد خیال اور ظاہر پر مرمٹنے والی تھیں لیکن تم واحد ایسی ہو جس نے مجھے قدم قدم پر احساس دلایا کہ میں غلط ہوں حالانکہ میں نے کتنا ستایا تمہیں۔ تمہیں بھی ویسی ہی لڑکیوں کی طرح سمجھا جس کے لیے میں تم سے شرمندہ ہوں۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

''کوئی بات نہیں سر......!'' اس نے اپنی زبان کو بریک لگائی تھی جب کہ شاہ ویز ہنستا ہی چلا گیا۔

''یار! اب تو سر کہنا چھوڑ دو۔ ویسے تم سادگی میں بھی اچھی لگ رہی ہو۔'' وہ شوخ ہوا اور اس کو اپنے قریب کیا تھا کہ عین اسی وقت دروازہ زور سے بجایا گیا۔

''چھوٹے صاحب! آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔'' ملازمہ نے پیغام دیا۔

''اوکے تم جاؤ ہم آتے ہیں۔'' اس نے ملازمہ کو رخصت کیا جب کہ رباشہ نے لب بھینچ لیے تھے۔ وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ شاہ ویز کی مما اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔

''چلو آؤ مما کی خیریت پوچھتے ہیں۔ وہ خوش ہو جائیں گی۔'' رباشہ کا دل چاہا انکار کردے مگر وہ شاہ ویز کے ساتھ چل پڑی۔

☆......☆

''مما! کیسا فیل کررہی ہیں آپ؟'' شاہ ویز نے ریحانہ بیگم کو گلے لگایا۔

''ٹھیک ہوں بیٹا! پر میں بہو سے بہت شرمندہ ہوں۔ آخر کو ہر لڑکی اس رات کا انتظار کرتی ہے۔'' کتنا عامیانہ پن تھا ان کے لفظوں میں۔ خصوصاً لفظ ''لڑکی'' پر زور دیا گیا تھا۔

''مما! آپ کی بہو بہت اچھی ہے۔'' اس نے پیار بھری نظر ڈالی تھی رباشہ پر جو ریحانہ بیگم سے ہرگز

مخفی نہیں رہ پائی تھی کہ اتنے میں شاہ ویز کے موبائل پر کال آئی جسے سننے کے لیے وہ باہر چلا گیا۔

''جتنے عیش کرنے ہیں کرلو۔ پھر ویسے ہی تمہیں یہاں سے چلے جانا ہے۔ ویسے خوب صورت تو تم واقعی ہی ہو لگتا ہی نہیں کہ تم ایک بچی کی ماں ہو۔'' وہ بولی تھیں گویا اس کے حسن کا اعتراف کیا تھا۔

''دیکھئے پلیز! اگر میں آپ کی عزت کر رہی ہوں تو میری برداشت کو یوں نہ آزمائیں۔ جا کر اپنے بیٹے سے پوچھیے کہ انہوں نے کیوں کسی بیوہ عورت کا انتخاب کیا میں ہرگز نہیں مری جا رہی تھی آپ کے بیٹے کے لیے۔'' وہ بھی غصے سے آؤٹ ہوئی تھی تو ریحانہ بیگم ایک جھٹکے سے اٹھی تھیں اور اس کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔ جب کہ رباشہ نے انہیں یوں اٹھتا دیکھ کر بے یقینی سے دیکھا۔

''اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور تم ٹھیک سوچ رہی ہو مجھے کل کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ تو کھیل کا ایک رخ تھا جو تم نے دیکھا۔ اب سمجھ تو گئی ہوگی کہ تمہارا یہاں ٹکنا ممکن نہیں۔''

رباشہ سے مزید وہاں کھڑا ہونا محال ہو گیا تو وہ خود کو سنبھالتی نکل آئی۔

☆......☆

''شاہ ویز! وہ مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔''

''بولو۔'' اس نے کہا۔

''آپ پلیز ویسے کا فنکشن کینسل کروا دیں۔'' وہ ملتجانہ لہجے میں بولی۔

''یار! یہ تو ناانصافی ہے کل بھی تمہیں نہیں دیکھا مگر آج تو یہ ظلم نہ کرو مجھ پر۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''شاہ ویز! آپ سمجھنے کی کوشش کریں لوگوں کی عجیب نگاہیں، ہمدرد بن کر طنز کے تیر برسانا......'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو اس کی جان پر بن آئی۔

''مجھے یوں اذیت تو نہ دو۔ اوکے میں منع کر دوں گا مگر پلیز یوں آنسو تو نہ بہاؤ۔'' شاہ ویز نے اس کے آنسو پونچھے۔

''تھینکس۔'' وہ تشکر بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''شاہ ویز! ایک بات اور کہوں۔''

''سب سنوں گا مگر اس وقت تم میرے پاس آؤ'' اس نے رباشہ کو اپنے پاس بلایا تو وہ جھجکتی ہوئی چلی آئی تو شاہ ویز نے اس کو خود میں سمو لیا۔

☆......☆

''رباشہ! دیکھو کون آیا ہے۔'' وہ کچن میں قورمہ بنا رہی تھی جب شاہ ویز کی آواز آئی تو باہر نکل آئی مگر سامنے سارہ کو دیکھ کر بھاگ کر اس سے لپٹ گئی اور چٹاچٹ اس کا منہ چوم ڈالا۔

''کاش کوئی ہمارا بھی ایسے استقبال کرتا۔'' وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا تو رباشہ نے گھورا۔

''مما اب ہم کیا ادھر ہی رہیں گے؟'' سارہ نے سوال کیا۔

''جی مما کی جان اب ہم ادھر ہی رہیں گے۔'' اس نے مسکرا کر کہا جب کہ شاہ ویز نے اسے یوں خوش دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔

''تھینکس شاہ ویز! آپ بہت اچھے ہیں۔'' وہ سارہ کے آجانے پر بہت خوشی تھی۔ حالانکہ اس کا کتنا دل چاہ رہا تھا مگر ریحانہ بیگم کے رویے کی وجہ سے وہ ڈر بھی گئی تھی۔ اس نے ٹیبل پر کھانا لگایا تو سب کھانے

کی میز پر جمع ہو گئے چونکہ زریاب آفندی کو ان کی شادی والے دن رخصتی کے بعد ہی بزنس ٹور کی وجہ سے دبئی جانا پڑا تھا اور آج ان کی واپسی ہوئی تھی۔ اسی لیے رباشہ نے کھانے میں خصوصی انتظام کیا تھا۔
"بھئی بہت پیاری خوشبو آرہی ہے کھانے کی۔" زریاب آفندی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تو رباشہ مسکرادی۔
"جی انکل! آپ کھا کر بتایئے گا۔" وہ خوش دلی سے ان کے سامنے پلیٹ میں قورمہ نکالنے لگی۔
"زبردست واقعی ہماری بیٹی کے ہاتھوں میں ذائقہ ہے کیا انعام دیں پھر ہم۔" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی سارہ بھاگتی ہوئی اندر آئی۔
"مما! مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔" وہ رباشہ سے لپٹ گئی تو زریاب آفندی اور ریحانہ آفندی نے اچنبھے سے دیکھا۔ جب کہ شاہ ویز ان کی آنکھوں میں لکھے سوال کو جان گیا۔
"پاپا! یہ سارہ ہے ہماری بیٹی۔" کس قدر محبت سے کہا تھا۔ تو زریاب آفندی مسکرادیے چونکہ وہ جانتے تو تھے مگر سارہ کو دیکھا نہیں تھا جب کہ دوسری جانب ریحانہ آفندی نے کس قدر قہر بھری نظر ڈالی تھی کہ معصوم سارہ مزید ماں سے لپٹ گئی۔
"اگر یہ تم لوگوں کی بیٹی ہے تو ہماری پوتی ہوئی۔" انہوں نے ہاتھ پھیلائے تو رباشہ نے اثبات میں سر ہلایا اور سارہ آہستگی سے چلتی ہوئی زریاب آفندی سے لپٹ گئی۔
"آج سے آپ مجھے دادا ابو کہیں گی۔" اتنی محبت پر رباشہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"سچ مما! میرے دادا ابو ہیں۔" وہ جوش سے بولی تو رباشہ نے اسے یقین دلانے کے لیے سر ہلایا تو وہ فوراً ان کی گود میں بیٹھ گئی اور ادھر ریحانہ بیگم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

☆......☆

وہ اندر کمرے میں داخل ہوا تو رباشہ نماز ادا کر رہی تھی۔ وہ بیٹھ کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ رباشہ نے نماز پڑھنے کے بعد جائے نماز لپیٹ کر رکھی تو شاہ ویز اسے ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔
"بہت بری بات ہے جو تم دعا مانگے بغیر اٹھ جاتی ہو۔" اسے بالکل اچھا نہ لگا تو فوراً کہا۔
"کیا کروں گی دعا مانگ کر جب کوئی دعا ہی پوری نہیں ہوتی۔" اس نے کہا تو شاہ ویز کو جھٹکا لگا کس قدر غلط بات کہہ رہی تھی۔
"رباشہ! مجھے تم سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔ کیا تمہیں اللہ پر یقین نہیں ہے؟" اس نے سوال کیا۔
"میں نے ایسا کب کہا۔"
"کہا بھی ہے اور عمل بھی کر رہی ہو۔ دعا میں اتنی طاقت ہے کہ وہ انسان کی تقدیر کو بدل کر رکھ دیتی ہے پھر تم نے ایسا کیوں کہا۔ رباشہ! بہت سی چیزیں انسان کی زندگی میں ایسی ہوتی ہیں جو وہ چاہتا ہے کہ وہ حاصل کرے مگر ہمیں علم نہیں ہوتا کہ آیا وہ ہمارے لیے بہتر بھی ہے یا نہیں تو اسی لیے خدا ہمیں وہ دیتا ہے جس کے ہم قابل ہوتے ہیں۔" اس نے اسے سمجھایا۔
"کیا یہ بھی ٹھیک تھا ہمارے لیے کہ سارہ کے پاپا ہمیں چھوڑ جاتے اور ہم دنیا کی ٹھوکریں کھاتے پھریں بولو؟" وہ چلائی تھی جب کہ شاہ ویز کو صحیح معنوں میں اس کی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کا اندازہ ہوا

تھا۔

''رباشہ! تم پہلی لڑکی تو نہیں ہو اس دنیا میں جس کا شوہر مر گیا بلکہ بہت سے ایسے موجود ہیں جن کے پیارے ان کو چھوڑ جاتے ہیں کیوں کہ ہر انسان کو ایک دن یہ دنیا چھوڑنی ہے صرف اللہ کی ذات ہے جسے کبھی زوال نہیں آنا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا تھا۔

''رباشہ! میں سمجھتا تھا کہ تم صرف انسانوں پر یقین نہیں رکھتی مگر تم تو اللہ پر بھی یقین نہیں رکھتیں اور دعا نہ مانگ کر تم اپنا ہی نقصان کر رہی ہو۔ جانتی ہو جو اللہ تمہیں بن مانگے بھی دے رہا ہے تو سوچو جب تم نے اس کے دربار میں ہاتھ اٹھائے تو کیا وہ تمہارے دامن کو خالی رکھے گا۔'' وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی تو شاہ ویز نے اپنے لب بھینچ لیے۔

''رباشہ......!'' اس نے پکارا تھا مگر وہ بغیر جواب دیے واش روم میں بند ہو گئی تو اس نے تاسف سے دیکھا۔

''یا اللہ! اس کی زندگی میں کوئی ایسا وقت لانا کہ اسے دعا کی قبولیت پر یقین ہو جائے۔'' اس نے پورے دل سے دعا مانگی تھی اور یہ لمحہ شاید قبولیت کا تھا۔

☆......☆

وہ سارہ کو اسکول چھوڑ کر واپس لوٹا تو ریحانہ آفندی کو اپنا منتظر پایا۔ وہ جلدی سے قدم بڑھاتا چلا آیا۔

''مما! آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔'' شاہ ویز نے ان کا پریشان چہرہ دیکھا۔

''ہاں ابھی تمہارے پاپا کا فون آیا ہے کہ وہ میٹنگ میں مصروف ہیں اور زرمین کو ایئر پورٹ لینے نہیں جا سکتے۔'' وہ فوراً بولیں۔

''تو اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے میں چلا جاتا ہوں۔'' وہ ان کو تسلی دے کر واپس مڑا تو ریحانہ آفندی مسکراتی ہوئی رباشہ کے کمرے میں چلی آئیں۔

''دیکھو لڑکی اپنا سامان واپسی کے لیے پیک کر لو۔ بس تھوڑے ہی دن ہیں تمہارے۔'' جب کہ وہ کچھ بھی نہ سمجھی۔

''وہ کیا ہے ناں میری بھانجی زرمین آ رہی ہے۔ اس کی ماں نے کہا کہ اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر دوں مگر جب گھر میں اتنا پیارا رشتہ موجود ہے شاویز کی صورت میں تو میں کیوں باہر جھانکتی پھروں۔ اب تم خود سوچو تمہاری گنجائش یہاں کہاں بچے گی۔'' وہ آرام سے ہاتھ جھاڑتی چلی گئیں جب کہ وہ دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔

''یا اللہ! ایک بار پھر مجھے دربدر ہونا پڑے گا۔'' اس نے کیا بھی تو اللہ سے شکوہ کیا تھا جو وہ ہمیشہ ہی کرتی تھی۔

☆......☆

شاہ ویز آفندی آج کل زرمین کے ساتھ ہی موجود ہوتا تھا۔ ابھی بھی رات گئے وہ لوگ واپس گھر آئے تھے۔ تو ریحانہ بیگم ان کو ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

''آنٹی! شاہ ویز کو اچھی طرح سے سمجھائیں، میں نے آئسکریم کا کہا تو مسٹر نے تھکن کا بہانہ تلاش کر لیا۔'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔

''اوہیلو میڈم! صبح سے آپ کے ساتھ پورے شہر میں آوارہ گھوم رہا ہوں اور ٹائم دیکھو ایک بج رہا ہے۔اس وقت آپ کے لیے آئس کریم کہاں سے ملے گی اور پھر رات کے اس پہر اتنی خوب صورت لڑکی کو کسی نے چھیڑ دیا تو؟'' آخر میں وہ شریر ہوا تو وہ ایک ادا سے مسکرائی اور فوراً اس کے کاندھے سے آ لگی۔

''تمہارے ہوتے ہوئے کسی کی ہمت ہے اور پتا ہے شاہ ویز تمہارے ساتھ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔'' وہ اپنے بال اِدھر سے اُدھر لہراتے ہوئے بولی تو وہ مسکرا دیا۔

''اچھا بس شاہ ویز میری بچی کو تنگ کرنا چھوڑو اور جو یہ کہے فوراً مان لیا کرو۔'' تو جواب میں شاہ ویز کورنش بجالایا جب کہ رباشہ نے دور سے یہ تمام منظر دیکھا تھا اور غصے سے تن فن کرتی وہاں سے نکل گئی۔

☆......☆

وہ آفس جانے کے لیے تیار ہوا تو اسے اپنی ٹائی نہیں مل رہی تھی اس نے رباشہ کو کہا مگر وہ بغیر کوئی رسپانس دیئے موبائل میں گیم کھیلنے میں مصروف رہی۔

''میں کچھ کہہ رہا ہوں تم سے۔'' اب کے اس نے دھیان سے اس کا غصہ ملاحظہ فرمایا تو اس کے بالوں سے کیچر اتار دیا جس سے سارے بال بکھر گئے اور شاہ ویز نے اس منظر کو اپنی آنکھوں میں جذب کیا۔

''کیا مسئلہ ہے دور رہیے مجھ سے جا کر اپنی اس چہیتی زرمین سے کہیں جس کے ساتھ آپ کے شب وروز گزر رہے ہیں۔'' وہ بے زاری سے بولی۔

''بیوی تم ہو تم سے کہوں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''تو اسے بنالیں بیوی اور میری جان چھوڑ دیں۔'' اس نے شاہ ویز کو پیچھے ہٹایا اور خود بیڈ سے اٹھ گئی۔

''تمہاری تو اب کبھی بھی جان نہیں چھوڑنے والا اور رہی بات مزید بیوی کی تو اب تم اجازت دے رہی ہو مزید شادی کی تو ایسی آفر کو کون ٹھکرائے گا۔'' اسے رباشہ کو تنگ کرنے میں مزہ آنے لگا جب کہ اسے ریحانہ بیگم کے کہے الفاظ سچ لگے۔اس نے بے یقینی سے دیکھا جو منہ میں آیا بولتی گئی۔

''تو اس کا مطلب ہے میں غلط تھی جو تم جیسے شخص پر اعتبار کر بیٹھی مگر مردوں کی فطرت کب بدلتی ہے۔ جہاں کوئی نیا چہرہ دیکھا وہیں لٹو ہو گئے اور تم تو اپنی فطرت سے کبھی باز ہی نہیں آسکتے کیوں کہ تمہارا کام ہی یہ ہے۔'' وہ چلائی تھی تو شاہ ویز کی برداشت بھی جواب دے گئی۔

''کیا فضول بکواس کر رہی ہو۔'' اس نے زور سے اس کی کلائی پکڑی۔

''اب تو میری باتیں تمہیں بکواس ہی لگیں گی۔'' وہ روتے ہوئے بولی تو شاہ ویز دھیما پڑ گیا اور اس کی کلائی آہستگی سے چھوڑی۔

''بہت پچھتاؤ گی تم۔'' وہ افسوس کرتے ہوئے بولا۔

''پچھتا تو رہی ہوں اب اور کیا پچھتانا۔''

''تو میں تمہارے لیے ایک پچھتاوا ہوں۔'' کس قدر ٹوٹا ہوا لہجہ تھا۔حالانکہ وہ اس کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا مگر لفظ ''پچھتاوے'' نے اس کی ہمت کو نچوڑ لیا۔

''ہاں۔'' وہ پھر بولی۔

''تو اس پچھتاوے سے چھٹکارا چاہتی ہو؟''
''ہاں۔'' اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے۔
''ٹھیک ہے تمہیں اب پچھتانا نہیں پڑے گا۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی کلائی کو چھوڑا اور کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس کا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب گاڑی کی اسپیڈ تیز ہوئی اور یہ اس کی بے خیالی کا ہی نتیجہ تھا کہ سامنے سے آتے ٹرک کو دیکھ نہ سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ بریک پاؤں رکھتا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں ڈوبتے ذہن میں جانے سے پہلے فقط رباشہ کا چہرہ تھا جو اس کی نظروں میں سمایا۔

☆......☆

''ہیلو رباشہ!'' زرمین آج پہلی بار اس کے کمرے میں آئی تھی۔ رباشہ نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی اندر چلی آئی۔
''کافی اچھی سیٹنگ کر رکھی ہے تم نے اپنے کمرے کی۔'' وہ جائزہ لینے لگی۔
''تھینک یو۔'' اسے کوفت ہونے لگی تھی اس کی موجودگی سے مگر پھر بھی ضبط کیا۔
''بہت خوش قسمت ہو جو شاہ ویز جیسا شخص تمہارے حصے میں آیا ہے۔ بہت تعریف کرتا ہے تمہاری۔ جب دیکھو تمہارا ہی نام لیتا ہے۔ گویا میرے کان پک گئے تمہارا نام سن کر۔'' وہ ہنسنے لگی تھی جب کہ وہ حیران ہو رہی تھی۔
''یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہی ہو۔'' وہ زیادہ دیر اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکی۔
''ظاہر ہے تم اس کی بیوی ہو تو تمہیں ہی بتاؤں گی۔'' وہ مسکرائی۔
''مگر تم دونوں تو شادی کرنے والے ہو ناں۔'' رباشہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔
''مسز شاہ ویز آفندی! کاش ایسا ہوتا مگر کیا ہے ناں یہ دل کسی اور پر آ گیا ہے میرا فرینڈ ہے اسد بہت جلد ہم ایک ہو جائیں گے اور شاہ ویز میرا بہت اچھا کزن ہے بس۔ ہاں اگر تم میری بے تکلفی کو غلط رنگ دے بیٹھی ہو تو میں تمہاری غلط فہمی کو دور کر دوں کہ وہ صرف تمہیں چاہتا ہے۔'' وہ کیا کہہ رہی تھی جب کہ وہ کیا سمجھی وہ شرمندگی سے زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔
''کیا یہ سب تمہیں شاہ ویز نے کہنے کے لیے کہا ہے؟''
''نہیں تو۔ اصل میں میری تھوڑی دیر بعد فلائٹ ہے تو میں نے سوچا تم سے ملتی جاؤں تو یونہی باتوں سے بات نکل گئی۔ خیر مجھے دیر ہو رہی ہے میں ذرا اپنا سامان چیک کر لوں۔''
غلط فہمی کے بادل چھٹے تھے تو وہ سب کچھ بھلا کر اس کے گلے لگ گئی۔

☆......☆

کتنی عجیب بات تھی کہ جسے اس نے اپنی زندگی میں محض مجبوری کی وجہ سے داخل کیا تھا۔ آج پورے حق سے اس کے دل میں قبضہ جما بیٹھا تھا کہ اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔ ورنہ اسے زرمین کے ساتھ شاہ ویز کا ملنا کیوں برا لگتا ہے۔ کس قدر جیلسی فیل ہوئی تھی اسے گویا وہ اسے کبھی برا ہی نہیں لگا تھا مگر پھر بھی کچھ ایسا تھا کہ دل میں اس کے لیے کسی اچھوتے جذبے نے سر اٹھایا تھا۔ وہ تو سوچتی تھی کہ دائم ہی اس کی زندگی کا لازمی جز ہے اس سے انکار بھی نہیں تھا جب تک وہ اس کی زندگی میں تھا اس نے پوری ایمانداری سے یہ

رشتہ نبھایا مگر جب شاہ ویز کو اس نے شامل کیا تو اس میں شاید اس کی خود غرضی شامل تھی۔ اسے اپنے لیے ایک گھر اور بیٹی کے لیے تحفظ چاہیے تھا جو اسے شاہ ویز کی صورت میں ملا جب کہ اس میں کہیں محبت شامل نہ تھی ہاں اس محبت کا ادراک اسے زرمین کے آنے پر ہوا تھا۔ جس کا اعتراف کر کے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اب اسے اگر انتظار تھا تو صرف شاہ ویز کے آنے کا تا کہ وہ اپنی بدتمیزی کی اس سے معافی مانگ سکے۔ صبح کا رویہ یاد کر کے اسے خود پر شدید غصہ آیا تھا مگر اسے یقین تھا کہ وہ شاویز کو منا لے گی۔ وہ مسکراتی ہوئی یہ سب سوچ کر بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگی مگر وقت تو لگ رہا تھا آج کچھوے کی چال چل رہا ہے یا پھر اسے محسوس ہو رہا تھا۔

☆......☆

فون کی گھنٹی متواتر بج رہی تھی تو ریحانہ بیگم ملازموں کو برا بھلا کہتی ہوئی خود فون اٹینڈ کرنے بڑھیں مگر دوسری جانب جو خبر دی گئی تھی وہ انہیں ہلا گئی۔ وہ وہیں بیٹھ کر رونے لگیں جب کہ سارہ جو اسکول سے لوٹی تھی دادی کو روتا دیکھ کر بیگ وہیں رکھ کر ان کے پاس چلی آئی۔

''دادو! آپ کیوں رو رہی ہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی تو ریحانہ آفندی اور رونے لگیں جب کہ سارہ بھاگ کر رباشہ کے کمرے میں چلی آئی۔

''مما! جلدی آئیں اُدھر دادو کو دیکھیں کیا ہوا؟'' وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اترنے لگی جب کہ وہ سارہ سے کچھ پوچھے بغیر جلدی سے ریحانہ بیگم کے پاس پہنچی تو انہیں یوں روتا دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئی۔

''آنٹی کیا ہوا ایسے کیوں بیٹھی ہیں۔'' ریحانہ آفندی رباشہ کے گلے لگ گئیں اور روتی ہی چلی گئیں اس وقت وہ بھول گئیں کہ وہ رباشہ سے نفرت کرتی ہیں اب صحیح معنوں میں رباشہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔

''آنٹی پلیز کچھ بتائیے بھی۔''

''شاہ ویز......!'' فقط اتنا کہا۔

''کیا ہوا شاہ ویز کو؟'' اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔

''تم جلدی سے ڈرائیور کو بولو گاڑی نکالے ہمیں ابھی ہاسپٹل پہنچنا ہو گا۔'' جب کہ وہ سرپٹ بھاگی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے اور پھر وہ تھوڑی ہی دیر میں آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھے اور یہاں آ کر اسے اصل صورت حال کا علم ہوا تھا تو وہ جیسے ڈھے سی گئی۔ لفظوں کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔

''تو میں تمہارے لیے ایک پچھتاوا ہوں۔'' شاہ ویز کی آواز گونجی تھی۔

''ہاں۔'' اس کے اپنے جواب نے اس کا منہ چڑایا۔

''تو اس پچھتاوے سے چھٹکارا چاہتی ہو؟'' لفظ تھے یا اس کی روح چھلنی ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے تمہیں اب پچھتانا نہیں پڑے گا۔'' قطرہ قطرہ آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے چلے گئے۔ کس قدر سنگدل تھی، اس کی وجہ سے شاہ ویز اس حالت تک پہنچا تھا۔

''اگر شاہ ویز کو کچھ ہو گیا تو......'' اور اس ''تو'' نے گویا اس کی جان نکال دی تھی۔

''تمہیں پتا ہے دعا انسان کی تقدیر بدل دیتی ہے۔ ایک بار اس کے دربار میں جھولی پھیلا کر تو دیکھو وہ تمہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا۔'' شاہ ویز کے کچھ دن پہلے کہے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے تھے اور وہ

خود کو مضبوط کرتی فوراً وضو کرنے چل دی اور سجدے میں جو سر رکھا پھر جو اس نے اشک کے موتی لٹاتے ہوئے اگر کچھ مانگا تھا تو صرف شاہ ویز کی صحت اور زندگی مانگی۔

☆......☆

ڈاکٹرز نے دو دن بعد شاہ ویز کے ہوش میں آنے کی خوش خبری سنائی تھی تو ریحانہ آفندی اور زریاب آفندی نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جب کہ ریحانہ آفندی نے اللہ کے حضور معافی بھی مانگی تھی کہ ان کے اس درجہ غرور کی وجہ سے اس کا بیٹا اس حالت میں پہنچا تھا۔

دونوں میاں بیوی پوتی کے ساتھ شاہ ویز کے پاس آئے تھے جو اس قدر اذیت میں بھی ان کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

''بس جلدی سے بیڈ چھوڑو بالکل بھی اچھے نہیں لگ رہے۔'' زریاب آفندی نے بیٹے کو بوسہ دیا جب کہ ریحانہ آفندی تو اس کے ساتھ یوں لگ کر بیٹھی تھیں کہ اگر وہ ایک پل بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہوا تو دوبارہ نہ دیکھ پائیں گی۔

''مما! میں ٹھیک ہوں بالکل، آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔'' شاہ ویز نے انہیں تسلی دی۔ جب کہ اس کی نظریں کسی کی متلاشی تھیں مگر اس سنگدل کو کہاں پرواہ تھی یا پھر اسے اذیت دینا اچھا لگتا تھا۔

''پاپا! میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں اور آپ کو پتا ہے کہ مما تو کب سے دعا کر رہی ہیں۔'' سارہ نے اس کو معلومات پہنچائیں تو شاہ ویز کے دل میں انوکھا سا احساس جاگا کہ رباشہ اس کے لیے اس قدر فکر مند ہے۔

''ہاں بھئی بہت اچھی بچی ہے۔ جب سے تم یہاں ہو وہ بچی مسلسل روتے ہوئے دعا مانگ رہی ہے تمہاری سلامتی کی۔'' زریاب آفندی نے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہارے پاپا، بہت محبت کرتی ہے تم سے۔'' ریحانہ آفندی نے بھی حصہ لیا تھا کیونکہ انہوں نے دل سے رباشہ کو تسلیم کر لیا تھا۔

''میں جا کر رباشہ کو دیکھتی ہوں اسے بھی تو تمہارے ہوش میں آنے کی خبر دوں۔'' وہ رباشہ کو بلانے کے لیے اٹھیں۔

☆......☆

''یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ میں بہت گناہ گار ہوں۔ میں نے ہمیشہ تجھ سے شکایتیں کی ہیں مگر پھر بھی تو نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں کس قدر نا سمجھ تھی کہ تیری مصلحت کو سمجھ ہی نہ پائی اگر تو نے دائم کو مجھ سے چھینا تو اس سے بڑھ کر نوازا تو نے شاہ ویز کو میری زندگی میں داخل کیا مگر میں نے پھر بھی تیرا شکر ادا نہیں کیا اور اس کی سزا مجھے مل رہی ہے مگر میرے مالک تُو تو رحیم ہے سب کی غلطیوں کو درگزر کرنے والا میرے بھی گناہوں کو معاف کر دے۔ بے شک تو رحیم ہے۔ میں تجھ سے شاہ ویز کی سلامتی مانگتی ہوں، یا اللہ مجھے میرا شاہ ویز لوٹا دے۔'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی کہ کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا اس نے متورم چہرہ اوپر اٹھایا تو ریحانہ آفندی تھیں۔

''بس کر میری بچی اللہ نے تمہاری سن لی ہے شاہ ویز کو ہوش آ گیا۔'' وہ بے اختیار سجدے میں گر گئی تھی۔ اس نے اللہ سے مانگنے میں اتنی دیر لگائی تھی مگر اس ذات کریم نے نوازنے میں چند سیکنڈ بھی نہیں

لگائے تھے اور یہی تو فرق ہے اس ذات باری تعالیٰ اور انسان میں کہ وہ خالی کبھی بھی نہیں لوٹاتا چاہے ہم اس کا شکر ادا کریں یا نہ کریں۔

☆......☆

وہ آنکھیں موندھے لیٹا تھا جب کسی کے قدموں کی چاپ ابھری تھی۔ وہ آنے والے کو خوب پہچانتا تھا مگر پھر بھی بدستور آنکھوں کو بند رکھا۔ رباشہ کچھ پل اسے پٹیوں میں جکڑا دیکھتی رہی۔ پھر آہستگی سے چلتی اس کے دائیں طرف آکھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''سوری شاہ ویز مجھے معاف کردیں۔'' آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور شاہ ویز کے چہرے کو نم کرنے لگے تو اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''کیوں اذیت دیتی ہو۔'' اس کا اشارہ آنسوؤں کی جانب تھا جب کہ رباشہ مزید ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی چلی گئی۔

''بس کرو اتنی تکلیف مجھے یہ زخم نہیں دے رہے جتنے تمہارے یہ آنسو دے رہے ہیں۔'' رباشہ نے اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو دیکھتے ہوئے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا۔

''شاہ ویز میں......'' وہ کچھ بولنا چاہتی تھی مگر شاہ ویز نے اس کی بات کو کاٹ دیا۔

''بس کچھ بھی نہیں کہنا، جو ہو گیا سب بھول جاؤ، کیونکہ اگر پرانی باتوں کو دہرایا جائے تو ان سے صرف تکلیف ہوتی ہے۔'' اس نے بغیر کچھ کہے ہی اسے معتبر کردیا تھا۔ رباشہ نے تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا۔

''لیکن آپ تو ناراض تھے مجھ سے۔'' وہ ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔

''ہاں تھا تو سہی بلکہ اب بھی ہوں۔'' اس نے خفگی دکھائی تو اس کی جان پر بن آئی وہ فوراً اس کے قریب چلی آئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا جب کہ وہ ہنس دیا پھر رباشہ اس کی چالاکی پر اسے گھورتی پیچھے ہوگئی۔

''جو تم پاس آکر دور چلی جاتی ہو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔'' شاہ ویز نے منہ بسورا۔

''فی الحال تو آپ آرام کریں اور تمام فضول باتوں کو ذہن سے نکال دیں تاکہ جلد از جلد ٹھیک ہو جائیں۔'' وہ واپس جانے کے لیے مڑی مگر اس کا آنچل اس کے ہاتھ میں رہ گیا تو وہ رک گئی کیوں کہ وہ اس پوزیشن میں ہرگز نہ تھا کہ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

اس نے سوالیہ نگاہوں سے شاہ ویز کو دیکھا۔

''تم جانتی ہو کہ......'' وہ سمجھ گئی کہ وہ اس سے اعتراف چاہتا ہے وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کا سمندر دیکھتی رہی پھر نگاہیں جھکائیں۔

''تم میری دعا ہو۔'' کس قدر خوب صورت اعتراف کیا تھا۔ شاہ ویز کا دل اطمینان سے بھر گیا تھا کہ وہ اس سفر میں اب اکیلا نہیں ہے کیونکہ رباشہ کے ساتھ نے اسے نئی منزل کی جانب گامزن کردیا تھا۔ وہ سکون سے پلکیں موندھ گیا۔ کیونکہ آنے والی زندگی میں ان کے لیے خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

......☆......

سائرہ مشال

ناولٹ

# میرے درد کی دوا کرے کوئی

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے ہلکی ہلکی سی معطر ہوا روح کو سرور سا بخش رہی تھی، اس خوشگوار سے موسم میں وہ بڑی مگن سی مرغیوں کو باجرہ ڈالنے میں مصروف تھی کہ رؤف لالہ کی پکار پر سب چھوڑ چھاڑ



کر دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی، سامنے کرسی پر لالہ کے دائیں جانب مدثر کو براجمان دیکھ کر اس نے عجلت میں دوپٹہ سر پر جمایا۔

''جی لالہ! کچھ کام تھا آپ کو؟'' وہ مدثر کو نظر انداز کر کے رؤف لالہ سے مخاطب ہوئی۔

''یہ ہر وقت چھت پر کیا کرتی رہتی ہو تم، جاؤ جلدی سے چائے بناؤ مدثر کب سے آیا بیٹھا ہے''۔ رؤف لالہ نے حسب عادت پہلے اسے لتاڑا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں حکم صادر کیا، وہ خاموشی سے سر جھکا کر باورچی خانے میں گئی۔

''مدثر نہ ہوا ملک کا وزیر اعظم ہو گیا، ہونہہ... شرم بھی نہیں آتی روزانہ دوسروں کے گھر حاضری دیتے ہوئے''۔ چائے کے ساتھ ساتھ اس کا خون بھی کھول رہا تھا، بڑبڑاہٹ مسلسل جاری تھی لالہ کے ڈر سے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات ٹرے میں سجا لئے وگرنہ اس کو تو زہر دینے کا دل کرتا تھا۔

''کھانے کا انتظام کر دینا آج یہ ہمارے ساتھ کھانا کھائے گا''۔ وہ میز پر چائے رکھ رہی تھی جب لالہ نے ایک اور فرمان جاری کیا۔

اس نے ایک کٹیلی نگاہ مدثر پر ڈالی جو ڈھیٹ بنا



بیٹھا تھا اور اپنی ایکسرے کرتی آنکھیں اس پر فٹ کئے ہوئے تھا، وہ تیزی سے باورچی خانے میں گھس گئی۔ بے کسی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، اگر اماں یا بھابی میں سے کوئی بھی ہوتا تو وہ کبھی نہ اس شخص کی غلیظ نظروں کا سامنا کرتی مگر اس وقت مجبوری تھی، اماں بھابی کو لے کر اسپتال گئی تھیں، بھابی کو خدا نے شادی کے سات سال بعد خوشی کی نوید دی تھی اماں اپنے لخت جگر کی نااہلی سے بخوبی واقف تھیں سو اسپتال لانے لے جانے کی ذمہ داری خود ہی سنبھال لی تھی۔

لالہ کے سالے صاحب کی خاطر داری میں کمی اپنی شامت بلانے کے مترادف تھا سو اپنے گلابی آنچل سے جھیل سی سبز آنکھوں کو بے دردی سے رگڑا اور دل میں آئے بھونچال کو نظر انداز کرتی لالہ کے حکم کی تعمیل میں جت گئی آخر کو بنت حوا جو ٹھہری۔

☆............☆............☆

عالیہ اور رؤف دو ہی بہن بھائی تھے، عالیہ رؤف سے چودہ برس چھوٹی تھی۔ ابراہیم اور انیسہ کی شادی کے سال بھر بعد ہی رؤف پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے تیسرے دن اسماعیل (ابراہیم کا بڑا بھائی) کے گھر مدثر کی ولادت ہوئی۔ دو سال بعد زینت کی آمد پر انیسہ نے جھٹ اسے اپنے بیٹے رؤف کے لئے مانگ لیا۔ یوں بھی ان دونوں دیورانی جیٹھانی میں روایتی پرخاش نہیں تھی۔

خود انیسہ نے رؤف کے بعد پانچ مردہ بچوں کو جنم دیا، گاؤں کی کچھ پرآشوب عورتوں نے اسے خوب ورغلانے کی سعی کی، بھانت بھانت کے جادو ٹونے کے قصے سنائے لیکن انیسہ نے ان کی فضول گوئیوں پر کان نہیں دھرے، وہ سادہ لوح ضرور تھی مگر جاہل ہرگز نہیں تھی۔ اپنے رب پر اس کا عقیدہ مضبوط تھا وہ اس کی رضا میں راضی تھی اور بالآخر خدا نے اس کی خاموشی اور صبر کا پھل عالیہ کی صورت دے دیا۔

دونوں گھرانوں میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ ابراہیم نے تمام گاؤں والوں کی دعوت کی، دیگیں پک رہی تھیں جشن کا سماں تھا، پورا گھر عورتوں سے بھرا پڑا تھا، ننھی عالیہ انیسہ کی گود میں تھی پاس ہی مدثر بیٹھا اس کے گداز وگلابی گالوں پر پیار کر رہا تھا، تبھی ثمینہ (مدثر کی امی) نے علی الاعلان اس ننھی گڑیا کو مدثر کے لئے مانگا، انیسہ چند ثانیے سوچ میں پڑ گئی۔

عالیہ مدثر سے چودہ برس چھوٹی تھی لیکن عمروں کی تفریق میں پڑ کر وہ اپنی بہن جیسی جیٹھانی کی ناراضی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، ویسے بھی ان کے علاوہ اس کا تھا ہی کون خود انیسہ کے سارے بہن بھائی شہر میں سیٹل تھے۔

جبھی مسکراتے ہوئے سوئی ہوئی اس ننھی پری کو ثمینہ بھابی کی گود میں ڈال دیا۔

"لو بھرجائی آج سے یہ تمہاری ہوئی، اب خوش"۔ ثمینہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "اس نے گل گوتھنی سی عالیہ کو سینے سے لگا کر چٹاچٹ چوما۔

لڑکپن کو عبور کرتے مدثر کے شعور میں یہ بات بڑے عجیب انداز میں اثر انداز ہوئی کہ اب سے یہ نازک سی گڑیا اس کے نام ہو گئی۔

☆............☆............☆

زینیا پچھلے بیس منٹ سے اپنی مطلوبہ بس کا انتظار کر رہی تھی، مگر تا حال بس کے آنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے کیونکہ آج سی این جی ہڑتال کی وجہ سے گاڑیاں خال خال ہی آ رہی تھیں۔ مسلسل دھوپ میں کھڑے رہنے سے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی، نقاب زدہ چہرہ پسینے میں تربتر تھا اس نے اکتائی ہوئی نگاہ اطراف پر ڈالی، پورا کالج خالی ہو چکا تھا، اس کے ساتھ کی تمام لڑکیاں اپنی اپنی گاڑیوں میں گھروں کو روانہ ہو چکی تھیں۔ غالباً پیچ بھی چکی تھیں، ایک وہی تھی جو اس چلچلاتی دھوپ سے نبرد آزما ہوتی بس کے انتظار میں خوار ہو رہی تھی۔ اس نے تلملا کر ہاتھ

میں پکڑے رجسٹر کا سایہ سر پر کیا کیونکہ سورج کی تپش سیدھا اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

اس نے جھلستی ہوئی اکتاہٹ آمیز نگاہ سامنے ڈالی اور جم سی گئی، سامنے سڑک پر وہی لڑکا کھڑا تھا جس نے کل جان بوجھ کر زینیا کے قدموں میں اپنا نمبر پھینکا تھا۔

بلیو پینٹ پر کالے رنگ کی شرٹ پہنے کالر کے بٹن کھلے چھوڑے درخت سے ٹیک لگائے وہ پہلی نظر میں ہی ایک نمبر کا لفنگا لگا جن کا لڑکیوں کو تاڑنا اور ان پر جملے کسنا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ زینیا کے متوجہ ہونے پر وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنسا، دور ہونے کے باوجود دانتوں پر جمے گٹکے کے نقش و نگار بڑے واضح دکھائی دیے۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر زینیا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس نے اطراف پر نگاہ ڈالی سڑک سنسان پڑی تھی، چند ایک دکانیں اگرچہ کھلی بھی تھیں مگر وہاں موجود افراد اپنے کام میں منہمک تھے، سبھی چہرے اجنبی تھے، نہ کوئی شناسا تھا اور نہ پیشکار، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا روح قبض کرنے والا فرشتہ اس کے قریب آ رہا ہو، اس عالم بے کسی میں اس نے سختی سے آنکھیں میچ کر بڑی شدت سے اپنے رب کو پکارا، لمحہ بھر کی بات تھی وہ صرف دو قدم کے فاصلے پر تھا تبھی ان کے درمیان رکشہ آن رُکا، زینیا ارد گرد دیکھے بنا غڑاپ سے اس میں بیٹھ گئی۔

ڈرائیو بھی شاید معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا اس لئے بنا کچھ کہے رکشہ اسٹارٹ کیا، کچھ دیر بعد حواس قدرے بحال ہوئے تو رکشہ انجانے راستوں پر دیکھ کر فوراً اسے ٹوکا۔

"یہ کہاں جا رہے ہیں آپ، میرا گھر اس طرف تو نہیں"۔

"اب اس میں میری غلطی تھوڑی ہے آپ نے مجھے بتایا کب کہ آپ نے کہاں جانا ہے"۔ لگ بھگ چوبیس پچیس سالہ نوجوان ڈرائیور کی جانب سے موصول ہونے والے جواب پر وہ برہم سی ہو گئی۔

"تو آپ پوچھ تو سکتے تھے ناں"۔ وہ کلستے ہوئے بولی۔

"اس وقت آپ کی حالت اور موقع کی نزاکت دیکھ کر مجھے وہاں آپ سے پوچھنا مناسب نہیں لگا"۔

اس نے سنجیدگی سے اس کو پتہ سمجھا کر باہر کے مناظر پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

"ویسے وہ تھا کون؟" وہ جو ارد گرد سے غافل بیٹھی تھی اس کے استفسار پر بری طرح چونکی۔

"کون، کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟" نوجوان کے کھوجتے انداز پر وہ گھبرائی ضرور مگر بظاہر تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

زینیا کی اس قدر حواس باختگی پر وہ خاصا محظوظ ہوا۔ اس کی مسکراہٹ زینیا سے مخفی نہ رہ سکی، اسے اپنی سنگین غلطی کا ادراک بڑی شدت سے ہوا۔ اس بھری دوپہر میں اکیلی رکشے میں بیٹھنے کی کتنی بڑی حماقت کر چکی تھی۔ ویسے بھی وہ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی نہایت ہی ڈرپوک اور دبو قسم کی لڑکی تھی، اپنے خاندان کی وہ پہلی لڑکی تھی جس نے اسکول کے بعد کالج تک کا سفر طے کیا، وگرنہ اس کی تمام کزنز میٹرک کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ چکی تھیں۔ اپنی ضد اور شوق کی بدولت وہ یہ اعزاز حاصل کرنے میں تو کامیاب ہو چکی تھی مگر تا حال اس دنیا کے چال چلن سے قطعی نابلد تھی، تبھی اس سڑک والے لڑکے کی حرکتوں اور اس نوجوان کی باتوں نے اسے خاصا حواس باختہ کر دیا تھا۔

وہ اپنے خیالات کی رو میں بہتی چلی جا رہی تھی تبھی رکشہ جھٹکے سے رُکنے پر اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا، سامنے اپنے دو کمروں پر مشتمل گھر کو دیکھ کر اس کے اندر ڈھیروں سکون و اطمینان اترتا محسوس ہوا، وہ تیزی سے اتری اور نوجوان کو پیسے تھما کر جلدی سے گھر

میں داخل ہوئی۔
''السلام علیکم امی''۔ فریال بیگم اس کے انتظار میں صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔
''وعلیکم السلام بیٹا! اتنی دیر کیوں کر دی تم نے آنے میں، میرا تو دل ہول رہا تھا''۔ زینیا جو ان کے گلے میں بانہیں ڈالے لاڈ کرنے میں مصروف تھی ماں کا تفکر آمیز انداز دیکھ کر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔
''دراصل سی این جی ہڑتال کے سبب گاڑیاں خاصی کم چل رہی تھیں اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔ آپ کھانا نکالیں میں یونیفارم چینج کر کے آتی ہوں''۔ امی کی پریشانی کے خیال سے درمیان کی بات گول کر گئی۔

زینیا کمرے میں آئی تو شفا انگلش بک سینے پر رکھے سو رہی تھی۔ شاید یاد کرتے کرتے آنکھ لگ گئی تھی، وہ شفا کے اس معصومانہ انداز پر بے ساختہ مسکرائی۔ کتاب بند کر کے سائیڈ پر رکھی اور پاس پڑی چادر اس پر درست کی، اس کے ہر فعل سے شفا کے لئے بے تحاشا پیار چھلک رہا تھا۔ ہر انداز محبت آمیز نرمی لئے ہوئے تھا اسے خود سے تین سالہ چھوٹی اپنی یہ گڑیا جیسی بہن بہت عزیز تھی، اس کا دایاں گال محبت سے چوم کر دبے قدموں باہر آئی۔
صحن میں امی دستر خوان لگائے اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔
''شفا کو بھی تو بلاؤ اس نے بھی تو کھانا نہیں کھایا''۔ اس کو اکیلے آتے دیکھ کر فریال بیگم بولیں۔
''پر وہ تو سو رہی ہے امی''۔ وہ فریال بیگم کے برابر میں بیٹھی۔
''دیکھا میں نے کہا بھی تھا اس لڑکی کو پہلے کھانا کھا لو لیکن نہیں، اس کی تو اپنی منطق ہے کہ اکیلے نہیں کھاؤں گی''۔ فریال بیگم شفا کی اس فضول عادت سے سخت نالاں تھیں۔
''تو امی! آپ بیٹھ جاتیں ناں اس کے ساتھ، وہ بے چاری بھوکے پیٹ تو نہ سوتی، ویسے بھی ایگزامز کے چکر میں وہ کتنی کمزور ہو گئی ہے''۔ زینیا کو سخت افسوس ہو رہا تھا اس کے یوں بھوکے سونے پر۔
شفا میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی اور بے حد محنتی اور پراعتماد قسم کی لڑکی تھی۔ وہ اپنی اس گڑیا جیسی بہن کی خود اعتمادی اور ذہانت سے از حد متاثر تھی (کیونکہ خود اس میں خود اعتمادی کا خاصا فقدان تھا) وہیں اس کی ایک عادت سے سخت نالاں بھی کہ وہ کھانا کبھی اکیلے نہیں کھاتی تھی۔
ایگزامز کے دنوں میں وہ دیر تک جاگتی رہتی اس اثناء میں اگر اسے کھانا درکار ہوتا تو وہ آدھی رات کو بھی اسے جگانے میں ذرا تامل نہیں کرتی۔ وہ بھی مجبوراً اس کا ساتھ دیتی کیونکہ اس کے لئے تو وہ اپنی نیند کیا اپنی جان بھی قربان کر سکتی تھی، زینیا کے نزدیک اپنی اہمیت کا اندازہ شفا کو بھی بخوبی تھا تبھی تو وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتی۔
''کیسے کھا لیتی بیٹا! جب تک تم گھر نہ آ جاؤ تو میرے حلق سے پانی کی بوند تک نہیں اترتی۔ ویسے بھی آج کل زمانہ کتنا خراب ہے''۔ فریال بیگم کے لہجے میں مخصوص ماؤں والے اندیشے بول رہے تھے۔
کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بھی زور شور سے ان کی تائید کرتی، لیکن اس وقت زینیا پر اس اجنبی نوجوان کی شرافت و اچھائی کا خمار چھایا تھا تبھی سر نفی میں ہلایا۔
''نہیں امی! زمانہ نہیں خراب، بس کچھ لوگ بے راہ روی کا شکار ہیں مگر فقدان اچھے لوگوں کا بھی نہیں، ہمیں بروں کے بداعمال میں اچھوں کی اچھائیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے مگر ہمارا المیہ یہی ہے کہ ہم سب کو ایک ہی ترازو میں تولتے ہیں، اچھوں کو بھی بروں کی صف میں کھڑا کر کے قصور سارا پھر زمانے پر ڈال دیتے ہیں''۔ امی کی بات کی تصحیح کر کے نہایت فہم و فراست سے مثبت رخ دکھایا۔

☆..........☆..........☆

''اماں! میں یہ روٹیاں پکا لوں پھر میں نہاؤں گی، بھابی کے لئے حلوہ تم خود بنا لینا''۔ انیسہ کو باورچی خانے میں داخل ہوتے دیکھ کر عالیہ منہ بسورتے بولی۔

''چل ٹھیک ہے جب تک تو روٹیاں پکا میں تیرا جوڑا استری کرتی ہوں''۔ انیسہ نرمی سے گویا ہوئیں۔

''رہنے دے اماں! جوڑا میں استری کر چکی ہوں تم بس یہ حلوہ پکا لو''۔ وہ آخری روٹی توے پر سے اتار کر جلدی سے دستر خوان میں لپیٹنے لگی۔

رؤف لالہ کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی مہمانوں کی آمدورفت کے سبب پچھلے پانچ روز سے اسے کپڑے بدلنے کی فرصت بھی میسر نہیں ہوئی۔

ہاتھوں پر لگا آٹا صاف کرنے کے بعد وہ کپڑے اٹھا کر تیزی سے غسل خانے میں گھسی مبادا پھر سے کوئی مہمان آ کر اس کا ماسی زدہ حلیہ ملاحظہ نہ کر لے۔

وہ نہا کر نکلی تو اپنا آپ خاصا ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ اپنے لمبے بالوں کو تولیے میں لپیٹ کر کمرے میں آئی تو اماں اور بھابی دونوں ہی محو استراحت تھیں، اس نے بھابی کے پہلو میں سوئے اپنے گول مٹول بھتیجے کے روئی جیسے گال پر بوسہ لیا اور جائے نماز اٹھا کر کمرے سے باہر آئی، ظہر کی نماز ادا کر کے دل کو سکون پہنچانے کے بعد چھت کا رخ کیا۔

جاڑوں کی دھوپ کا بھی اپنا ہی ایک الگ لطف ہوتا ہے۔ عالیہ نے اپنا دوپٹہ اتار کر کپڑوں کے لئے باندھی گئی رسی پر ڈالا اور بالوں کو تولیے کی قید سے آزاد کر دیا، بال اب قدرے خشک ہو چکے تھے۔

نرم گرم سی دھوپ بڑے لطیف انداز میں اس کے وجود کو چھو رہی تھی۔ وہ بڑی سرور سی بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی، معاً اس کی نظر زمین پر نظر آتے سائے پر پڑی جو آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا، وہ تیزی سے پلٹی تو سامنے مدثر کھڑا تھا، اس نے جلدی سے دوپٹہ اپنے وجود کے گرد لپیٹا اور ناگواری سے اسے دیکھا جو بڑی بے باک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ارے بھئی ہم سے کیا پردہ، ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں''۔ اس کی طرف معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے گھٹیا پن سے گویا ہوا۔

اس کی بے ہودہ گوئی پر عالیہ کا دماغ جھنجھنا اٹھا اس نے سختی سے لب بھینچ کر سخت برہم نظروں سے اس کو دیکھا۔ وہ ڈھٹائی سے اس کی تنفر چھلکاتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

اس کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ دھاڑی۔

''میرے پاس مت آنا مدثر! میں اب وہ پہلے والی چھ سال بچی نہیں رہی جو تمہارے شکنجے میں آ کر بے بس ہو جاتی تھی اور تم جی بھر کر اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے''۔

بنا اس کے بھڑکنے کی پروا کئے ایک ہی جست میں وہ اس کے قریب آیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر کر کے اپنے حصار میں جکڑا، اس کے ناپاک لمس سے وہ بلبلا اٹھی۔

''میں یہاں تیری بک بک سننے نہیں آیا، بس تجھے خبردار کرنا تھا کہ اماں چند روز میں چچی سے شادی کی بات کرنے آ رہی ہے تو اپنی تیوریاں ٹھیک کر لے اور جو پہلے ہو چکا ہے اسے بھول جا''۔ اس کی قہر زدہ آنکھوں میں دیکھتے یوں گویا ہوا گویا بہت معمولی سی بات ہونے کا کہہ رہا ہو، اس اعلیٰ درجہ ڈھٹائی پر وہ مزید متنفر نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیا بھول جاؤں میں، یہ کہ کس طرح تم نے میری معصومیت کو اپنی ہوس سے آلودہ کیا، یا یہ بھول جاؤں کہ جو بے فکری کا دور اپنی سکھیوں کے سامنے کھیلنے کودنے کا تھا وہ تمہارے خوف کی نذر ہو گیا؟ یا پھر یہ بھول جاؤں کہ جس عمر میں مجھے اسکول جانا تھا وہ عمر میں نے گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر تمہارے سائے سے خود کو بچاتے گنوا دی''۔ اپنی پامالی پر وہ ماتم

کناں تھی، کیا نہیں تھا اس کے لہجے میں، دکھ، تڑپ، کسک، غم و بے بسی مگر مقابل محبت الفت جیسے جذبے سے بے بہرہ نہایت ہی سنگدل و بے حس انسان جس کے چہرے پر ڈھونڈنے سے بھی پچھتاوے یا شرمندگی کا تاثر نظر نہیں آیا۔

"بس زیادہ ڈائیلاگ مت مار میرے پر، ایسا کوئی گناہ نہیں کر دیا میں نے، منکوحہ ہو تم میری، اگر ایسے میں تھوڑا سا بہک گیا تو کون سی قیامت آ گئی، ویسے بھی اپنی غلطی کا ازالہ کر تو رہا ہوں، کون سا تمہیں اپنانے سے انکار کر دیا جو تم یوں واویلا کر رہی ہو"۔ اس اجڈ انسان کی بے حیائی کی انتہاؤں کو چھوتی گفتگو نے اس کے اندر تلاطم برپا کر دیا، وہ پھٹ پڑی۔

"تو کیا مجھے ٹھکرائے گا میں خود تیری رفاقت پر ہزار بار لعنت بھیجتی ہوں۔ یاد رکھ مدثر! میں مر جاؤں گی مگر اپنے وجود کو تیری خلوت گاہ کی زینت نہیں بناؤں گی، تیری سیج پر میں قبر کی آغوش کو ترجیح دوں گی۔ تجھ جیسے ہوس کے مارے ناپاک انسان سے رشتہ جوڑنے سے موت سے رشتہ استوار کرنے کو میں اپنی خوش بختی گردانوں گی"۔ تحقیر آمیزی سے اپنی بات مکمل کر کے ایک نفرین نگاہ اس پر ڈال کر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

☆..........☆..........☆

زندگی کی گاڑی اپنے مخصوص انداز میں رواں دواں تھی، گزرتے وقت کے ساتھ گڑیا سی عالیہ بھی اب بڑی ہو رہی تھی، وہ سب کی آنکھوں کا تارا گھر بھر کی لاڈلی تتلی کی مانند اڑتی پھرتی۔

وہ تھی بھی ایسی جو بھی دیکھتا پیار کیے بنا نہ رہ پاتا، بے تحاشہ گوری رنگت اور بھورے بالوں کے سبب اس پر باربی ڈول کا گمان ہوتا۔ مستزاد گداز گالوں کا گلابی پن اور پلکوں کی گھنیری جھالر کے نیچے کانچ سی شفاف نیلی آنکھیں دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتی تھیں۔

سوائے رؤف لالہ کے سبھی اس سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ ابراہیم کی تو اس میں جان تھی، گو کہ اب وہ بڑھاپے کے سفر پر گامزن تھے اور بیماریوں نے خاصا نڈھال کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ عالیہ کے منہ سے نکلنے والی ہر فرمائش کو بلا تامل پورا کرتے، ان ڈھیروں محبتوں کے باوجود رؤف لالہ کی سرد مہری اور بے اعتنائی نے اس کی ذات میں خلا سا چھوڑ دیا تھا۔ اس خلا کو پُر کرنے کا اس کے پاس واحد ذریعہ مدثر تھا، جس کو لالہ لالہ کہتے ہمہ وقت اس کے گرد منڈلاتی رہتی جو اس کی سنتا اس کی مانتا تھا حتیٰ کہ اس کے ساتھ لڑکیوں والے کھیل بھی کھیلتا تھا۔

اپنی سکھیوں میں بیٹھ کر عالیہ کے لبوں پر ہمہ وقت اپنے مدثر لالہ کے چرچے ہوتے، اپنے مابین رشتے کی نوعیت سے لاعلم جب وہ بڑے معصومانہ انداز میں مدثر کو لالہ کہہ کر مخاطب کرتی تو اس کی جھنجھلاہٹ دیکھ کر انیسہ مسکرانے لگتیں، وہ جانتی تھیں کہ عالی کا انداز تخاطب مدثر کو نہیں بھاتا لیکن انیسہ نے تا حال اسے بے خبر ہی رکھا تھا، وہ اس کا شفاف ذہن پراگندہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی محض چھ برس کی تو وہ تھی۔

پھر یکا یک ابراہیم کی موت نے اس کو گم صم کر دیا، اس کی شرارتیں معصومیت بھری باتیں سب کچھ کہیں کھو گیا، اس کے ننھے سے ذہن کو صدمہ بھی تو بڑا شدید پہنچا تھا۔ رؤف لالہ کے شب و روز کا وہی معمول تھا، دن چڑھے تک سوتے رہنا اور آدھی آدھی رات تک اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ سڑکیں ناپنا، انہیں نہ باپ کے مرنے کا کوئی دکھ تھا نہ چھوٹی بہن کی فکر اور نہ بیوہ ماں کی کوئی پرواہ تھی۔ اس رات بھی وہ اپنے نکمے ٹولے کے ہمراہ مٹر گشتی کے لئے نکلے تھے انیسہ عشاء کی نماز ادا کر رہی تھیں ان کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر نہایت یکسوئی سے نماز پڑھتیں اور اس کے بعد تلاوت، خواہ ایک رکوع ہی پڑھ لیتیں لیکن پڑھتی ضرور تھیں، اس

وقت بھی وہ اپنے مخصوص کمرے میں عبادت میں مشغول تھیں دروازے کے کھٹکے پر عالیہ نے فوراً سے دروازے کی سمت دوڑ لگائی کہیں اماں کی عبادت میں خلل نہ پڑ جائے۔ دروازہ کھولنے پر سامنے مدثر کو ایستادہ پایا۔ مدثر کو دیکھ کر وہ بے اختیار سی اس سے لپٹ کر رونے لگی، ابراہیم کی موت کا آٹھواں دن تھا، ان آٹھ دنوں میں پہلی بار اس کا سامنا مدثر سے ہوا تھا، ابراہیم کے انتقال کے بعد وہ افسردہ دل لئے گم صم سی ایک کونے میں بیٹھی رہتی۔ رؤف لالہ کے پاس اس کی دلجوئی کی فرصت نہیں تھی مدثر نے اسے اپنے ساتھ بھینچا تو وہ اور شدتوں سے رودی۔

اسے اپنے حصار میں لیئے وہ کمرے میں لایا، اپنے قریب بٹھا کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"چچی کہاں ہے؟" چاروں اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"اماں نماز پڑھ رہی ہے"۔ وہ اٹکتے ہوئے بولی، رونے کے باعث اس کی ہچکیاں سی بندھ گئیں۔ کمرے میں موجود واحد بلب کی مدھم سی زرد سی روشنی میں وہ چھوٹی سی بچی اس کے حواس سلب کر رہی تھی، اس کی جانچتی نظریں پھسلتی جارہی تھیں۔ اندر کا ہوس پرست مرد بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔ وہ ہولے سے اس کے نم گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا، اس کی شیطانیت سے بے خبر وہ آنکھیں موند کر اس کے بازو سے سر ٹکا گئی، مسلسل گریہ وزاری نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

وہ انسان سے شیطان بن کر ذلت کی پستیوں میں گرتا چلا گیا۔ بڑی بے رحمی سے اس گڑیا کو اپنے حصار میں جکڑا اور اپنا ہاتھ اس کے تھرتھراتے لبوں پر مضبوطی سے جمایا، چند لمحوں کا کھیل تھا محض کچھ پل میں وہ کانچ کی گڑیا ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگئی۔

جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا توں توں اسے اپنا ناقابل تلافی نقصان کا ادراک بھی شدت سے ہو رہا تھا، اس کا مان اس کا غرور سب کچھ چھین لینے کے باوجود وہ بغیر کسی شرمساری کے ان کے گھر میں دندناتا پھرتا اور وہ اپنے ہی گھر میں کسی مجرم کی طرح اس سے کونوں کھدروں میں چھپتی پھرتی۔

تایا کے گھر جانا تو وہ کب کا چھوڑ چکی تھی، لیکن اسکول آتے جاتے وہ اسے گھیر لیتا، اس کا حق جتاتا انداز اور آنکھوں میں رقص کرتی ہوس اس کو سراسیمہ و خوفزدہ کرتی۔ پہلے تو وہ اپنی نادانی میں نقصان اٹھا چکی تھی مگر اب جانتے بوجھتے مزید خود کو رسوا کرنا نہیں چاہتی تھی، سو مڈل کے بعد ہی اس نے اسکول کو خیرباد کہہ دیا۔

انیسہ اس کے یوں پڑھائی چھوڑنے پر سخت خفا ہوئیں، شدید ناراضی کا اظہار بھی کیا مگر وہ مجبور تھی وہ اماں کی ناراضی تو سہہ سکتی تھی لیکن خود کو مزید رسوائی کی نظر نہیں کر سکتی تھی سو چپ چاپ اماں کی کڑوی کسیلی سنتی رہی۔ کئی مرتبہ اماں کو بتانے کی ٹھانی مگر حیا آڑے آگئی۔

مگر اب وہ ٹھان چکی تھی کہ نہ حیا کو اپنے ہونٹوں کا قفل بنائے گی اور نہ رشتوں کو اپنے پیروں کی بیڑیاں، اب سوال پوری زندگی کا تھا اور زیست کے سفر میں اس بدکار شخص کی ہمراہی اسے قطعی قبول نہیں تھی۔

☆..........☆..........☆

"جان! میں تمہیں بے تحاشہ چاہنے لگا ہوں، میری محبت بے لوث ہے میرے جذبات بے ریا ہیں میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں، پلیز مجھ سے دوستی کر لیں میں کبھی کوئی غلط ڈیمانڈ نہیں کروں گا، بس مجھ سے چند پیار بھری باتیں کر لیا کرو، میری محبت کی تسکین کے لئے پلیز جان مان جاؤ ناں"۔ رانگ نمبر سے آنے والے اس میسج نے اسے چکرا کر رکھ دیا، سراسیمگی سے بغور اس نمبر کو دیکھنے لگی، بہت سوچنے پر بھی اسے یاد نہیں آیا کہ اس کی کوئی ایسی کلوز فرینڈ رہی

ہو جو محض تفریح کے لئے اسے تنگ کر رہی ہو، کالج میں وہ بڑے لئے دیئے انداز میں رہتی اور اپنا سیل نمبر تو وہ بہت کم کسی سے شیئر کرتی، اس معاملے میں وہ خاصی محتاط تھی۔ سیل فون ہاتھ میں لئے پُرتشویش نظروں سے اسکرین کو تک رہی تھی۔ شفا چہکتے ہوئے کمرے میں آئی۔

''آپی جانی! جلدی سے تیاری پکڑیں بڑی مشکلوں سے شانی بھیا ہمیں لے جانے پر راضی ہوئے ہیں''۔ شفا کھلکھلاتے ہوئے بولی، لاڈ میں آ کر وہ ہمیشہ اسے آپی جانی کہہ کر مخاطب کرتی۔

وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی، اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر شفا کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔

''اب آپ کو سمجھانے کے لئے مجھے پھر فلیش بیک میں جانا پڑے گا تو سنیں، آج سے ٹھیک آٹھ دن پہلے ہمارے اکلوتے ہینڈسم اینڈ گڈ لکنگ بڑے بھیا شایان عرف شانی کا رشتہ امی کی سیکنڈ کزن کی دختر نیک اختر سامیہ سے طے پایا جبکہ باضابطہ طور پر منگنی کی تقریب میں بارہ دنوں کا گیپ رکھا، اسی دوران ہماری پیاری امی جان بخار کی لپیٹ میں آ گئیں، ہماری تمام تیاریاں ادھوری رہ گئیں کیونکہ امی جان تو طبیعت کی ناسازی کی بنا پر بازاروں میں گھومنے پھرنے سے قاصر ہیں اس لئے میں نے بڑی منت سماجت کے بعد اپنے شیر جیسے بھائی کو قابو کیا ہے، تو آپ بھی کچھ دیر کے لئے اپنے خیالی پلاؤ کا ارادہ ملتوی کریں اور ہمارے ساتھ جانے کی زحمت کریں''۔ شفا کی زبان تیز گام کی طرح چل رہی تھی اتنی ہی تیزی سے اس کے ہاتھ بھی کمرے میں بکھری چیزوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ اس کی پریشانی کو شفا کی باتوں نے پل بھر میں غائب کر دیا۔

''ویسے آپی! میں سوچ رہی ہوں اپنے لئے ویسا ڈریس خریدوں''۔

''کیسا ڈریس؟'' شفا کے پرجوش انداز پر وہ بھی متجسس ہوئی۔

''جیسا کل مارننگ شو میں ہوسٹ نے پہنا تھا شانی بھیا کو بھی میں کہہ چکی ہوں ہم کسی اچھے سے بڑے مال سے شاپنگ کریں گے، چھوٹی موٹی مارکیٹوں میں ویسے ڈریس نہیں ملتے''۔ زینیا اس کے معصومانہ انداز پر بے ساختہ مسکرا دی۔

شفا خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ اسے مزید اپنی شاپنگ پلان کے متعلق بتا رہی تھی، اس کا دمکتا چہرہ اندرونی خوشی کا غماز تھا، خوش تو زینیا بھی بہت تھی آخر کو اس کے اکلوتے بھائی کی منگنی تھی لیکن شفا کی خوشی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ اس کی ہر بات کی تان کپڑوں جوتوں اور جیولری پر آ کر ٹوٹتی۔

زینیا بڑی محبت و توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ عبایہ کے اوپر اپنا پرپل پرنٹڈ اسکارف بھی سیٹ کرنے میں مگن تھی۔ موبائل بپ ہونے پر اس نے رخ پھیر کر میسج اوپن کیا۔

''I Love u, i really love u jan''۔ اس فضول لفاظی پر اس کے اندر اکتاہٹ و بیزاریت سی چھانے لگی۔

محبت جیسی انمول شے کو آج کل کی نوجوان نسل نے کس قدر بے مول کر دیا تھا۔ محبت تو بڑا پاکیزہ سے جذبے کا نام ہے مگر آج کل کی نوجوان نسل سستے سے پیکجز کروا کے محبت کے نام پر ایسی ایسی گفتگو کرتی جسے سن کر ابلیس بھی دنگ رہ جائے۔

''تم لوگوں کو اور کتنا ٹائم لگے گا بھئی''۔ وہ متاسفانہ سوچوں کے گرداب میں الجھی تھی یکدم شانی بھیا کی آمد پر چونک کر خائف نظروں سے انہیں دیکھا لیکن وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھے، اس نے نامحسوس طریقے سے اپنا سیل فون والا ہاتھ پیچھے کیا۔

''بس بھائی دو منٹ میں آ رہے ہیں''۔ شفا نے عجلت بھرے انداز میں الماری میں اپنا اسکارف تلاش کرتے جواب دیا۔

''تو تم تیار ہو ناں؟'' بھیا اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ بھائی کے استفسار پر بدقت مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

شانی بھیا کے جاتے ہی اس نے کب کی روکی سانس بحال کی اور فوراً سے پیشتر اس خبیث کے سارے میسجز ڈیلیٹ کر دیئے۔

شاپنگ مال میں آ کر وہ خاصی حد تک بہل گئی مگر یہ اطمینان بھی تھوڑی ہی دیر کا ثابت ہوا جب اس کی نگاہ اس سڑک والے لڑکے پر پڑی جو اپنی معنی خیزیت سے بھرپور نظریں اس پر مرکوز کیے تھا اس کی حواس باختگی وسراسیمگی انتہاؤں کو چھونے لگی۔ نگاہوں کے تصادم پر اس نے کچھ کہا جسے دور ہونے کے سبب وہ سن تو نہ سکی لیکن لب ہلتے نظر آئے، اس نے ہراساں نظروں سے شانی بھیا کو دیکھا۔ وہ شفا کے ساتھ باتوں میں مگن تھے وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتی ان تک جا پہنچی۔

شفا جانے کیا الم غلم چیزیں خریدتی رہی وہ بس بے دلی سے اس کی تقلید کرتی رہی۔

اس ایک جھلک کے بعد تو وہ خبیث روپوش ہو گیا مگر اس کا چین وسکون غارت کر گیا تھا۔

خدا خدا کر کے شفا کی شاپنگ تمام ہوئی اور انہوں نے گھر کی راہ لی۔ دس بجے وہ لوگ گھر پہنچے، اول تو اس نے عشاء کی نماز ادا کی اس کے بعد دیگر کاموں کو نمٹاتے ساڑھے بارہ ہو گئے۔ حسب معمول الارم سیٹ کرنے کے لئے سیل فون ہاتھ میں لیا تو اس میں گویا میسجز کی بھرمار تھی۔ ڈھیروں رومانوی اشعار تھے جو سرسری سا پڑھنے کے بعد بے دلی سے ڈیلیٹ کرتی جا رہی تھی۔ آخری میسج پر وہ ٹھٹکی۔

''آپ مجھے دیکھ کر اتنا گھبراتی کیوں ہیں، میں کوئی کھا تھوڑی جاؤں گا آپ کو جان جی''۔ اس کے شک کی تصدیق ہو چکی تھی، یہ میسجز بھیجنے والا وہی آوارہ لڑکا تھا۔

اس نئی صورت حال نے اس کو خاصا بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اگر شانی بھیا کو اس بات کی بھنک پڑ جاتی تو وہ لمحے کی تاخیر کیے بنا اس کی پڑھائی روک دیتے اور اس کا کردار بھی ان کی نظر میں مشکوک ہو جاتا۔

یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ یہاں ہر غلط بات کے لئے عورت کو ہی معتوب ٹھہرایا جاتا ہے، حوا کی بیٹی کی شنوائی کہیں نہیں ہوتی، اپنے اجلے دامن پر لگنے والے دھبے کے خوف سے اس کا دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

☆..........☆..........☆

وہ ملول سی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی برابر میں اسماعیل تاؤ کے گھر سے ڈھول اور گانوں کی آوازیں آ رہی تھیں، بھابی نے تو ایک ہفتے سے وہیں بسیرا کیا ہوا تھا اماں بھی زیادہ تر وہیں پائی جاتیں، عالیہ سے ان دنوں ماسوائے زینب بھابی کے سب نے بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اماں کو واضح الفاظ میں مدثر کے لئے انکار کر چکی تھی مگر انہیں ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر اس کے پاس ایک ہی راستہ بچا۔ اس نے نیند کی ڈھیروں گولیاں نگل لیں۔ بروقت اسپتال پہنچانے سے اس کی جان تو بچ گئی مگر اس کی آنکھوں کی ویرانی نے زینب بھابی کا دل جکڑ لیا، یہ کومل سی لڑکی انہیں بہت عزیز تھی۔ ویسے بھی انہیں اپنا بھنورا صفت بھائی اس پھول سی لڑکی کے لئے کسی طور بھی مناسب نہیں لگتا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ مزید کوئی حماقت کرتی زینب نے مدثر کو اعتماد میں لے کر ساری بات اس کے گوش گزار کر دی مگر ہٹ دھرم سا مدثر ایک انچ بھی اپنے موقف سے نہ ہلا تو مجبوراً اسے یہ بات سب کے سامنے افشا کرنی پڑی کہ عالیہ کا خود کو یوں موت کے سپرد کرنے کا سبب مدثر کی ذات ہے۔

اسماعیل تاؤ کے علم میں جب یہ بات آئی تو انہوں نے اس رشتے کو ختم کر دینا ہی مناسب خیال کیا۔ وہ دور اندیش انسان تھے، عالیہ کا دوبارہ سے

کوئی انتہائی قدم ان کے خاندان کے لئے بدنامی کا باعث بن سکتا تھا، اس رشتے کو ختم کر دینا ہی سودمند تھا۔ سو اس بات کو غیرت کا مسئلہ بنانے کے بجائے بڑی دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے عمروں کی تفریق کو توجیہہ بنا کر پیش کیا اور نہایت معاملہ فہمی سے بات دبا دی۔ حیرت انگیز طور پر اس سارے عمل کے دوران مدثر نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اسماعیل تاؤ نے اپنے دوست کی بیٹی سے اس کی شادی طے کی تو بھی مدثر کی طرف سے کوئی احتجاج یا اعتراض سامنے نہیں آیا۔

عالیہ تو قدرت کے معجزے پر حیران تھی، پہلے پہل تو وہ یقین ہی نہیں کر پا رہی تھی۔ اپنی بخت آوری کا جس عقوبت سے نجات کی خاطر وہ خودکشی جیسے حرام فعل کی مرتکب ہوئی وہ عذاب اس کے سر سے اتنی آسانی سے ٹل گیا۔ اپنے رب کی کرم نوازیوں پر وہ تشکر سے ہمہ وقت سجدے میں جھکی رہتی۔

جہاں عقوبت سے نجات ملنے پر وہ مسرور تھی وہیں اماں اور لالہ کی سرد مہری اور بے اعتنائی پر از حد ملول بھی ہوئی۔ لالہ کی بے اعتنائی تو وہ بچپن سے سہتی آئی تھی لیکن اماں کی بیگانگی پر اس کا دل کٹنے لگتا۔

ماضی اور حال کے درمیان چکر کاٹتے جانے کتنی دیر گزری تھی، معاً یاد آیا کہ نماز تو اب تک پڑھی نہیں۔ گھڑی کی جانب دیکھا تو رات کے سوا گیارہ ہو رہے تھے، اسماعیل تاؤ کے گھر میں بھی اب خاموشی کا راج تھا، غالباً مہمان سو چکے تھے۔ ویسے بھی گاؤں میں تو لوگ سرشام ہی سو جاتے تھے۔ رؤف لالہ اور مدثر کے دوستوں نے رقص و سرور کی محفل سجالی تھی۔ اماں اچھی طرح واقف تھیں کہ وہ گھر میں تنہا ہو گی اس کے باوجود اسماعیل تاؤ کے گھر رک گئی اماں کے اس طرح تغافل برتنے پر اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

وہ بوجھل دل لئے اٹھی اور باوضو ہو کر نماز ادا کرنے لگی۔ نماز پڑھنے کے بعد جوں ہی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو جھیل سی نیلی شفاف آنکھوں میں گویا سیلاب امڈ آیا۔

''اے میرے مالک! میں تیری بہت گناہ گار بندی ہوں، تاعمر تیری نوازشوں کو بھلائے تجھ سے شاکی رہی، لیکن میری ناشکری کے باوجود تو نے ہمیشہ مجھے اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھا۔ اے میرے مولا میں تجھ سے اپنی ان تمام غفلتوں کی معافی چاہتی ہوں جو جانے انجانے میں مجھ سے سرزد ہوئیں۔ گیارہ سال تک میں مسلسل تیرے آگے جھک کر اس شخص کو سزا دینے کی فریاد کرتی رہی۔ مگر آج میں تیرے سامنے کھلے دل سے اس شخص کو معاف کرتی ہوں۔ اے میرے پروردگار تو اس کو نیکی کی راہ دکھلا دے، اسے صراط مستقیم پر چلا اور اسے نیک انسان بنا دے، اس لڑکی کے لئے جس کا نصیب اس سے جڑ چکا ہے''۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے مدثر کے حق میں دعا کی تھی، محض اس لڑکی کی خاطر جو ان دیکھی انجانی ہوتے کے باوجود اسے اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہو رہی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ ایک بدکار شخص کے ساتھ نباہ کرنا کتنا کٹھن ہوتا ہے اس کی بدکاری کے مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا عمل کس قدر جاں گسل ہوتا ہے۔ اس نے زینب بھابی کی روشن آنکھوں کی جوت بجھتے دیکھی تھی، اب وہ کسی اور کو اس کڑی آزمائش سے گزرتے دیکھنے کی متحمل نہیں تھی۔ سو کھلے دل سے اپنے گناہگار کو معاف کر کے اپنی بددعاؤں کے حصار سے آزاد کر دیا۔

حیران کن طور پر جو بے کلی اس کے وجود پر برسوں سے چھائی تھی وہ پل بھر میں چھٹ گئی اور اپنا آپ خاصا پرسکون و ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔

جائے نماز تہہ کر کے وہ جوں ہی پلٹی وہیں فریز ہو گئی۔ دروازے کی چوکھٹ پر دیوار سے ٹیک لگائے مدثر کھڑا تھا آنکھوں کی بے تحاشا سرخی اس کے مے

نوشی کی دلیل تھی۔

☆......☆......☆

آج سر افتخار چھٹی پر تھے سوان کی غیر حاضری میں کلاس میں ایک بھگدڑ مچی تھی زیر بحث موضوع آنے والا سالانہ فنکشن تھا۔

"میں تو اس بار کے سالانہ فنکشن کے لیے ریڈی میڈ میکسی لوں گی آج کل بڑی اِن ہے"۔ یہ ایکسائٹمنٹ سے بھرپور آواز بشریٰ رحمان کی تھی۔

"ہوں...... یہ میکسی ویکسی کا ٹرینڈ اب پرانا ہو چکا ہے، آج کل کون ایڑیوں میں رلتے لال پیلے کڑھائی والے کپڑے پہنتا ہے"۔ کشف نیازی ایک ادا سے اپنے تراشیدہ بالوں کو جھٹک کر نخوت سے ناک چڑھا کر بولی جسے اپنی دولت اور گوری چمڑی پر کچھ زیادہ ہی ناز تھا۔

"ہم مشرقی لڑکیوں کو ایسا ہی لباس زیب دیتا ہے نا کہ بے جا مغربی تقلید میں ہم آدھے تیتر آدھے بٹیر بن جائیں"۔ بشریٰ نے بڑی چابکدستی سے اس کے بغیر آستینوں والے مختصر سے لباس کو تاک کر نشانہ بنایا، کسی حد تک بشریٰ کا کہا بجا تھا، کشف کے فربہی مائل سراپے پر کسی ہوئی جینز بنا آستین کی کسی ہوئی شرٹ اور صحت مند (بلکہ اوور صحت مند کہنا مناسب ہو گا) بازو اسے پہلوان سے مشابہت دے رہے تھے۔

بشریٰ کی طرف سے کرارا جواب موصول ہوتے پر کشف بی بی تلملا اٹھی، دونوں میں معمول کی طرح زبردست جنگ چھڑ گئی تھی۔

زینیا نے کوفت زدہ نظروں سے ان دونوں کو جنگلی بلیوں کی طرح لڑتے دیکھا۔ ان سے اپنی سریلی آواز پر قابو پانے کی ریکوئسٹ بھی کی لیکن نتیجہ وہی نقار خانے میں طوطی کی آواز والا ثابت ہوا، بالآخر تنگ آ کر وہ کلاس سے باہر نکل گئی اور برگد کے درخت تلے آ بیٹھی۔

شانی بھیا کی منگنی کے دوران اس کی پڑھائی کا خاصا حرج ہو چکا تھا اسے اب سب کور کرنا تھا سو جلدی سے رجسٹر کھول کر بیٹھ گئی۔

چھٹی تک وہ اچھا خاصا کام کر چکی تھی، اطمینان سے بکس سمیٹ کر فائل سینے سے لگائے نگاہیں نیچی کیے سڑک کی طرف آئی، خوش قسمتی سے آج مطلوبہ بس کے انتظار میں زیادہ خواری نہیں اٹھانی پڑی۔

مطلوبہ اسٹاپ پر اتر کر دائیں جانب گلی میں مڑی اور ناک کی سیدھ میں چلنے لگی، اچانک سے وہی سڑک والا لڑکا بائیک پر سوار اس سے ایک انچ کے فاصلے پر رکا، وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہوئی۔

"ہائے جان! اتنے دنوں سے کہاں غائب تھیں، دیکھو تمہاری روپوشی کے سوگ میں شیو بھی نہیں کیا"۔ اپنی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیر کر لوفرانہ انداز میں گویا ہوا۔ زینیا نے گھبرا کر خائف نگاہ اطراف پر ڈالی، صد شکر کہ اس چلچلاتی دوپہر میں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی وگرنہ اسے یوں کوئی دیکھ لیتا تو نا جانے اس کی ذات کو لے کر کتنے افسانے بنتے۔

زینیا بڑے بھرپور طریقے سے اسے نظر انداز کر کے سائیڈ سے ہو کر آگے بڑھی۔ وہ بھی ہیرو کے اسٹائل میں دائیں ٹانگ اوپر سے گھما کر اچھل کر نیچے اتر کر اس کے تعاقب میں چلنے لگا، زینیا نے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس تک پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زینیا کو محسوس ہوا گویا کسی نے جلتا ہوا کوئلہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا ہو، اس کے اندر شدید اشتعال انگیز لہریں اٹھیں۔

"تم کیوں مجھے اس طرح نظر انداز کر رہی ہو، میں تمہیں بہت محبت..."

باقی ماندہ الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے زینیا نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر وہی ہاتھ پوری قوت سے اس کے گال پر مارا۔ اس قدر غیر متوقع ردعمل پر

چند ثانیے کے لئے وہ ششدر سا زینیا کو تکتا رہا، حواس بحال ہوتے ہی جارحانہ انداز میں اس کی طرف لپکا۔ زینیا اس کے ارادے پہلے ہی بھانپ چکی تھی سو تیزی سے ساتھ والی گلی میں ٹرن لیا، دانستہ طور پر پڑوس میں رہنے والے بزرگ سے مخاطب ہوئی۔

''سلام چاچا! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' زینیا کے استفہام پر ریاض چاچا نے تعجب خیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا، وہ جو راستے سے گزرتے ہوئے سر نہیں اٹھاتی تھی آج اس کے یوں سر راہ رک کر احوال پوچھنے پر انہیں خاصا اچنبھا ہوا۔ چاچا کی آنکھوں میں تیرتی حیرت کا مفہوم سمجھ کر خفت زدہ سی سر جھکا گئی۔

''الحمد اللہ بیٹا! اب پہلے سے بہتر ہے''۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات دیکھ کر وہ نرمی سے گویا ہوئے۔

''دراصل مجھے نوین باجی (چاچا کی بہو) نے بتایا تھا کہ آپ کی شوگر کافی ہائی ہو گئی تھی''۔ اپنی خجالت مٹانے کو وہ وضاحت دینے لگی۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھے، زینیا نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا وہ خبیث وہیں گلی کے سرے پر کھڑا تھا اس کے دیکھنے پر دایاں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرنے کے بعد شہادت کی انگلی اٹھا کر دھمکی آمیز انداز میں تنبیہ کی۔ زینیا خوفزدہ ہو کر تیز تیز قدم اٹھاتی چاچا کے ساتھ چلنے لگی۔

گھر تک پہنچتے اس کا تنفس خاصا تیز ہو چکا تھا شفا متعجب سی اس کا فق چہرہ دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا آپی آپ کو؟'' شفا نے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

''کچھ بھی تو نہیں، مجھے کیا ہونا ہے''۔ اپنے لہجے کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پا کر بدقت گویا ہوئی، شفا کچھ دیر بغور اسے دیکھتی رہی جو الماری میں منہ دیئے کسی نادر و نایاب سی دریافت میں مستغرق تھی، اسے مگن دیکھ کر وہ بھی کندھے اچکا کر کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی زینیا نے اپنی رکی سانس بحال کی، فریال بیگم کی پکار پر خود کو کمپوز کر کے کمرے سے نکلی، شفا دسترخوان لگا چکی تھی سو وہ بھی خاموشی سے بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔

شفا جانچتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں کی تپش محسوس کر کے اس کا دھیان اپنے اوپر سے ہٹانے کے لئے وہ امی کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اسے نارمل انداز میں باتیں کرتے دیکھ کر شفا بھی کھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔

کھانا کھا کر وہ کمرے میں آ کر لیٹی، سر میں شدید درد ہو رہا تھا، اعصاب پر بھی بوجھل پن سا طاری تھا، شفا بھی اس کے ساتھ دراز ہوئی۔

''آپی.....!''

''ہوں''۔

''کیا خیال ہے افشاں آنٹی (شانی بھیا کی ساس) کی طرف چلیں، فاریہ بھابی بھی صبح کال کر کے آنے پر اصرار کر رہی تھیں اور ٹیکسٹ بھی کافی سارے آ چکے ہیں ان کے''۔ شفا نے اسے راضی کرنے کے لئے خاصی مبالغہ آرائی سے کام لیا لیکن وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔

''میرا کوئی خیال نہیں اور تم بھی آرام سے گھر میں بیٹھو، یوں روز روز کسی کے گھر جانا اچھی بات نہیں''۔ وہ اس وقت شدید قسم کے خوف کے زیر اثر تھی جبھی اسے سختی سے ٹوکا۔

شفا چند ثانیے اسے خفا نظروں سے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر چلی گئی۔ شدید اعصابی دباؤ نے اسے پژمردہ کر دیا تھا، شفا کو بعد میں منانے کا سوچ کر آنکھیں موند گئی۔

وہ خاصی گہری نیند سو رہی تھی جب امی نے اس کا کندھا ہلایا۔

''زینیا اٹھ کر دروازہ بند کرو ہم افشاں کی طرف جا رہے ہیں''۔ وہ بمشکل اپنی بوجھل آنکھیں کھول کر

بیڈ سے اتری۔

صحن میں آئی تو شفا پہلے سے تیار کھڑی تھی اسے دیکھ کر وہ امی سے پہلے ہی گھر سے نکل گئی، یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا مگر ہمیشہ کی طرح اس نے لپک کر اسے منایا نہیں، گہری نیند سے جاگنے کے باعث اس کا ذہن ماؤف سا ہو رہا تھا۔

وہ دوبارہ آ کر لیٹی مگر اب نیند نہیں آ رہی تھی، ذہن میں بار بار وہی سین ری وائنڈ ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں سے چھلکتی وحشت اور دھمکی آمیز انداز نے اس کے شعور میں ایک خوف سا بٹھا دیا تھا۔

مغرب کی اذان کی آواز کانوں میں پڑنے پر وہ چونکی، پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اس نے جلدی سے اٹھ کر لائٹس آن کیں۔

نماز ادا کر کے کچن میں آئی، سالن امی بنا کر گئی تھیں، شانی بھیا کے آنے کا ٹائم تھا سو جلدی سے روٹیاں ڈالنے لگی۔

بھیا کے آتے ہی اس نے کھانا لگایا، خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگی، کھانے سے فارغ ہو کر برتن سمیٹے اور چائے بنانے لگی، بھائی کا معمول تھا کھانے کے فوراً بعد چائے طلب کرتے۔

"کس ٹائم گئے وہ لوگ اور آپ نے ان دونوں کو اکیلے کیوں جانے دیا؟" بھائی کی آواز پر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، وہ کسی سے فون پر بات کر رہے تھے پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"فاریہ! تم لوگ کہاں تھے اور شفا کس جگہ تم سے بچھڑی، مجھے ٹھیک سے بتاؤ"۔ شانی بھیا کی اگلی بات نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھسکا دی، وہ تیزی سے بھیا کے قریب آئی اور ان کے چہرے کے لحہ بہ لحہ بدلتے تاثرات کو دیکھنے لگی۔

دوسری طرف سے جانے کیا کہا جا رہا تھا، شانی بھیا کے چہرے سے فکر مندی اور پریشانی عیاں تھی۔

"بھیا کیا کہہ رہی تھی فاریہ؟" فون بند ہوتے ہی وہ سراسیمگی سے شایان کا بازو ہلاتے ہوئے گویا ہوئی۔

بات کی تہہ تک کسی حد تک پہنچنے کے باوجود دل میں ایک آس تھی کہ اس کا قیاس غلط ثابت ہو۔

"فاریہ اور شفا قریبی پارک میں گئی تھیں وہاں سے شفا کہیں غائب ہو گئی ہے"۔ شانی بھیا اسے مختصراً بتا کر چلے گئے۔ وہ وہیں بیٹھتی چلی گئی، اسے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا، سارے خدشات سچ ہوتے دکھائی دیئے، کسی انجانے خیال کے تحت وہ تیزی سے کمرے کی طرف دوڑی، تکیے کے نیچے سے اپنا سیل فون نکالا۔

ایک قیامت جو اس کی منتظر تھی۔ اس نمبر سے بھیجی گئی تصاویر نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔ شفا ہوش و خرد سے بیگانی دوپٹے سے بے نیاز انتہائی ناگفتہ حالت میں پڑی تھی، ساتھ میں کوئی دراز تھا، اوندھے منہ ہونے کے باوجود وہ سو فیصد پُر یقین تھی کہ یہ وہی تھا، اس کا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا۔

اپنی معصوم و پاکیزہ بہن کو ایسی شرمناک حالت میں دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، اس نے کپکپاتی انگلیوں سے نمبر ڈائل کیا۔

پہلی بیل پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

"زہے نصیب... آج تو ہمارے بھاگ ہی کھل گئے جو آپ نے اس ناچیز کو یاد کیا"۔ شیطانیت سے بھرپور آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی، اس کے اندر جوار بھاٹے کا سا سماں ہونے لگا، اپنے اندر کی طغیانی پر قابو پانے کے لئے اس نے لب دانتوں تلے کچل ڈالے۔

"آپ میری بہن کے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں، ہم نے کیا بگاڑا ہے آپ کا؟" وہ مصلحت آمیزی سے گویا ہوئی۔

"وہ بے چاری تو واقعی میں معصوم ہے مگر افسوس کہ تمہاری غلطی کا خمیازہ اب اسے بھگتنا پڑے گا،

میرے سلگتے جذبات پر طمانچہ مار کر جو آگ تم نے بھڑکائی ہے، اب وہی آگ تمہاری معصوم بہن کا وجود جلا کر خاکستر کر دے گی"۔

"آپ تو مجھ سے محبت کے دعوے دار ہونا، تو پھر....." آنسوؤں کا پھندا گلے میں اٹکنے سے وہ خاموش ہو گئی، اس کی ادھوری بات پر وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ بے بسی کے مارے زینیا کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹی ہوئی مالا کے موتیوں کی مانند ٹوٹ کر گرنے لگے۔

"اس محبت کی خاطر ہی تو تیری بہن کو باعصمت چھوڑ رہا ہوں، آخر کو بھی سالی کے روپ میں دیکھا تھا، اب اتنا بے غیرت تھوڑی ہوں جو بڑی بہن سے عشق فرماؤں اور چھوٹی بہن سے عاشقی لڑاؤں، ہاہاہا....." اپنی اس عامیانہ بات پر وہ خوب منہ چیر کر خباثت سے ہنسا۔

زینیا کے اعصاب بری طرح چیخ رہے تھے مگر اس کی بکواس فی الوقت اس کی مجبوری تھی، اس کا ایک بھی جملہ اس کی عزیز از جان بہن کی زندگی میں تباہ کاری کا باعث بن سکتا تھا۔

"تمہاری بہن صحیح سلامت تم تک پہنچ جائے گی، بس میں نے اس کی چند تصویریں اور کچھ ویڈیو کلپس لی ہیں جن کے کچھ ٹریلر تم بھی دیکھ چکی ہو، بس وہ سوشل میڈیا تک پہنچانے ہیں، پھر حساب کتاب برابر، پھر دیکھتا ہوں کہ کون مائی کا لال اس بات پر یقین کرتا ہے کہ یہ ان چھوئی کلی مسلی نہیں گئی"۔ اس کے لہجے کا سرد پن اور سفاک انداز اس کی رگوں میں خون منجمد کر گیا۔

"خدا کے لئے ہمیں یوں رسوا مت کرو، ہم غریبوں کے پاس عزت کے علاوہ اور ہوتا ہی کیا ہے، اگر وہ بھی یوں نیلام ہو جائے گی تو ہم تہی دست و تہی داماں رہ جائیں گے۔ میری چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو، اگر آپ نے واقعی مجھے سچے دل سے چاہا ہو تو آپ کو اس چاہت کا واسطہ شفا کو چھوڑ دیں"۔ یہ وقت بھی بڑا ستمگر ہے انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے، کل تک جس محبت سے وہ خار کھاتی رہی آج اسی محبت کا کشکول بنا کر اس بے ضمیر انسان کے در پر دستک دے کر گڑگڑا رہی تھی کہ شاید وہ اس کاسے میں رحم کے چند سکے ڈال دے۔

مگر کاتب تقدیر میں کچھ اور ہی رقم تھا، اس پتھر کو موم کرنے کے لئے کہا جانے والا آخری جملہ والٹ گھر میں رہ جانے کی وجہ سے واپس آتے شانی کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ سسکیوں میں ڈوبے لفظوں کی التجا نے اسے مشتعل کر دیا، وہ برافروختہ سا کمرے میں داخل ہوا، اس کے خون چھلکاتے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ پتھرا سی گئی، ان کی قہر زدہ نظریں اپنے وجود کے آر پار محسوس ہوئیں، انہوں نے طیش زدہ عالم میں فون اس سے چھین کر کان سے لگایا مگر اس اثناء میں کال ڈراپ ہو چکی تھی۔

اور اسکرین پر نظر آنے والی تصویر نے اس کے ہوش و حواس سلب کر لئے، اسے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔ لیکن انگلی کی ہلکی سی جنبش سے یکے بعد دیگر نظر آنے والی تصاویر کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ سیل فون زور سے دیوار پر مارا، چھناکے کی آواز سے اس کا سہا ہوا دل کانپ اٹھا اور وہی ہاتھ پوری قوت سے گھما کر اس کے منہ پر دے مارا۔ چٹاخ کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا، وہ اوندھے منہ جا گری۔

چند ثانیے درد کی شدت سے بے حس و حرکت پڑی رہی پھر اپنی تمام ہمتیں مجتمع کر کے بھیا کے مقابل کھڑی ہوئی۔

"بھائی آپ کو....."

اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی شایان نے بڑی بے رحمی سے اس کی گردن دبوچ کر لفظوں کا گلا گھونٹا، اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔ شدید

تکلیف سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا لیکن اس نے بے حسی سے آنکھیں موند کر خود کو ان کے سپرد کیا۔ چند لمحوں کے کھیل میں شاید وہ زندگی کی بازی ہمیشہ کے لئے ہار جاتی مگر جانے کس خیال کے تحت اس کی متغیر ہوتی حالت کو دیکھ کر شایان نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی، دباؤ کم ہوتے ہی اس نے اپنی سوز بھری آنکھیں کھولیں جو سیدھا شایان کی متنفر نظروں سے ٹکرائیں، وہ نفرت سے منہ پھیر کر باہر جانے لگا مگر زینیا سامنے آ گئی۔

''آپ میری بات سنے بغیر نہیں جا سکتے''۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولی، عجیب جنونیت بھرا انداز تھا اپنے ماں جائے کی آنکھوں میں اپنے لئے نظر آتی بدگمانی و تنفر نے اسے وحشت زدہ سا کر دیا تھا۔

شایان نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا پھر سختی سے اپنے لب بھینچ کر بڑی بے دردی سے اسے پرے دھکیلا، وہ لہرا کر ٹیبل پر اوندھے منہ جا گری، ٹیبل کے کونے پر ناک ٹکرانے سے ایک کرب انگیز چیخ اس کے منہ سے برآمد ہوئی۔

ناک سے بہتے خون کو بڑی بے دردی سے رگڑ کر ہیجان خیزی سے دروازے کی طرف لپکی مگر تب تک شایان باہر سے دروازہ بند کر چکا تھا، اس نے زور زور سے دروازہ پیٹا مگر بے نتیجہ، بے سود رہا، تھک ہار کر وہ وہیں دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

انیس سال تک خود کو بینت بینت کر رکھا، ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کے باوجود معتبر نہ ہو سکی، آج جس خطا کے لئے قصوروار گردانی جا رہی تھی وہ خطا تو سرے سے اس سے سرزد بھی نہیں ہوئی تھی۔

اس کا اپنا ماں جایا اسے گناہگار ٹھہرا رہا تھا، یہی بات اس کے دل کو چیر رہی تھی۔

اس نے دروازے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندیں تو آنکھوں کی چلمنوں پر ٹھہرے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر رخساروں کو بھگونے لگے۔

☆.........☆.........☆

عالیہ کے ہاتھ سے تہہ شدہ جائے نماز زمین پر گری، وہ تیزی سے باہر جانے لگی اس سے پہلے ہی اس درندے نے اسے اپنی وحشی گرفت میں درشتی سے جکڑا، وہ کسی پر کٹے پرندے کی مانند اس کے شکنجے میں پھڑ پھڑانے لگی، اس کے ہیبت ناک چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے نوچتے ہوئے اس کا ناپاک منہ اپنے آپ سے دور رکھنے کے جتن کر رہی تھی۔

''بڑا گھمنڈ ہے ناں تجھے خود پر، اپنے حسن پر بڑا ناز ہے ناں تجھے، تیرے انتظار میں، میں نے اپنی عمر کا سنہرا دور گنوا دیا اور تو نے ایک جھٹکے میں سب ختم کر ڈالا''۔ اس کے گرد بنایا ہوا حصار مزید تنگ کیا، عالیہ کی جان پر بن آئی اس کے منہ سے شراب کے اٹھتے بھبکے ناقابل برداشت تھے۔

''تم نے میری محبت کو ٹھکرایا (ہوس کا پجاری محبت کے ہجے سے بھی ناواقف آج محبت کا راگ الاپ رہا تھا)''۔ عالیہ نے تلخی سے سوچا۔

''تم نے مجھے اپنے لائق نہیں سمجھا، اب میں تمہیں کسی کے قابل نہیں رہنے دوں گا''۔ اسے اپنی وحشیانہ گرفت سے آزاد کر کے سفاکی سے گویا ہوا، عالیہ الٹے قدموں چلتی دیوار سے جا چپکی اور نہایت ہی خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

مدثر نے اپنی قمیض کے دائیں سائیڈ والی جیب سے بوتل نکالی جسے دیکھ کر عالیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، مے نوشی کے سبب سرخ ہوتی آنکھوں میں انتقام کا رنگ واضح تھا۔

''معافی چاہتا ہوں مگر یہ سب کرنے پر تم نے ہی مجھے مجبور کیا، سترہ سال تک ہر لمحہ ہر پل میں نے تمہارے متعلق سوچا اور یہ مجھے ہرگز منظور نہیں کہ اتنے برس جس لڑکی کو تصورات میں اپنی منکوحہ کے روپ میں دیکھا، وہی لڑکی اپنے روپ کی تابنا کیوں سے کسی

اور کی خلوتوں کو جگمگائے۔" کسی بھی احساس سے عاری قطعی بے رحم لب ولہجہ اس کا خون منجمد کر گیا۔
اس کا دھیان خود پر سے ہٹتے دیکھ کر وہ دھیرے سے دروازے کی طرف کھسکنے لگی لیکن وہ اس کے ارادے پہلے ہی بھانپ چکا تھا، ایک ہی جھٹکے سے تیزاب سے بھری بوتل اس پر انڈیل دی، ایک فلک شگاف چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔
وہ ناقابل بیان تکلیف سے بے جان ہو کر زمین پر ڈھے گئی۔ چند منٹوں میں وہ جگمگاتی صورت مسخ ہو کر کوئلہ ہو گئی۔
سینے میں بھڑکتی انتقام کی آگ بھی سرد پڑ گئی۔ مدثر نے ایک حقارت بھری نگاہ اس کرلاتے وجود پر ڈالی اور اس کے اوپر سے گزر کر باہر چلا گیا۔
جہالت کی انتہا نے زندگی سے بھرپور وجود کو زندہ درگور کر دیا۔

☆............☆............☆

زینیا اپنی سوز بھری آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمائے کب سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی بظاہر وہ جتنی پرسکون تھی اندر اس قدر طوفان برپا تھا اپنی عزیز از جان بہن کو شرمناک حالت میں دیکھنا اور پھر بھائی کی آنکھوں میں اپنے لئے بے اعتباری و بدگمانی نے اسے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا، اس کی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔
وہ مضطربانہ انداز میں اپنا سر پیچھے دیوار سے دائیں بائیں ٹکرا رہی تھی باہر سے کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ مضمحل سی اٹھنے کی کوشش کرنے لگی، گرنے کے باعث کمر سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، کافی جتن کے بعد وہ کھڑی ہو پائی نقاہت سے سر چکرا رہا تھا۔
"بھائی... ش... شفا کا کچھ پتہ چلا..." شایان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر استفسار کیا، آواز اتنی ہلکی تھی کہ وہ خود ہی بمشکل سن سکی، بھیا یا تو سن نہیں پائے تھے یا پھر دانستہ اَن سنا کر دیا۔
انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو سختی سے دبوچا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے جانے لگے، چہرے کے تاثرات بڑے پتھریلے تھے۔ کچن میں لا کر اس کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کر کے کیبنٹ کی ہک کے ساتھ باندھ دیئے، پہلے تو وہ ہکا بکا سی سب دیکھتی رہی، بالآخر ہمتیں مجتمع کر کے لب کشائی کی۔
"یہ آپ کیا کر رہے ہیں میرے ساتھ؟" جواباً ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا گیا۔ اس قدر ہتک آمیز سلوک پر اس کے اندر بھانبھڑ جلنے لگے۔ یہ ضرب اس کے منہ پر نہیں اس کی انا، اس کی عزت نفس اور اس کے وقار پر لگی تھی، اس کا پندار چور چور ہو گیا۔
چولہے سے منسلک گیس پائپ نکالنے کے بعد وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھے، کچن میں تیزی سے گیس کی بو پھیلنے لگی۔ اس نے سر اٹھا کر اپنی زخم زخم آنکھوں سے اوپر کی جانب دیکھا اور پھر بڑی سختی سے اپنی لہورنگ آنکھوں کو میچا، ایک درد بھری سسکی اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔
پڑوس کی خالہ نے شور کی آواز سن کر محلے والوں کے ساتھ مل کر ان کے گھر کے دروازے کو زور زور سے پیٹ ڈالا اور پھر دروازے کو زوردار ضربوں سے توڑ کر اندر چلے آئے۔ اتنے لوگوں کو گھر میں دیکھ کر بھائی باہر چلا گیا۔ خالہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کھولے اور اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ آج محلے والوں کی بروقت جرات سے ایک جان بچ گئی تھی۔
بنت حوا آج بھی اس معاشرے میں اپنے حق کے لئے یہاں وہاں بھٹک رہی ہے۔ کوئی ہے جو اس کے درد کا درماں کرے؟

☆............☆............☆

نظیر فاطمہ

افسانہ

# وہ بے چارے......



نور سحر گاڑی سے اتر کر اخبار کے دفتر میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک کندھے پر اپنا بیگ اور دوسرے کندھے پر لیپ ٹاپ بیگ لٹکا رکھا تھا اور ہاتھ میں فائل پکڑ رکھی تھی۔ اس نے جینز پر گھٹنوں تک آتا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنا ہوا تھا۔ گلے میں اسکارف جس کے دونوں پلو آگے کر کے ان میں گرہ لگائی گئی تھی۔ کندھوں تک کٹے بال اونچی پونی ٹیل کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں میں اسٹریپ والی چپل تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ چپڑاسی خیردین نے اسے ہمدانی صاحب جو کہ اس اخبار کے ایڈیٹر تھے، کا پیغام دیا کہ وہ فوراً ان کے کمرے میں پہنچیں۔ وہ پہلے اپنے کمرے میں گئی۔ اپنا ہینڈ بیگ، لیپ ٹاپ اور فائل اپنی میز پر رکھی اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔ اس کا رخ ہمدانی صاحب کے کمرے کی طرف تھا۔ اس نے دروازہ ناک کیا اور اندر سے ''یس'' کی آواز سن کر کمرے میں داخل ہوگئی۔

''ویل ڈن مس نور سحر! آپ نے 8 مارچ کے حوالے سے جو آرٹیکل لکھا تھا۔ اسے بہت پسند کیا گیا ہے۔ اب تک ہمیں سینکڑوں E-mail موصول ہو چکی ہیں۔ درجنوں فون کالز آ چکی ہیں۔ ہر طرف دھوم مچی ہوئی کہ ہمارے اخبار نے خواتین پر مردوں کے مظالم کو بڑے موثر انداز میں حقائق کے ساتھ بیان کیا ہے۔'' ہمدانی صاحب نے اس کو دیکھتے ہی اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیے تھے۔

نور سحر کو اس اخبار میں کام کرتے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا مگر اس کے کالمز اور تحقیقی مضامین کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا تھا۔ اس کے زیادہ تر کالمز خواتین کے حوالے سے ہوتے تھے۔ اس لیے اس کے فینز میں خواتین کی بڑی تعداد شامل تھی۔

''تھینک یو سر اینڈ آئم شیور کہ یہ فون کالز اور ای میلز خواتین کی طرف سے ہی آئی ہوں گی۔'' نور سحر نے ہمدانی صاحب کے اشارے پر کرسی سنبھالی۔

''ہا...... ہاں...... یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ اب آپ مردوں کو ظالم روپ میں دکھاتی ہیں تو وہ آپ کو پسند تو نہیں کریں گے نا۔'' انہوں نے ہنسی لبوں میں دبا کر کہا۔

''مگر سر! آپ بھی تو مرد ہیں۔ آپ تو میری بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔'' نور سحر نے ہمدانی صاحب کو دیکھا۔ ہمدانی صاحب واقعی بہت اچھے انسان تھے۔ وہ اس اخبار کو بہت محنت اور ایمانداری سے لے کر چل رہے تھے۔ نئے آنے والوں کو بہت توجہ، محبت اور عزت سے سکھاتے تھے۔ ان کی رہنمائی کرتے تھے۔ ان کے لیے چھپر چھاؤں بن جاتے تھے۔ ہمدانی صاحب کے اندر سینئر ہونے کا کوئی غرور تکبر نہیں تھا بلکہ وہ تو یہ کہتے تھے کہ کسی کو سکھانا اور علم بانٹنا بھی صدقہ جاریہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنا تجربہ خوشی خوشی دوسروں میں بانٹتے تھے۔ وہ نہ تو نئے آنے والوں کا مالی استحصال کرتے تھے اور نہ ہی ان کے ساتھ کام کے حوالے سے کوئی زیادتی ہونے دیتے تھے۔ بہت سے لوگ ان سے سیکھ کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے تھے۔ کچھ اعلیٰ ظرف تھے جو ابھی تک علی الاعلان ہمدانی صاحب کو اپنا استاد کہتے تھے اور کچھ ایسے کم ظرف بھی جو بھی پلٹ کر سلام تک کرنے نہیں آئے تھے۔ اس کے باوجود ہمدانی صاحب کے طرز عمل میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ آج بھی اس سیڑھی کی مانند کھڑے تھے جو دوسروں کو بلندیوں تک پہنچاتی ہے مگر خود وہیں کھڑی رہتی ہے۔

''اب کیا کروں، میری تو مجبوری ہے۔ مجھے اپنا اخبار چلانا ہے ورنہ یقین کرو آپ کا کوئی کالم یا مضمون ایسا ہوتا ہے جسے پڑھ کر میرا دل آپ سے لڑائی کرنے کو چاہتا ہے اور یہ بھی کہ میں آپ کا یہ کالم نہ چھپنے دوں کیونکہ اس میں سراسر میری بے عزتی

ہے۔" ہمدانی صاحب سنجیدہ سے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ نور سحر نے چونک کے انہیں دیکھا۔

"آخر میں بھی تو ایک مرد ہوں۔ مجھ سے اپنی اتنی بھیانک تصویر دیکھی نہیں جاتی...... ہا ہا ہا۔" ہمدانی صاحب نے ایک لحہ رک کر بات مکمل کی اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ نور سحر ان کی شرارت پر سر ہلا کر ان کی ہنسی میں شریک ہو گئی۔

☆......☆

نور سحر میز پر اپنے سامنے کچھ کاغذ بکھرائے، لیپ ٹاپ پر مصروف تھی۔ پیپر ویٹ کے نیچے دبے کاغذ پنکھے کی ہوا سے ہلکے ہلکے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ گاہے بگاہے وہ لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر کاغذات میں سے کسی ایک کاغذ پر نظر ڈالتی۔ اسے اٹھا کر اپنے سامنے رکھتی اور پھر اس کو دیکھ دیکھ کر کچھ ٹائپ کرنے لگتی۔ وہ سنڈے میگزین کے لیے نوکری پیشہ خواتین کے مسائل اور ان کے حل کے بارے میں اپنا آرٹیکل فائنل کرنے کے آخری مراحل میں تھی۔ وہ پوری توجہ سے کام کر رہی تھی۔ جب خیر دین آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"میڈم صاحبہ! ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔" خیر دین نے اسے اطلاع دی۔

"کون ہے؟" اس نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

"کوئی منصور صاحب ہیں۔ پچھلے ہفتے بھی آئے تھے مگر آپ کسی سلسلے میں باہر گئی ہوئی تھیں۔" خیر دین نے تفصیل بتائی۔

"کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟"

"کہہ رہے تھے کسی ضروری کام کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔"

"انہیں ویٹنگ روم میں بٹھائیے۔ میں انہیں تھوڑی دیر میں بلاتی ہوں۔"

"جی میڈم صاحبہ!" خیر دین پلٹ گیا۔ اگلے پندرہ بیس منٹ مزید اس آرٹیکل کی نوک پلک سنوار کر نور سحر نے اسے فائنل کر کے سیو کیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو پھیلا کر خود کو ریلیکس کیا۔ پھر اٹھ کر الیکٹرک کولر سے پانی کا گلاس بھرا اور واپس کرسی پر بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ پانی پی کر اس نے ریسیپشن پر فون کر کے منصور کو اندر بھیجنے کو کہا۔

☆......☆

"چند منٹ بعد خیر دین ان کو اس کی ٹیبل تک چھوڑ گیا۔

"السلام علیکم، مس سحر! منصور نے بہت ادب سے کہا۔

"وعلیکم السلام! پلیز تشریف رکھیے۔" نور سحر نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا جائزہ لینے لگی۔ منصور درمیانی عمر کا دراز قد آدمی تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ، بال الٹی مانگ نکال کر بنائے گئے تھے۔ ہلکے نیلے رنگ کی کافی دفعہ کی استعمال شدہ شرٹ اور سیاہ رنگ کی پینٹ میں ملبوس قدرے معقول آدمی دکھ رہا تھا۔

"شکریہ۔" منصور بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ وہ فائل اس نے نور سحر کی میز پر رکھ دی۔

"جی فرمایئے۔" نور سحر اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئی۔

"مجھے آپ کا تھوڑا سا وقت چاہیے اگر اس وقت آپ مصروف ہیں تو میں دوبارہ حاضر ہو جاؤں گا۔" منصور نے شائستگی سے کہا۔

"نہیں، آپ ابھی بتایئے۔" نور سحر اپنا کام مکمل کر چکی تھی سو ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"میں آپ کے پاس ایک سوال لے کر آیا ہوں۔ منصور نے میز پر رکھی فائل اٹھا کر اپنے سامنے کی اور اسے کھولنے لگا۔

"میں آپ کے پاس ایک سوال لے کر آیا ہوں۔" منصور نے میز پر رکھی فائل اٹھا کر اپنے سامنے کی اور اسے کھولنے لگا۔

"آپ خواتین کے بارے میں زیادہ لکھتی ہیں۔ ان کے مسائل، ان پر ہونے والے مظالم پر ریسرچ کر کے دلیل کے ساتھ معلومات معاشرے تک

پہنچاتی ہیں۔ کیا کبھی آپ کو مردوں پر ہونے والے مظالم کے بارے میں لکھنے کا خیال نہیں آیا۔'' منصور نے اپنے کندھے کرسی کی پشت سے ٹکائے۔

''مردوں پر کون سے ظلم ہوتے ہیں اور کس کی جرأت ہے جو آپ مردوں پر ظلم کرے۔'' نور سحر کے سوال پر جز بز ہوئی تھی۔

''آپ ذرا غور سے دیکھیں تو سہی ہمارے اس معاشرے میں عورتوں کے ہاتھوں مردوں کی بھی درگت بنتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عورت پر ہونے والے مظالم پر لوگوں کا دل دکھ جاتا ہے اور مردوں پر ہونے والے مظالم کسی کو دکھتے بھی نہیں۔'' منصور نے لمبی سانس کھینچی۔

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' نور سحر کو اس کی لایعنی گفتگو سے تھوڑی بے چینی ہوئی تو اس نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

''جس طرح سارے مرد ظالم نہیں ہوتے، اسی طرح ساری عورتیں بھی مظلوم نہیں ہوتیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ ہم بے چارے مردوں پر ہونے والی ناانصافیوں پر بھی کالم لکھیں۔''

''بے چارے مردوں پر ہونے والی ناانصافیاں۔'' نور سحر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''اچھا مجھے یہ تو بتائیے آپ مرد کن مسائل یا مظالم کا شکار ہیں۔'' نور سحر کو اب اس گفتگو میں مزا آنے لگا تھا۔

''مرد اور مظلوم ہو ہی نہیں سکتا۔'' نور سحر نے دل ہی دل میں کہا۔ بظاہر وہ پوری طرح منصور کی طرف متوجہ تھی۔

''اف کچھ نہ پوچھیں۔ سب سے پہلی ناانصافی ہم مردوں کے ساتھ یہ ہے کہ ہر سال 8 مارچ کو انٹرنیشنل ویمن ڈے منایا جاتا ہے۔ مجھے بتائیے کیا سال کا کوئی دن انٹرنیشنل مین ڈے کے طور پر منایا جاتا ہے..... نہیں نا..... کیا قصور ہے ہم مردوں کا کہ سال کا ایک دن بھی ان کے نام پر نہیں منایا جاتا۔

منصور تو جذباتی ہی ہو گیا۔

''نہیں..... نومبر کی کسی تاریخ کو مردوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔'' تاریخ نور سحر کو بھی یاد نہ آئی۔

''اچھا..... مگر میرے علم میں یہ بات بالکل بھی نہیں تھی۔ ویسے سچ بتائیے گا آپ نے نومبر میں بھی مردوں کے عالمی دن کے بارے میں کچھ لکھا؟''

''نہیں۔'' نور سحر نے نفی میں سر ہلایا۔

''کبھی ٹی وی میں کسی خبر میں یا کسی ٹاک شو میں اس کا ذکر ہوا ہے؟ نہیں..... کیوں؟ خواتین کے عالمی دن پر تو شور مچ جاتا ہے اور مردوں کے عالمی دن پر خاموشی کیوں طاری ہو جاتی ہے۔ اتنا کھلا تضاد کیوں؟'' نور سحر اب اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔ بظاہر سیدھا سادھا سا نظر آنے والا منصور جیسے شکووں سے بھرا ہوا تھا۔

''یہ اس سال جنوری سے اکتوبر تک آپ کے وہ مضامین اور کالمز ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے خواتین کے ساتھ ہے۔ دس مہینوں میں آپ کو ایک بار بھی ہم بے چارے مردوں کے بارے میں لکھنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟'' منصور نے کچھ کالمز اور مضامین کی کٹنگز نکال کر سامنے رکھیں۔

نور سحر نے اس کے پر شکوہ انداز پر آنے والے بے ساختہ قہقہہ بامشکل گھونٹا۔

''مرد کو بیٹے کی حیثیت سے دیکھ لیں۔ مائیں اپنے بیٹوں کو لعل کہتی ہیں مگر شادی کے بعد اس لعل کی وہ مٹی پلید کرتی ہیں کہ وہ ''لعل'' سے ''لال'' ہو جاتا ہے۔

''بیٹا جوان ہوتا ہے تو ماں کان سے پکڑ کر اپنی کسی بھانجی بھتیجی سے شادی کروا دیتی ہے اور پھر بھگتنے کے لیے اسے اکیلا چھوڑ دیتی ہے۔ بیوی کا خیال رکھو تو طعنے مار مار کر لہولہان کر دیتی ہے کہ زن مرید بن گیا ہے۔ لاپرواہی کرو تو طعنے کہ بچی کو رول کر رکھ دیا ہے۔ بتائیے ہم کہاں جائیں۔ ہمارا تو کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ساس بہو کی لڑائی میں کون پستا ہے؟

مظلوم مرد...... دونوں ہاتھوں سے بجنے والی اس تھالی کے درمیان مظلوم مرد کا چہرہ آجاتا ہے۔ ماں اور بیوی کے درمیان بیلنس رکھنا مشکل ہوجاتا ہے کوئی ہم مردوں سے پوچھے۔" منصور رونے کے قریب ہوگیا شاید بے چارا براہ راست متاثرین میں سے تھا۔

"اب بھائی کی حیثیت سے سن لیجیے۔ بھائی بے چارا رات کو دو بجے سویا ہو مگر بہن کو صبح آٹھ بجے اسکول کالج پہنچنا ہوتا ہے تو بھائی کو لازماً اٹھ کر سوتی جاگی کیفیت میں اسے چھوڑ کر آنا ہوتا ہے۔ اپنی نیند قربان کرنا کوئی چھوٹی قربانی ہے مگر جب بھی بات ہوگی بہنوں پر بھائیوں کے مظالم پر ہی ہوگی۔ کبھی بہنوں کے لیے بھائیوں کی قربانیوں کا ذکر نہیں ہوگا۔ جن کے پاس بائیک ہوتی ہے۔ اکثر وہ اپنے گھر کی دو دو خواتین کو بیک وقت پیچھے بٹھا کر خود بائیک کی ٹنکی پر بیٹھ کر بائیک چلاتے ہیں اور اس چیز کی ان کو اتنی عادت ہوجاتی ہے کہ بائیک پر اکیلے بھی ٹنکی پر چڑھ کر بیٹھے ہوں گے۔" منصور کے اتنے درست تجزیے پر نور سحر کا قہقہہ بے ساختہ بلند ہوا۔

"ہاں ہنس لیں۔ یہ کوئی مسائل تھوڑی ہیں کیونکہ ان کا سامنا صرف مردوں کو ہوتا ہے۔ مسئلہ تو صرف وہی ہوتا ہے جس کا سامنا کسی عورت کو ہو۔" منصور نور سحر کے ہنسنے پر قدرے برامان گیا تھا۔

"آئم سوری...... پلیز آپ بات جاری رکھیں۔ میں سن رہی ہوں۔"

"آپ نے لکھا ہے کہ عورتوں کو آرام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ دن میں کام اور رات کو اٹھ اٹھ کر بچے سنبھالتی ہیں پھر بھی شوہروں کی باتیں سنتی ہیں۔" منصور نے نور سحر کے ایک پرانے مضمون سے کچھ لائنیں پڑھ کر سنائیں۔

"آپ بتائیں میاں بیوی ایک ہی کمرے میں ہوتے ہیں۔ عام گھروں میں کمروں کا سائز بھی آپ کو معلوم ہے۔ اب اگر کمرے میں بچہ روئے گا تو کوئی کیا سو پائے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ بچہ روئے ماں جاگ جائے مگر باپ سوتا رہے۔ وہ بے چارا بھی جاگ جاتا ہے بھلے ڈھیٹ بن کر آنکھیں موندے لیٹا رہے۔ عورتیں نوکری نہیں کرتیں وہ اگر رات کو بچے کے ساتھ جاگتی ہیں تو انہیں دن میں کسی وقت کمر سیدھی کرنے کا موقع مل جاتا ہے مگر ہم مردوں کا کیا جو رات بھر بچے کے رونے کی وجہ سے جاگتے رہتے ہیں اور پھر سارا دن کام میں سر کھپائی بھی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود سب کو صرف عورت کا جاگنا اور مظلوم ہونا ہی نظر آتا ہے اور مرد ظالم کہ اس نے اٹھ کر روتے ہوئے بچے کو بہلایا نہیں۔" منصور سانس لینے رکا تو سحر نے قلم اٹھا کر اپنی ڈائری سامنے رکھ لی۔

"چلیں آپ ہماری ان قربانیوں کے بارے میں ہی لکھ دیں جو ہم اپنے خاندانوں کے لیے دیتے ہیں۔ ہم مرد خود چار جوڑے کپڑوں اور دو جوڑے جوتوں میں خوشی خوشی سارا سال گزار دیتے ہیں۔ مگر ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے بیوی بچے اچھے سے اچھا پہنیں۔ اگر کبھی ایک دفعہ کوئی کمی بیشی ہوجائے تو زیادہ تر بیویاں واویلے شروع کردیتی ہیں کہ ہماری ضروریات پوری نہیں ہورہیں...... بڑا ظالم انسان ہے دو جوڑے کپڑے کے لے کر نہیں دیتا وغیرہ وغیرہ۔ بیویاں جو شوہروں کو اپنے سر کا تاج کہتی ہیں وہ اپنے اس تاج کو اکثر اپنے پیروں تلے روندے رکھتی ہیں۔" منصور کا لہجہ بہت ہی جلا ہوا تھا۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟" نور سحر نے سوال کیا۔

"جی! یہ سب باتیں میں اپنے تجربے کی بناء پر کررہا ہوں۔ یقیناً دوسرے مردوں کو بھی ان مسائل کا سامنا ہوگا۔ اس لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ پلیز ایک بار تو ہمارے بارے میں بھی لکھیے۔" نور سحر اس کی گفتگو کے اہم نکات اپنی ڈائری پر نوٹ کررہی تھی۔

"مرد سارا دن اتنے پریشر میں کام کرتے ہیں سو

طرح کے مسائل ہوتے ہیں، نوکریوں کے، کاروبار کے۔ مگر تھک ہار کر شوہر گھر واپس آئے تو بیوی کے اپنے ہی دکھڑے اور چیخ چیخ شروع ہو جاتی ہے۔ ذرا جوان کی تھکن کا احساس ہو۔ سارا دن تھک ہار کر گھر آؤ تو گندے سندے حلیے والی بیوی کو دیکھ کر وہ تھکن سوا سیر ہو جاتی ہے۔ یہ کیا کم ظلم ہے۔" نور سحر کو اس کی اس بات سے سو فیصد اتفاق تھا سو سر ہلا کر اس کی بات کی تائید کی۔

"اور پھر ان مردوں سے زیادہ مظلوم کون ہوگا جو گھر آ کر اپنی بیویوں کے ہاتھ کا بدمزا کھانا بھی من و سلویٰ سمجھ کر نگل لیتے ہیں۔ اب ہر عورت کے ہاتھ میں ذائقہ تھوڑی ہوتا ہے۔ میری بیوی نے ایک دن آلو کے پراٹھے بنائے۔ میں نے کہا اس میں آلو تو نظر ہی نہیں آ رہے۔ مجھے ڈانٹ کر بولی۔ چپ کر کے کھاؤ لاہوری چنوں میں لاہور نظر آتا ہے۔" نور سحر اس کی باتوں کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے اپنی ہنسی روکنے کے جتن کر رہی تھی۔ اس کی بہت سی باتیں سچ ہی تھیں جن سے انکار بہرحال ممکن نہیں تھا۔

"بچوں کے سامنے باپ کو ہوا بنا کر پیش کرتی ہیں۔ بچے کو ڈراتی ہیں کہ باپ سے پٹوائیں گی اور خود باپ سے زیادہ بچوں کی دھنائی کرتی ہیں مگر بدنام صرف باپ ہی ہوتے ہیں۔ مرد جو ہوئے، ہم بیوی بچوں کے لیے کماتے ہیں ان کے لاڈ اٹھاتے ہیں ان پر خرچ کرتے ہیں۔ مشکل وقت میں ان کی ڈھال بن جاتے ہیں پھر بھی بدنام ہیں۔ یہ تو زیادتی ہوئی نا۔" منصور سانس لینے بمشکل رکا۔

"شوہروں پر الزام لگا دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں پر شک کرتے ہیں اور بیوی جو اپنے شوہر پر شک کر کر کے اسے خودکشی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرتا۔"

نور سحر تصویر کا وہ رخ دیکھ رہی تھی جو نظروں کے سامنے ہونے کے باوجود نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

"میرا مقصد عورتوں کی برائیاں کرنا نہیں ہے۔ میں صرف مردوں کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کی وجہ سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔"

"بالکل! میں سمجھ گئی ہوں۔ آپ بے فکر رہیے نومبر میں مردوں کے عالمی دن کے موقع پر میں آپ مردوں کے لیے کالم ضرور لکھوں گی۔" نور سحر نے منصور کو یقین دہانی کروائی تو وہ جیسے کھل اٹھا۔

"سچ کہہ رہی ہیں؟"

"جی آپ بے فکر ہو کر جائیے۔" نور سحر نے ڈائری اور قلم سائیڈ پر رکھے تو منصور اپنی فائل سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت بہت شکریہ مس نور سحر۔ میں آپ کے کالم کا انتظار کروں گا۔" منصور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆

نور سحر نے مسکرا کر اپنے جبڑوں کو پھیلایا اور ہاتھ سے ان کو سہلایا جو ہنسی ضبط کرنے کے چکر میں درد کرنے لگے تھے۔ پھر اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے گھوم کر لیپ ٹاپ اٹھایا اور اسے اپنے سامنے رکھ لیا۔ اس نے انٹرنیٹ سے مردوں کے عالمی دن کی تاریخ 19 نومبر اپنی اس ڈائری پر نوٹ کی جس پر اس نے منصور کی گفتگو کے اہم نکات نوٹ کیے تھے۔ پھر اس نے ڈائری سنبھال کر اپنی میز کی دراز میں رکھ دی۔

"19 نومبر کو میں خواتین کے لیے ہی ایک کالم لکھوں گی مگر اس کا عنوان ہوگا "وہ بے چارے" اس میں، میں خواتین کو تصویر کا یہ رخ دکھاؤں گی اور ان کو تجاویز دوں گی کہ وہ اپنے گھر کے مردوں کا باپ، بھائی، بیٹے اور شوہر کی حیثیت سے کس طرح خیال رکھ سکتی ہیں۔" نور سحر نے دل میں پکا ارادہ کر لیا۔ اب اسے انتظار تھا 19 نومبر کا، جس دن اسے کچھ چھپی ہوئی حقیقتیں سامنے لانی تھیں۔

☆......☆......

سیدہ عروج فاطمہ

افسانہ

# میں، تم اور فیس بک

''ماہم! ہم لڑکیوں کے دل موم کی مانند ہوتے ہیں جو مرد حضرات کی کانوں میں رس گھولتی باتوں سے بہت جلد پگھل جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ لڑکیوں کو اپنی حد میں رہنا پڑتا



ہے۔ لڑکوں کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے لیکن لڑکیوں کے لئے بدنامی کا دھبہ ساری زندگی پچھتانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ابھی وقت ہے تمہارے پاس، واپس پلٹ آؤ''۔ نازیہ نے اپنی بہن کو بہت کام کا مشورہ دیا تھا لیکن اندھی محبت کے سامنے سب ہی دلیلیں بے کار جاتی ہیں۔

''نازیہ! ریحان مجھے دھوکہ نہیں دے گا، مانا کہ میں رائٹر ہوں لیکن نہ جانے اس کی باتوں میں ایسی کیا کشش ہے کہ میں اس کے سحر میں گرفتار ہو چکی ہوں''۔ ماہم تو ریحان سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ابھی تک ریحان آن لائن نہیں آیا تھا۔ روز رات دس بجے ان باکس میں جس شخص سے بات ہوتی تھی آج اس کی غیر حاضری نے ماہم کے دل میں نئے وسوسوں کو جنم دینا شروع کر دیا تھا۔ بہت سے نئے پیغامات ماہم کو آج موصول ہوئے تھے لیکن سب ہی اس کے لئے بے معنی تھے۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ان باکس کے آپشن پر ابھرنے والے سرخ نشان سے ماہم کے چہرے پر رونق واپس آ گئی تھی۔

''سوری ماہم! کچھ کام تھا اس لئے دیر ہو گئی اور سناؤ کوئی نئی کہانی لکھی تم نے؟'' ریحان کی معذرت نے سارے شکوے مٹا دیئے تھے۔

''جی آج ہی ایک افسانہ مکمل کیا ہے''۔ ماہم نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''محبت کے موضوعات پر زیادہ لکھا کریں، لوگ ایسی کہانیاں زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں، آپ کے ہر ایک لفظ کو میں اپنے دل کی گہرائی سے محسوس کرتا ہوں، بہت اچھا لکھتی ہیں آپ''۔ ریحان نے تو اپنی بات مکمل کر لی تھی لیکن وہ روز ماہم کو نئی کشمکش میں مبتلا کر دیتا تھا۔

ماہم اور نازیہ دو بہنیں تھیں ان کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ کافی عرصہ قبل ان کے والد محمد کاشف صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے والد جائیداد کے اکلوتے وارث تھے اسی وجہ سے ساری جائیداد محمد کاشف صاحب کے حصے میں آئی تھی۔ ماہم نے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کرنے کے فوراً بعد ہی ادبی میدان میں اپنی شناخت قائم کر لی تھی۔ یکے بعد دیگرے ماہم کے افسانے شائع ہونے لگے۔ سوشل میڈیا کی پرکشش دنیا میں بھی ماہم کے سینکڑوں فینز تھے جو رائٹر ماہم کاشف سے ایک لمحہ بات کرنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

دوسری طرف نازیہ تھی جو ایم ایس سی فزکس کرنے کے بعد ایک نجی اسکول میں جاب کر رہی تھی وہ خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی۔ ان دونوں کی والدہ اپنی بیٹیوں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔

''ماہم! احمد ہمارے ماموں کا بیٹا ہے، تمہیں پسند بھی کرتا ہے، تمہاری طرح ذہین اور خوبصورت بھی ہے، تمہاری شادی اسی سے ہونی چاہیے''۔ نازیہ نے اپنی تجویز پیش کر دی تھی جس میں ماہم کا ہی بھلا تھا۔

''آپی! ایسا کبھی بھی ممکن نہیں ہو سکتا ہے میں صرف اور صرف ریحان سے ہی شادی کروں گی''۔ نازیہ اپنی بہن کے لئے بے حد فکر مند تھی۔

''ماہم! تم عمر کے جس دور سے گزر رہی ہو یہ بہت نازک دور ہوتا ہے۔ ریحان کی مکمل حقیقت تمہیں معلوم نہیں ہے۔ شادی وہیں کرنی چاہیے جہاں گھر والے راضی ہوں۔ امی کی بھی یہ ہی خواہش ہے کہ تمہاری شادی احمد کے ساتھ ہو جائے''۔ نازیہ کے یہ الفاظ سنتے ہی ماہم کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی اس سے پہلے کہ ماہم کمزور پڑ جاتی اور رونا شروع کر دیتی وہ کمرے

سے باہر چلی گئی۔

☆☆.............☆..............☆☆

"ریحان! کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟"
اتنی سی بات ٹائپ کرنے میں ماہم کو پندرہ منٹ لگے تھے۔ پانچ منٹ کے بعد ریحان کی طرف سے تفصیلی جواب آگیا تھا۔

"میری اب تک جتنی بھی رائٹرز سے بات ہوئی آپ ان سب سے مختلف ہیں۔ محبت تو مجھے آپ سے اسی دن ہوگئی تھی جب میں نے آپ کا پہلا افسانہ پڑھا تھا "آخری خواہش" سچ پوچھیں تو میری آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ میں آپ کو کبھی بھی کھونا نہیں چاہتا ہوں"۔ ریحان کے یہ ہی الفاظ چٹان جیسی مضبوط لڑکی کو اپنے حصار میں جکڑ چکے تھے۔ اگلی بات کرنے کی اس کی ہمت ہی نہ ہوئی تھی۔ ریحان بھی ماہم سے زبردستی بات کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس بات نے ماہم کے دل میں ریحان کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا تھا۔

"ماہم! آج تم ریحان سے دوٹوک بات کر لو، اس سے پوچھو وہ کب اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجے گا"۔ نازیہ کے لہجے میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔

"جی آپی! میں آج بات کرتی ہوں"۔ ماہم بس اتنا ہی کہہ سکی۔

ریحان ٹھیک دس بجے آن لائن تھا۔

"مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے"۔ ماہم نے ہر لفظ سوچ سوچ کر ٹائپ کیا اور کافی گھبراہٹ کے ساتھ سینڈ کے بٹن پر کلک کر دیا۔

"جی جی ضرور..... ایک نہیں ہزار باتیں کیجئے"۔ دوسری طرف سے ہمیشہ کی طرح محبت بھرا جواب ملا۔

"اگر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں تو کیا آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟" ماہم ہی جانتی تھی کہ اسے اس وقت کتنی کوفت محسوس ہو رہی تھی، ریحان کو یہ بات ماہم سے خود کرنی چاہیے تھی۔

"ماہم! مجھے غلط مت سمجھنا، میں خود تمہیں سچ سچ بتا دینا چاہتا تھا۔ ایک سال قبل میرا نکاح میری خالہ کی بیٹی سے ہو گیا تھا، ماہم میرا یقین کرو میں نے کبھی بھی اس سے محبت نہیں کی۔ میری والدہ کی ضد ہے کہ میں ان کی بہن کی بیٹی سے شادی کروں، ابھی صرف نکاح ہوا ہے، میں یہ زبردستی کا بندھن توڑ دوں گا"۔ ریحان کے ان الفاظ نے ماہم کی محبت کا بھرم چکنا چور کر دیا تھا۔

"ریحان! جسے تم صرف نکاح کہہ رہے ہو وہ کسی کی عمر بھر کا سوال ہے اور میں کسی لڑکی کا گھر خراب نہیں کر سکتی ہوں، میری آپی ٹھیک ہی کہتی تھیں مجھے کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں ہے، پلیز مجھ سے دوبارہ کبھی رابطہ مت کرنا"۔ یہ الفاظ ٹائپ کرنے کے بعد ماہم کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ آسمان سے زمین کی طرف منہ کے بل گر گئی ہے۔ اسے خود سے زیادہ ریحان پر یقین تھا، آئی ڈی تو لاگ آؤٹ ہو چکی تھی لیکن وہ حسین الفاظ جو اس کی زندگی کا حاصل تھے اتنی جلدی ذہن سے نہیں نکل سکتے تھے۔

"آپی! پلیز مجھے معاف کر دیجئے، آپ صحیح تھیں اور میں غلط، ریحان نے میرا مان توڑ دیا ہے، اب میں ساری زندگی کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکوں گی، مجھے دوبارہ کسی سے بھی محبت نہیں ہو سکے گی"۔ ماہم یہ کہنے کے بعد زار و قطار رونے لگی۔

"خود کو سنبھالو ماہم! تم بہت اچھی ہو، جتنا ہو سکے اللہ کی عبادت کرو، تمہارے دل کو سکون ملے گا"۔ نازیہ سے اپنی بہن کی یہ حالت دیکھی نہیں جا

رہی تھی۔

"آپی! آپ لوگ جہاں چاہیں میری شادی کر سکتے ہیں، میں اعتراض نہیں کروں گی"۔ ماہم اب یکسر بدل چکی تھی۔

☆........☆........☆

کچھ دنوں کے بعد ماہم کا نکاح احمد سے کر دیا گیا تھا۔ سی گرین کلر کے شیفون کے سوٹ میں ماہم بہت خوبصورت لگ رہی تھی، اس کے لمبے سلکی بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے لیکن مسکراہٹ کہیں غائب ہو چکی تھی۔ احمد بہت خوش تھا، ٹھیک چار ماہ کے بعد رخصتی ہونی تھی، ماہم نے کچھ وقت مانگا تھا، سب ایک طرف تھے جبکہ دوسری طرف احمد تنہا تھا جس نے ماہم کی بات مان لی تھی۔

رات کے دس بج چکے تھے، یہ ہی تو وہ وقت تھا جب ماہم اپنے دل کی سب ہی باتیں ریحان سے کیا کرتی تھی، ماہم کا دل چاہ رہا تھا کہ گھڑی سے دس کا ہندسہ ہی ہمیشہ کے لئے نکل جائے۔

قلم اٹھانے کی کوشش کرتی تو ریحان کے الفاظ یاد آ جاتے۔

"ماہم! آپ کے الفاظ مجھ میں نئی زندگی کی روح پھونک دیتے ہیں، مجھے آپ سے اور آپ کے لکھے ہوئے ہر لفظ سے محبت ہے"۔ فیس بک کی رنگا رنگ دنیا نے ماہم سے اس کی مسکراہٹ اور اعتماد چھین لیا تھا، خونی رشتوں سے زیادہ اہمیت ماہم نے فیس بک کو دی تھی، اچانک ماہم کے سیل فون کی اسکرین چمکی۔

"احمد مجھے کال کیوں کر رہا ہے؟" ماہم خود سے ہمکلام ہوئی۔

"السلام علیکم ماہم! کیسی ہو؟" احمد نے بہت اپنائیت سے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟"

"ماہم! میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ بہت اداس لگ رہی ہیں، کیا بات ہے؟"

"احمد! میں اچھی لڑکی نہیں ہوں، میں آپ کے قابل نہیں ہوں"۔ ماہم نے بڑی مشکل سے اپنی بات مکمل کی۔

"مجھے سب معلوم ہے ماہم! محبت اپنے ہونے کا ثبوت خود دیتی ہے، تمہاری آنکھوں کے آنسو چیخ چیخ کر بتاتے تھے کہ تمہیں کسی سے محبت تھی"۔ احمد نے تو ماہم کو لاجواب کر دیا تھا۔

"احمد! پھر آپ نے مجھ سے نکاح کیوں کیا؟ آپ کو تو کوئی بھی اچھی لڑکی مل سکتی تھی"۔ ماہم نے آج پہلی بار کھل کر احمد سے بات کی تھی۔

"ماہم! میں تو کسی رائٹر سے شادی کرنا چاہتا تھا اور وہ گھر کے قریب ہی موجود تھی، پھر مجھے کسی انجان لڑکی کی تلاش کیوں ہونی تھی، مجھے جس کی تلاش تھی وہ لڑکی مجھے مل گئی ہے"۔ احمد کی بات نے سوگوار ماحول خوشگوار کر دیا تھا۔

"احمد! آپ کبھی میرا ساتھ تو نہیں چھوڑیں گے ناں؟" ماہم یقین دہانی چاہ رہی تھی۔

"کبھی بھی میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا، لیکن میری بھی ایک شرط ہے"۔

"کیسی شرط...؟" ماہم نے حیرت سے سوال کیا۔

"ماہم! شرط یہ ہے کہ تم کبھی بھی لکھنا نہیں چھوڑو گی، ہم اتنی اچھی رائٹر کی خوبصورت تحریروں سے محروم نہیں ہونا چاہتے ہیں"۔

آج ماہم بہت دنوں کے بعد دل سے مسکرائی تھی۔ اسے لکھنے کے لئے بہت سے نئے الفاظ کے ساتھ سچی محبت بھی مل گئی تھی۔ احمد نے اس کی زندگی کی سب ہی الجھنوں کو سلجھا دیا تھا۔

☆........☆........☆

دعا محمد ایوب

افسانہ

# مجبوری

"ارے سکینہ! تم میرا ایک کام کرو گی، بازار سے کچھ چیزیں لانی ہیں لا دو گی، وہ کیا ہے ناں میری کچھ فرینڈز آنے والی ہیں اور میں نے کچھ تیاری ہی نہیں کی"۔ وہ لجاجت سے بولی۔

"جی بالکل باجی میں لے آؤں گی"۔ سکینہ بولی۔

"ٹھیک ہے تو میں تمہیں سامان کی لسٹ دے دیتی ہوں، اوکے"۔ شازیہ بولیں۔

☆......☆......☆

"یا اللہ اتنا فضول خرچہ، اس میں تو میں اپنے گھر کا پورا سامان لے لوں وہ بھی ایک مہینے سے بھی زیادہ چلے گا۔ خیر بڑے لوگ بڑی باتیں، ہم کیا کر سکتے ہیں"۔ سکینہ سوچنے لگی۔

"یہ لو باجی سارا سامان لے آئی ہوں"۔

"ارے سب لے آئی، تمہارا بہت شکریہ"۔

"باجی شکریہ کس بات کا، یہ تو ہمارا کام ہے"۔

☆......☆......☆

"آج پھر سکینہ نہیں آئی یا اللہ! میں کیا کروں اس کا، ہر وقت کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے"۔

"حیا..." حیا جلدی سے بولی۔

"جی امی"۔

"ذرا سکینہ کو فون تو کرو آج تو میں اس کا حساب کر کے رہوں گی"۔

"باجی باجی..." سکینہ دروازے سے بولتی ہوئی آ رہی تھی۔

"لو آ گئی مہارانی"۔

"باجی، باجی میری مدد کریں، میرا بیٹا چھت سے گر گیا ہے اور مجھے کچھ پیسے چاہئیں، باجی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کا آپریشن ہو گا اور اگر نہ ہوا تو میرا بیٹا مر جائے گا"۔ سکینہ بولی۔

"تو میرے پاس کیوں آئی ہو تم جاؤ کسی اور کے پاس کیونکہ میں نے تم کو کام سے نکال دیا ہے، تمہاری ہر وقت کی چھٹی سے میں بہت تنگ آ گئی ہوں اس لئے میں تم کو آج اور ابھی ہمیشہ کے لئے چھٹی دیتی ہوں، اب تم یہاں سے چلی جاؤ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی"۔ شازیہ غصے سے بولیں۔

"نہیں نہیں باجی میرے ساتھ اتنا ظلم مت کریں مجھے اس وقت آپ کی مدد کی بہت ضرورت ہے اس لئے مجھے کچھ پیسے......"

"تم پاگل ہو گئی ہو میں نے کہا ناں کہ اب تم یہاں کام نہیں کر سکتیں اور تمہیں پیسے کیسے دے دوں، پلیز تم جاؤ"۔

"نہیں باجی ایسے مت بولیں، میں کہاں جاؤں گی میرے پاس کوئی اور راستہ ہی نہیں، میری مجبوری سمجھیں اگر آپ کو کام نہیں کروانا تو ٹھیک ہے مت کروائیں پر میری تھوڑی مدد کر دیں۔ مجھے پیسے ادھار ہی دے دیں آپ کی بڑی مہربانی ہو گی"۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ایسے کیسے میں تمہیں ادھار دے دوں اور اس کی کیا گارنٹی کہ تم مجھے



پیسے واپس بھی دو گی"۔

"خدا کے واسطے آپ میری زبان پر یقین رکھیں میں آپ کو ضرور دوں گی"۔

"دیکھو تم اپنا ٹائم برباد کر رہی ہو اور ساتھ میں میرا بھی، اس لئے تم جاؤ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی"۔ شازیہ نے یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

☆..........☆..........☆

"باجی! آپ نے بلایا؟"

"ارے تم یہاں پھر آ گئی، دیکھو..."

"نہیں باجی! میں خود سے نہیں آئی وہ ثمینہ باجی نے بولا تھا کہ آپ کو کام والی کی ضرورت ہے تو بس اس لئے میں آئی ہوں"۔ سکینہ بولی۔

"پر سکینہ تم چھٹی بہت کرتی ہو اس لئے"۔

"نہیں باجی! اب بھی ضرورت نہیں ہو گی چھٹی کی"۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"امی، امی"۔ حیا تیز تیز بولتی ہوئی آئی۔

"ارے حیا بیٹا کیا ہوا؟"

"امی! وہ بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے"۔

"کیا یا اللہ! خیر میرے بچے کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔ سکینہ تم ذرا گھر کا خیال رکھنا، میں ابھی آتی ہوں"۔

"جی باجی! جائیے اللہ سب ٹھیک کر دے گا انشاءاللہ"۔

اسی طرح ایک ہفتے سے شازیہ بیگم یہاں سے وہاں بھاگ دوڑ رہی تھیں جب کہ ان کے شوہر بھی ملک سے باہر تھے۔

☆..........☆..........☆

"باجی! آپ فکر مت کریں انشاءاللہ چھوٹے بابا بالکل ٹھیک ہو جائیں گے"۔

"نہیں سکینہ تم نہیں جانتیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، آج میں خود کو کتنا مجبور سمجھ رہی ہوں کہ میں کچھ نہیں کر سکتی اپنے بیٹے کے لئے"۔

"مجبور... میں نہیں جانتی کہ مجبوری کیا ہے میں نے اپنے ان ہاتھوں میں اپنے بچے کو تڑپتا دیکھا ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں..."

"ہاں سکینہ تمہارے بیٹے کے ساتھ بھی کچھ ہوا تھا، کیا ہوا اس کا؟"

"جی باجی وہ چھت سے گر گیا تھا"۔

"تو وہ اب کیسا ہے اور کہاں ہے؟"

"وہ وہاں چلا گیا شاید وہ میرے پاس خوش نہیں تھا اس لئے وہ وہاں چلا گیا اب بہت خوش ہو گا اس دنیا سے بھی زیادہ"۔

"وہاں چلا گیا کیا مطلب ہے تمہارا، کہاں چلا گیا، دیکھو اگر اب بھی تمہارا بیٹا ٹھیک نہیں ہے تو تم اس کا علاج کراؤ میں تمہیں پیسے دینے کو تیار ہوں، جتنے چاہئیں میں دوں گی اور پلیز مجھے معاف کر دو میں نے جو بھی کیا، شاید اس کی سزا میرے بیٹے کو ملی ہے"۔

"نہیں... نہیں باجی آپ معافی مت مانگو، میں نے کبھی بھی آپ کو یا آپ کے بچے کو کوئی بد دعا نہیں دی اور نہ ہی کچھ کہا، بس غصہ ہوں تو خود پر کہ میں اپنے بیٹے کا علاج نہیں کرا سکی"۔

"میں نے کہا ناں کہ تم اپنے بچے کا اچھے سے علاج کرواؤ میں تمہیں..."

"نہیں باجی! اب آپ کے یہ پیسے میرے کسی کام کے نہیں، یہ میرے بیٹے کو واپس نہیں لا سکتے، اب بہت دیر ہو گئی میرا بچہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اللہ کے پاس، اسی دن جس دن میں آپ کے پاس آئی تھی"۔

"کیا سکینہ یہ..."

اور وہ کچھ بولے بغیر ہی گھر سے نکل گئی۔

"یا اللہ! یہ میں نے کیا کر دیا مجھے معاف کر دے میرے مولا آج میری وجہ سے اس کی گود سونی ہو گئی، آج میں جان گئی ہوں کہ مجبوری کیا ہے"۔ شازیہ بیگم افسردگی سے دل میں سوچے جا رہی تھیں۔

☆..........☆..........☆

بشریٰ تنویر

افسانہ

# بدگمان

''کدھر چلے ہو سوہنیو؟'' کالج کی لمبی سڑک کا موڑ مڑتے ہی اس کے کانوں سے کسی آوارہ کی رال ٹپکاتی آواز ٹکرائی۔ اس سے پہلے وہ پلٹ کر اسے کوئی تخت جواب دیتی سدا کی ڈرپوک سعدیہ بولی۔



”ردا پلیز! کوئی جواب نہ دینا، یہ تو ان لڑکوں کی عادت ہے، بھلا ہمیں کیا ضرورت ہے کیچڑ میں پتھر پھینک کر اپنا دامن گندہ کرنے کی“۔ خلاف توقع بنا کچھ بولے وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی ورنہ وہ تو ”سنو سب کی کرو من کی“ والے مقولے پر عمل کرتی تھی۔ اس کی یہ مسلسل خاموشی سعدیہ کو کھٹکھٹانے لگی، کن انکھیوں سے وہ اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ رہی تھی، ردا اس کی کیفیت سے بے نیاز اپنی ہی دھن میں بولی۔

”سعدی! تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن یار، یہ لڑکے یہ کیوں نہیں سوچتے، ان کی ان گھٹیا حرکتوں کا بھگتان ان کی ماں بہنوں کو بھرنا پڑتا ہے، انہی لوگوں کی وجہ سے کئی لڑکیاں خود پر تعلیم کے دروازے بند کر کے گھر بیٹھ چکی ہیں“۔ بولتے بولتے وہ کچھ دیر کو رکی۔

”مجھے تو ہنسی آتی ہے جب ”عورت ہر لحاظ سے آزاد ہے“ کا نعرہ ہمارے ملک میں گونجتا ہے، لیکن سچ تو چھوٹے چھوٹے محلوں کی ان تنگ گلیوں میں بکھرا ہوا ہے“۔ اس کا لہجہ انتہا درجے کی تلخی لیے ہوئے تھا۔

”ردا! تم یہ سوال اپنے بھائی سے کرنا کہ وہ ”یہ کیوں نہیں سوچتے؟“ ”یہ“ پر خاصا زور دیتی وہ اس سے بھی زیادہ تلخ لہجے میں بولی۔

”واٹ... ؟ میں یہ سوال اپنے بھائی سے کیوں کروں؟“ جواباً وہ اپنی جگہ سے دس فٹ اوپر اچھلی۔

”جبکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں میرے بھائی ان لفنگوں جیسے نہیں“۔ فخر سے کہتی وہ اس سے چند قدم آگے بڑھ گئی مگر اگلے ہی لمحے سعدیہ کے مذاق اڑاتے والے سوال پر وہ یکدم ہی پلٹی تھی، سعدیہ کہہ رہی تھی۔

”اچھا! اگر تمہارے بھائی اتنے ہی شریف ہیں تو پھر شریف بھائیوں کی بہن ردا کیوں یہ بھگتان بھر رہی ہے؟“ ردا لاجواب ہوگئی، لیکن انسان جب لاجواب ہونے لگتا ہے تو پھر وہ طرح طرح کی تاویلیں گھڑنا شروع کر دیتا ہے، ردا نے بھی ایک ایسی ہی لولی لنگڑی تاویل کا سہارا لیا۔

”کبھی کبھی یہ رب کی جانب سے بھیجی گئی آزمائش بھی ہوتی ہے“۔ کہتے ہی وہ خاموش ہوگئی۔ پھر یہ چھوٹا سا سفر لمبی سی خاموشی میں گزرا۔ ردا جیسی باتونی لڑکی کی یہ طویل خاموشی اس کی سنگین ناراضی کی غماز تھی۔

☆............☆............☆

بگڑے موڈ کے ساتھ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی، نظر سیدھی صحن میں کھڑی شہروز بھائی کی موٹر سائیکل پر پڑی، جو اس وقت ان کی گھر میں موجودگی کا پتہ دے رہی تھی۔ پھولا منہ لمحوں میں خوشی سے تمتمانے لگا، وہ تیزی سے بھائی کے کمرے میں گھسی تھی اور جتنی تیزی سے وہ اندر گئی تھی، اتنی ہی تیزی سے وہ دروازے میں تھمی تھی، سامنے چارپائی پر پڑے ہرے ہرے نوٹوں کو دیکھ کر خوشی کی جگہ الجھن پھیلنے لگی، آنکھیں پھاڑے وہ کبھی ان نوٹوں کو دیکھتی تو کبھی اپنی جانب سے پشت کیے، نوٹ گنتے اپنے دلارے بھائی کو۔ سکتہ ٹوٹنے کے بعد وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح ان کے سامنے پہنچی۔

”بھائی... یہ... یہ اتنے سارے پیسے آپ کے پاس کہاں سے آئے؟“ اس کے لہجے میں عجیب سا تاثر تھا اور بھائی صاحب جو بری طرح نوٹ گننے میں مگن تھے، ردا کی اچانک مداخلت پر گڑبڑا سے گئے۔

ان کے مطابق اس وقت ان کے اور ان کے دوست نعیم زوار کے علاوہ تو گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ ابو اور بہروز شام سے پہلے گھر نہیں لوٹتے تھے اور امی بذات خود انہیں پڑوس میں جانے کا بتا کر گئی تھیں۔ شاید روپوں کی خوشی میں وہ ان کی گیٹ بند کر لینے والی تلقین پر کان نہ دھر سکے اور اب کان نہ دھرنے کا نتیجہ ردا کی صورت میں سامنے کھڑا تھا۔

”بھائی! کچھ پوچھ رہی ہوں میں“۔ اس کے چلاتے پر وہ اپنی عمیق سوچ سے چونکے، اور اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ سخت بدمزہ ہوئے، یہ اسی

بدمزگی کا نتیجہ تھا کہ زندگی میں پہلی بار انہوں نے اپنی گڑیا سی بہن کو سختی سے ٹوکا تھا۔
''ردا! بات کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے، جب دیکھو تم بچوں کی طرح چلاتی رہتی ہو''۔
''کیا ہوا یار! تو چلا کیوں رہا ہے؟'' اپنے دھیان میں باتھ روم سے نکلتے نعیم نے استفسار کیا لیکن شہروز بھائی کے پہلو میں کھڑی ردا کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا، اس کی چھوٹی چھوٹی ہوس زدہ آنکھیں ردا کے وجود کے آر پار ہونے لگیں، اس کی گہری نظروں پر جہاں ردا کو کوفت ہوئی وہیں شہروز بھائی نے پہلو بدلا مگر وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ ان کا باس تھا، اسی لئے انہوں نے ردا کو ہی وہاں سے ہٹانا چاہا۔
''ردا! تم جاؤ اور کھانے کا انتظام کرو''۔ ان کے کہنے پر شکر کا کلمہ پڑھتی وہ فوراً وہاں سے بھاگنے والے انداز میں نکلی جبکہ نعیم کی سوچ کی طنابیں ردا ہی کے گرد اڑنے لگیں۔
☆..........☆..........☆
''ہیلو! کاشف کہاں ہو تم؟'' فون کے اس پار وہ اپنے جگری ماتحت سے مخاطب تھا۔
''گھر میں ہی ہوں، مجھے بھلا کہاں جانا ہے باس''۔ ماتحت ضرورت سے زیادہ عاجزانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔
''پر اب گھر میں نہیں رہو گے''۔ موچھوں کو تاؤ دیتا وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔
''کیوں... کیا شہروز آپ کو چھوڑ کر چلا گیا ہے؟'' حاسدانہ لہجہ، جو اکثر ایک ماتحت کا دوسرے ماتحت کے لئے ہوتا ہے۔
''ہاہاہا''۔ جواباً ایک چھت پھاڑ دینے والا قہقہہ کاشف کے کانوں میں اترا، پھر باس سابقہ انداز میں بولا۔
''پیارے وہ زندگی کرنے کے لئے ہے اور تو راتیں''۔ کالے بھدے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔
''آپ کا مطلب ہے کوئی نیا شکار...'' جملہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑا گیا تھا۔
''بالکل! میرے یار تو صحیح سمجھا ہے''۔ ادھورا جملہ مکمل ہو گیا تھا، کاشف کو کام مل گیا اور باس کو شکار ملنے والا تھا۔ پاٹ دار آواز میں وہ اسے تفصیل بتانے لگا جس کا لفظ لفظ کاشف بغور سن رہا تھا۔
☆..........☆..........☆
''بھائی پلیز! مجھے کالج تک چھوڑ دیں''۔ لجاجت سے کہتی وہ اس وقت سفید یونیفارم میں ملبوس تھی۔
''کیوں میں کیوں چھوڑوں، تم روز تو کالج جاتی ہو، آج نیا کیا ہو گیا ہے؟'' بھائی حیرت زدہ ہوئے۔
''نیا یہ ہو گیا ہے آج سعدیہ کالج نہیں جا رہی اور اب میں اکیلے جانے سے تو رہی؟'' سانولی رنگت والے چہرے پر بکھری پاکیزگی اس کی معصومیت میں کچھ اور بھی اضافہ کر رہی تھی، شہروز بھائی نے بے ساختہ اپنی ہی نظر لگ جانے کے ڈر سے آنکھیں پھیر لیں اور ٹھہرے لہجے میں بولے۔
''تو اکیلے جانے میں کیا قباحت ہے، یہ دو گلیاں چھوڑ کر ہی تو تمہارا کالج ہے''۔
''ہاں ہاں بہت قریب ہے، دیکھئے گا کہیں آپ کا ہاتھ ہی نہ لگ جائے''۔ خفگی سے اس نے منہ پھلایا۔
''فضول کی بحث بند کرو اور آؤ میرے ساتھ، میں چھوڑ آتی ہوں تمہیں''۔ دونوں کو بے معنی بحث میں الجھتے دیکھ کر امی نے مداخلت کی، ردا ناراضی سے شہروز بھائی کو تکتی امی کے ساتھ چل پڑی۔ مسکراتے ہوئے شہروز بھائی نہیں جانتے تھے کہ محض ڈھائی گھنٹوں بعد وہ اپنی نازک سی گڑیا کو کس حالت میں دیکھنے والے ہیں۔
☆..........☆..........☆
''آج سورج انکل تو صبح صبح ہی گرم ہو رہے ہیں''۔ آگ اگلتے سورج کی تپش کو اپنے بدن کو جھلساتے دیکھ کر ردا نے تبصرہ کیا، امی نے کوئی جواب

نہیں دیا، بس گم صم سی اس کے ساتھ چلتی رہیں، وقفے وقفے سے قطار در قطار کھڑے درختوں کی چھاؤں پیاسے کے لئے پانی کی سی مثال رکھتے تھے۔ وہ دونوں جیسے ہی ایک نئے درخت کی چھاؤں میں آئے، امی بولیں۔

"پتہ نہیں کیوں آج میرا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا ہے، ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے"۔ اندیشوں میں گھری یہ آواز ایک ماں کی تھی۔ ماں جو ایک نجومی دل رکھتی ہے، جو آنے والی خوشگوار یا ناخوشگوار گھڑیوں کی دھمک وقت سے پہلے ہی اپنے دل پر محسوس کرنے لگتی ہے۔ وہ بھی دبے پاؤں اپنے دل میں گھسنے والے اندیشے کی آہٹ جان چکی تھیں اور اب بری طرح گھبرا رہی تھیں۔ درخت کی چھاؤں سے نکل کر جیسے ہی انہوں نے چلچلاتی دھوپ میں قدم رکھا، ایک کونے سے دو ہٹے کٹے مردوں نے نکل کر ردا کو دبوچ لیا، ماں کے وہم... سچ... ہو گئے، بھیانک طوفان نے ان کے گھر کا راستہ دیکھ لیا اور ہزاروں کی بھیڑ سے ردا آسانی سے اغوا ہو گئی۔ کوئی ایک بھی ہاتھ ایسا نہ تھا جوان کی عزت بچا لیتا، کوئی ایک بھی قدم ایسا نہ تھا جو آگے بڑھ کر کسی کی گڑیا کو خاک ہونے سے بچا لیتا، وہاں صرف آنکھیں تھیں، تماشائی آنکھیں، جن کے مالک عزت خراب ہونے کے بعد طرح طرح کی بولیاں بولنے لگے۔

"لگتا ہے لڑکی کا کوئی پرانا عاشق تھا"۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے لڑکی نے خود یہ تماشا کرنے کے لئے کہا ہو"۔ ایک اور کاٹ دار جملہ۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کوئی ان کی دشمنی میں ایسا کر رہا ہو"۔ ہزاروں میں ایک مثبت جملہ۔ لیکن امی کے کانوں تک تو کوئی آواز ہی نہ پہنچ رہی تھی۔ ان کے کان تو بس ردا کی آوازیں سن رہے تھے۔ بچپن سے لے کر آج تک کی ساری باتیں، سارے منظر ان کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ عالم فراموشی میں

وہ خود کو گھسیٹتی گھر تک پہنچیں، کالی چادر سے ڈھکے سفید بال عریاں ہو چکے تھے، عزت کی نشانی کالی چادر اپنے رنگ کی طرح زمین میں رُلتی جا رہی تھی، گھر سے نکلتے شہروز بھائی امی کو اس حالت میں دیکھ کر تڑپ کر ان کی طرف بڑھے۔

"امی! کیا ہوا آپ کو؟ اور ردا کہاں ہے؟"

"ردا...!" یہ نام سسکی بن کر ان کے لبوں سے آزاد ہوا اور پھر آنکھیں نمکین پانی سے گیلی ہونے لگیں۔ جوان بیٹے کے چوڑے سینے سے لگ کر وہ اپنی ننھی گڑیا کے لئے رونے لگیں۔

"امی! آپ کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟" ان کے بلکتے وجود نے شہروز بھائی پر گھبراہٹ طاری کر دی۔

"کیا بولوں، کیا بتاؤں"۔ بے بسی سے کہتی، انہوں نے بمشکل اپنی چیخ کا گلا گھونٹا۔

"ردا میری بچی کو کسی نے اٹھوا لیا ہے"۔ امی کے منہ سے نکلے لفظ شہروز بھائی کے لئے اتنے غیر متوقع تھے کہ وہ دم بخود رہ گئے۔ تخیل کے پردے پر نجانے کیوں نعیم زوار کی گہری نظریں اور ردا کا کوفت زدہ چہرہ گھوم گیا، ان کی چھٹی حس نے انہیں کوئی اشارہ کیا تھا۔

"امی! آپ رونا بند کریں، میں ابھی آتا ہوں"۔ انہیں خود سے الگ کر کے وہ فوراً گیٹ پار کر گئے، ان کا ہر بڑھتا قدم پہلے قدم سے کئی گنا تیز ہوتا۔

☆......☆......☆

یہ آج سے تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے، اس دن ایک بار پھر وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے نوکری کی کوشش میں ناکام ہو کر باہر نکلے تھے، ڈھیلے ڈھیلے قدم اٹھاتے وہ فٹ پاتھ پر چل رہے تھے، دو شیطانی نگاہوں نے ان کی مایوسی کو بڑے غور سے جانچا اور پھر وہی ہوا جو ازل سے ہوتا آیا ہے، ابن آدم... شیطانی بہکاوے میں آ کر اس کی انگلیوں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچنے لگا، اس بار وہ شیطان انسانی روپ دھار کر 'نعیم زوار' کے نام سے آیا تھا۔ 'نعیم زوار' اغوا برائے تاوان

کے گروہ کا باس تھا۔ شہروز بھائی اپنی بہادری کی بدولت اس کے خاص بندوں میں آتے تھے۔ بہت تھوڑے سے عرصے میں انہوں نے نعیم زوار کا دل جیت لیا تھا مگر افسوس وہ اس سارے چکر میں یہ بھول گئے نعیم زوار ایک سانپ تھا، ڈسنا جس کی فطرت میں ہے، وہ بھی انہیں ڈس گیا تھا اور ایسا ڈسا تھا کہ زہر ان کے پورے وجود میں تحلیل کر گیا، اب وہ نہ جی سکتے تھے اور نہ ہی مر سکتے تھے۔

☆............☆............☆

جس وقت وہ نعیم زوار کی گلی میں پہنچے، پاس ہی کسی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے مولوی صاحب کی آواز ابھر رہی تھی۔ ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''پاک دامنی اختیار کرو، تمہاری عورتیں بھی پاک رہیں گی''۔ یعنی اگر آپ کسی عورت کو گندی نظروں سے دیکھیں گے تو کل کو آپ کی بہن بیٹیوں کے ساتھ یہی ہوگا، وہ بھی غلیظ نگاہوں کی زد میں آئیں گی، اور میرا نہیں خیال کسی مرد کی غیرت یہ سب گوارا کر سکتی ہے''۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے لیکن شہروز بھائی کی سماعتیں مزید سننے سے قاصر تھیں، آنکھیں ایک تسلسل سے بھیگ رہی تھیں، دھندلی آنکھوں کے ساتھ انہوں نے نعیم زوار کے بنگلے کو دیکھا اور دل سے بے اختیار ردا کی سلامتی کی دعا نکلی۔

''شہروز بھائی! تم یہاں کیا کر رہا ہے''۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے اپنے پشتو لہجے میں سوال کیا۔ کچھ دیر بے تاثر نگاہوں سے اسے تکنے کے بعد وہ بولے۔

''مجھے نعیم سے ملنا ہے''۔ دھیما لیکن کرخت انداز، چوکیدار کچھ گھبرا سا گیا۔

''لیکن نعیم صاحب تو گھر پر نہیں ہیں''۔ چوکیدار کی زبان کی لڑکھڑاہٹ اس کے جھوٹا ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔

''جھوٹ، تم جھوٹ بول رہے ہو، وہ کمینہ اندر ہی ہے''۔ کہتے ہی انہوں نے ایک زوردار مکا اس کے منہ پر مارا اور نیچے زمین پر گری بندوق اس پر تان کر بولے۔

''زندگی چاہتے ہو تو مجھے خاموشی سے اندر جانے دو ورنہ...'' اور اس ورنہ کے آگے چھپی دھمکی کو وہ واضح طور پر جان گیا تھا، خاموشی سے وہ اس کے راستے سے ہٹ گیا اور وہ اندر بڑھ گئے حالانکہ قیامت آ کر گزر بھی چکی تھی۔

☆............☆............☆

ہوش کی دنیا میں لوٹتے ہی اس نے اپنی نظر اپنے ہی وجود پر دوڑائی، خالی خالی نگاہوں سے وہ خود کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس سے پہلے اس نے کبھی خود کو دیکھا ہی نہ ہو، واقعی آج سے پہلے اس نے اپنی ایسی حالت کب دیکھی تھی، اجڑی، بکھری، ویران، کسی شیطان کی شیطانیت کا ثبوت دیتی، اس سے پہلے تو اس کے وجود کے پاس عزت و آبرو جیسی دولت کا فخر تھا، جو آج دن دیہاڑے کسی کالے کرتوتوں والے کی تسکین کا باعث بن چکا تھا اور کتنی عجیب بات تھی نا، وہ کالے کرتوتوں والا اس کے سامنے صوفے پر براجمان تھا اور وہ گم صم سامنے دیوار کو تکے جا رہی تھی۔ نعیم زوار اس کے ایسے خاموش ردعمل پر حیران تھا، وہ تو اس کے رونے چلانے والے ردعمل کو سوچے بیٹھا تھا، آج پہلی بار نجانے کیوں اسے کسی کے جامد لبوں نے خوفزدہ کیا تھا، عجیب سے ڈر نے اس کے وجود کو اپنے گھیرے میں لیا تھا مگر ردا خاموش کب تھی، اس کی خاموشی بول رہی تھی، چیخ رہی تھی، اپنے رب سے انصاف مانگ رہی تھی، انصاف جو شاید اسے ملنا تھا یا اس کے ذریعے سے کسی اور کو ملنا تھا، موت کی سی اس چپ کو ردا کی سپاٹ آواز نے توڑا۔

''دوست، دوست کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے اور میرا وجدان کہہ رہا ہے تمہیں بھی شہروز بھائی اچھی طرح سے جانتے ہوں گے لیکن اس سب کے باوجود وہ تمہارے ساتھ ہیں، کیوں؟'' کافی دیر سے ذہن میں کلبلاتے سوال کو آخر کار اس نے زبان دے ہی دی۔ اس کے لہجے میں کرب کی لہر

کو محسوس کرتے ہوئے، نجانے نعیم زوار کو کیا ہوا جو وہ رٹو طوطے کی طرح اسے سب بتاتا گیا۔ آگہی جہنم کی آگ کی طرح ہوتی ہے، جو انسان کو سر سے پیر تک جھلسا دیتی ہے۔ ردا بھی جھلس گئی تھی، اذیت کا درخت اس کے اندر جڑیں مضبوط کرنے لگا اور ضبط کا پیمانہ چھلک گیا، وہ چیخ کر بولی۔

"خدا کے لئے، کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے، میرے شہروز بھائی ایسے نہیں ہو سکتے۔ وہ تو کیچڑ میں کھلے کنول کی طرح شفاف ہیں، کہہ دو یہ جھوٹ ہے سراسر جھوٹ"۔ کسی گہری کھائی سے آتی اس پُر درد آواز نے شہروز بھائی کے قدم دہلیز پر ہی جکڑ لئے، آنکھوں کو ایک جھٹکے سے بند کر کے کھولنے کے بعد، انہوں نے اپنا سر جھٹکا، جیسے اس منظر کی نفی کرنی چاہتے ہوں، اپنی بہن کو ایسی شرمناک حالت میں دیکھ کر وہ پھنکارتے ہوئے نعیم زوار کی طرف بڑھے۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا"۔ نعیم کے گریبان کی طرف بڑھے ہاتھوں کو ردا نے سختی سے اپنے ہاتھوں میں جکڑا۔

"اسے کیوں مارنے لگے ہیں؟ کیا قصور ہے اس کا؟ اس کا کوئی قصور نہیں ہے"۔ متوازن آواز میں بولتی، وہ جہاں کھڑے ان دونوں مردوں کو دنگ کر گئی، آنکھوں میں وحشت، ہونٹوں پر زخمی مسکان لئے وہ ہر احساس سے عاری لہجے میں بول رہی تھی۔

"بلکہ قصور تو کسی کا بھی نہیں ہے کیونکہ ہم بہنیں تو پیدا ہی بھائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے ہوتی ہیں، بھائیوں کے لئے کبھی ہم دار چڑھتی ہیں تو کبھی ہم اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے خواب مٹی کر دیتی ہیں، یہ تو ازل کی ریت ہے، ہمیشہ کا دستور ہے، پھر آج آپ کیوں خلاف دستور بھڑک رہے ہیں؟ کیوں بھائی؟" سکون سے بولتے بولتے وہ اب چلانے لگی۔

"دیکھیں غور سے دیکھیں میری طرف، میرے اس اجڑے چہرے میں آپ کو ان سب معصوم لڑکیوں کے چہرے نظر آئیں گے جن کی زندگی آپ کی وجہ سے تباہ ہوئی"۔ گھٹنوں کے بل وہ اب زمین پر گر چکی تھی۔

"قصور نہ اس شخص کا ہے اور نہ ہی آپ کا، اصل قصور میرا ہے جو میں آپ جیسے شخص کی بہن ہوں، قصور تو برسوں سے چپ تقدیر کا ہے، جس نے آج انصاف کیا ہے، قصور تو ان بے آبرو کی ہوئی لڑکیوں کا ہے، جن کی آہوں، سسکیوں کو آج شرف قبولیت بخشا گیا ہے، قصور تو...."

"ردا میری جان! چپ کر جاؤ، پلیز چپ کر جاؤ"۔ بڑے شکستہ انداز میں اس کی بات کاٹ کر چپ ہو جانے کا کہنے والے شہروز بھائی نہیں جانتے تھے کہ ان کی ہر بات کو حکم کا درجہ دینے والی بہن، آج جو خاموش ہو گئی تو پھر وہ تاعمر اس کی آواز سننے کے لئے ترستے رہیں گے، وہ لہرا کر زمین پر ڈھیر ہوئی تھی، اسے یوں لگا جیسے اس کی سانس رک رہی ہو، روح کھنچی جا رہی ہو، شاید وہ مرنے والی تھی مگر نہیں ابھی اس کے بھائی کی سزا ختم نہیں ہوئی تھی، وہ زندہ تھی، سانس بھی لیتی تھی، زندگی گزار رہی تھی لیکن زندگی جی نہیں رہی تھی۔

☆.........☆.........☆

اس روز وہ معمول کی طرح گھر پہنچی تھی اور پھر کبھی باہر نہ نکلی، کسی کا سوال وہ چابی ثابت نہ ہو سکا جو اس کے خاموشی کے قفل کو توڑتی۔ اس سانحے کو دس سال گزر گئے، چھوٹے سے اس گھر میں اب بہروز بھائی کی بیوی بھی آ چکی تھی، ایک شام شہروز بھائی اپنے گھر سے ایسے نکلے کہ وہ شام ہمیشہ کے لئے اس گھر میں ٹھہر گئی۔ امی ابو بیٹے کی گمشدگی اور بیٹی کی چپ کا دکھ لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے پر پھر بھی ردا کی چپ نہ ٹوٹی۔ ایک بھگتان بھرنے کے بعد وہ آج بھی چپ تھی اور شاید اب اسے مرتے دم تک چپ ہی رہنا تھا کیونکہ بہنیں بھائیوں کے عیب ہمیشہ راز رکھتی ہیں۔

☆.........☆.........☆

حورینہ سعد

افسانہ

# یوں وہ قریب آ گیا

موسم تو بہت خوشگوار تھا۔ نومبر کے ابتدائی دنوں کی بات ہے اسے آفس جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے اس نے جلدی سے اپنے بالوں کو ٹاول میں لپیٹ لیا۔ غریب لوگوں کے لیے لمبے اور گھنے بال ہونا بھی دردسری ہی ہوتی ہے۔

مائرہ نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ تو اسے خود بھی اس مائرہ پر نہ صرف پیار بلکہ رحم بھی آ گیا جو اپنے بالوں کو نوچ نوچ کر کنگھا کیے جا رہی تھی۔ بڑی بے رحمی سے اس نے کیچر سے اپنے بالوں کو لپیٹا اور بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔ بس سے اتر کر آفس کی جانب جانے میں بھی راستہ پل صراط کا تھا۔ ناہموار راستوں کے بڑے بڑے دریا نہ جانے کتنے انسانوں کی بھیڑ میں بھی تنہائی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ بالوں کی نمی نے اس کے کندھوں پر ہلکا ہلکا نہ صرف بوجھ ڈالا بلکہ سر درد کی کیفیت بھی طاری ہونے لگی۔ نئی نئی جاب کا بھی معاملہ تھا۔ ہاتھ کی مٹھی سے ریت کی طرح نہ پھسل جائے۔ اس نے کیچر کو اپنے بالوں سے ہٹا دیا۔ بال کھل کر آزاد ہو کر اس کی کمر سے نیچے لٹکنے لگے تھے۔ بالوں کی نمی سے اس کی کمر ہلکی ہلکی بھیگنے لگی لیکن وہ اپنے ہوش میں کب تھی وہ تو بس جلدی جلدی آفس پہنچ جانا چاہتی تھی۔ تبھی کوئی شخص اس سے ٹکرایا تھا۔

"سوری۔" کہہ کر وہ چلا گیا مگر مائرہ کی حس اسے بتا رہی تھی کہ وہ شخص اس سے جان بوجھ کر ٹکرایا ہے۔ اس نے پلٹ کر گھور کر اس شخص کو دیکھا۔

ابا نے اس کو بچپن میں بتایا تھا کہ جو لڑکیاں شرما جاتی ہیں اردگرد دیکھنے والے بھی سمجھتے ہیں کہ یہ لڑکی اچھی نہیں ہے اگر رک کر اور غصے سے دیکھو تو اگلے بندے کو خبر ہوتی ہے کہ وہ کسی شریف لڑکی کو چھیڑ رہا ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا اس نے ٹھہر کر پلٹ کر غصے سے دیکھا۔ وہ نہ جانے کس طرف جلدی سے نکل گیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ وہ جب آفس میں داخل ہوئی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی وہ شخص اس کے اردگرد کہیں ہے۔ آفس پہنچ کر بھی اسے ایک دردسری کا سامنا تھا۔

"تم صبح بھی بال کھول کر گھر سے نکلتی ہو؟" رمشہ نے دبی دبی مسکراہٹ سے اسے چھیڑا۔

"ہاں یار بال گیلے تھے اور سر میں درد ہونے لگا تو میں نے انہیں کھول دیا۔"

"چلو ہم بھی اپنے بال کھول دیتے ہیں۔" جویریہ اپنے بال کھول کر کھلکھلا کر ہنس دی تو رمشہ بھی اس کے اس طنز پر مسکرا دی۔

"پلیز تم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔" اس نے اپنے بال جلدی سے کیچر میں لپیٹ لیے اور آنکھوں میں دریاؤں کی نمی اتر آئی تبھی شیراز اس کے پاس آ کر بولا تھا۔

"کیا ہوا میڈم! آپ کچھ اداس لگ رہی ہیں۔"

"نہیں شیراز کچھ نہیں۔" وہ اپنی فائل پر جھک گئی۔

واش روم جا کر وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ اپنے لمبے اور گھنے بالوں سے وہ بیزار ہو کر انہیں انگلیوں سے سلجھاتی رہی جو الجھ گئے تھے۔ پھر وہ فریش ہو کر باہر آ گئی۔ ہر کوئی



اس سے پوچھتا کہ مائرہ تمہارے ان بالوں کا راز کیا ہے۔ اندر سے دل جلتا لیکن وہ ہنس کر کہتی۔
"بدنصیبی۔"
"بدنصیبی......!" رمشہ چونک جاتی۔
"کمال ہے اتنے خوب صورت بال ہیں کہ جو دیکھتا ہے وہ اسیر ہو جاتا ہے تمہارے بالوں کا۔ کوئی خاص نسخہ تو نہیں ہے جو تم استعمال کرتی ہو۔"
"رمشہ تمہاری دادی تو ایسے ایسے نسخے بتاتی ہیں آملہ، سیکا کائی سے بال دھولو تو بال بڑے لمبے اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔" جویریہ رمشہ سے بولی۔
"تم کیا کرتی ہو؟" مائرہ سے رمشہ مخاطب تھی۔
"ارے ہم کیا کرتے ہیں پانی ہی نہیں ہوتا، کھارے پانی سے بال دھوتی ہوں صبح صبح۔ کیا میں کوئی نسخہ استعمال کر سکتی ہوں چائے پینے کی تو فرصت نہیں ہوتی۔" اس نے جلدی سے فائل اٹھا کر کاؤنٹر چھوڑ کر رضوی صاحب کی ٹیبل پر رکھ دی۔
"سر! یہ دیکھ لیجیے گا تمام کام کمپلیٹ ہے۔"
"چلو سب سے اوپر میں تمہاری ہی فائل رکھ لیتا ہوں۔" وہ تھینکس کہہ کر باہر نکل آئی۔
☆......☆
غربت میں گزرنے والی زندگی کی ایک ہی کہانی تھی۔ بوڑھے ماں باپ ان کی آنکھوں کا ایک ہی خواب مائرہ کی شادی تھا اور وہ مائرہ کو ناممکن نظر آتا۔ پسماندہ علاقے میں ایک کوارٹر میں رہنے والی حسین لڑکی کو کون پسند کر سکتا تھا۔
پھر اچانک ایک دن مائرہ کے لیے ایک رشتہ آیا۔ غریب باپ تھا مائرہ بھی جاب کرتی تھی وہ چادر اوڑھ کر گھر سے نکلتی تھی۔ پھر بھی ماں باپ اس بات پر شرمندہ تھے کہ لڑکے کی خواہش ہے کہ وہ خود لڑکی کو دیکھے گا۔ ماں باپ تو راضی ہو گئے لیکن مائرہ کا دل اس لمحے اندر سے ڈوب رہا تھا۔ جب اس نے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور یہ کہتے ہوئے سنا۔
"مجھے بہت شرم آ رہی ہے کہ کوئی غیر مرد میرے سامنے آ کر میری بیٹی کو دیکھے۔ میں گھر سے باہر جا رہا ہوں۔" وہ گھر سے باہر نکل کر چلے گئے۔
دو خواتین کے ساتھ ایک شخص بہت ہینڈسم سا مائرہ کے گھر آیا تھا۔ سب کے درمیان بیٹھے ہوئے شخص نے صرف ایک بار مائرہ کو دیکھا اور پھر رخ پھیر لیا۔ وہ لوگ چلے گئے لیکن جاتے جاتے وہ مائرہ کو پسند کر گئے تھے۔ جب کہ مائرہ کو وہ شخص پسند نہیں آیا۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔ "یہ شخص کیسے میرے گھر آیا۔"
کئی سوالات اس کے ذہن میں تھے ماں باپ دونوں حیران تھے لیکن مائرہ کے ذہن میں اپنے باپ کی آنکھوں کے آنسو تھے جن کی بڑی قیمت تھی۔ اشک بار آنکھوں سے مائرہ نے باپ کے سامنے صاف انکار کر دیا۔
"ابو! اگر میں بدشکل لڑکی ہوتی تو یہ شخص انکار کر کے جاتا۔ آپ خود سوچیے آپ اس ذلت اور رسوائی کو برداشت کرتے۔ آپ یہ برداشت نہ کر سکے کہ کوئی شخص گھر آ کر آپ کی بیٹی کو دیکھے۔ دیکھنے کے بعد انکار کی صورت میں آپ کا دل زخمی ہو جاتا۔ صرف میری خوشی کے لیے آپ مسکرا پڑتے۔" اماں نے بھی اسے بہت سمجھایا مگر اس نے کہا۔
"نہیں اماں! کوئی تو ایسا انسان ہوگا جو مجھے بغیر دیکھے پسند کرے گا اور میرے والد کو اس ذلت سے بچالے گا۔"
☆......☆
پھر کچھ دن بعد اس کا پھر رشتہ آیا اس کے آفس کی ایک سینئر نے اس سے بات کی۔
"باس کو ایک ایسی لڑکی پسند آئی ہے۔ جس کے بال بہت لمبے اور بلیک ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ تمہارے ہاں اپنا رشتہ بھیج دیں۔"
"لیکن میں نے تو باس کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔" مائرہ بولی۔
"باس شادی سے پہلے تم سے ملنا بھی نہیں چاہ

رہے۔"

"کیوں ایسا کیوں، میں تو ایک غریب گھرانے کی لڑکی ہوں۔ باس کو مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔" مائرہ حیرانگی سے بولی۔

"باس نے تم سے ملتی جلتی لڑکی کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ میں باس کی پرسنل سیکریٹری ہوں۔"

"تو میڈم فاطمہ! اس سلسلے میں آپ میرے والدین سے بات کریں جو زندہ ہی اس آس پر ہیں کہ مجھے بیاہ کر وہ مجھے اپنے گھر کا کر دیں۔ شاید اسی لیے انہوں نے مجھے گھر سے باہر آنے کی اجازت دی ہے۔ ورنہ میرے غریب باپ نے دکانوں میں چائے پہنچاتے پہنچاتے اتنی رقم تو جمع کر لی ہے کہ وہ عزت سے رہ سکتے ہیں لیکن ان کے کندھوں پر میرا بوجھ ہے کہ میں کسی طرح اپنے گھر کی ہو جاؤں۔ میں اپنے والدین کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی۔ میں نے اپنی زندگی کا فیصلہ اپنے رب پر چھوڑ دیا ہے۔ میں دو چار دن میں اپنے والدین سے پوچھ کر بتا دوں گی۔" آفس میں سب لوگ حیران تھے کہ مائرہ کو تو باس نے کبھی دیکھا نہیں پھر اتنا بڑا فیصلہ انہوں نے کیسے کر لیا۔

☆......☆

سب کچھ اتنے اچانک ہو گیا کہ مائرہ بھی حیران رہ گئی۔ شادی کے دن جب وہ دلہن بن کر بیٹھی تھی۔ آنے والا شخص وہی شخص تھا جو رشتہ لے کر اس کے گھر آیا تھا جس کو مائرہ نے انکار کر دیا تھا۔ مائرہ دیکھ کر اسے چونک سی گئی۔ یوں لگا جیسے زمین سے پہاڑ سرکنے لگے۔ زمین پر گاڑھے ہوئی میخیں اکھڑ گئی ہیں۔ ہر چیز دھواں دھواں ہو گئی تھی۔ کچھ بھی تو نہ تھا۔ ایک حسین فرنشڈ کمرے میں مائرہ اس کے سامنے موجود تھی۔ بھینی بھینی خوشبو کا حصار اس کے بالوں کی مہک ابرش کے وجود پر اس دن کی طرح چھانے لگی جب مائرہ اپنے گیلے بالوں کو لپیٹتی ہوئی سڑک سے گزر رہی تھی۔

"مائرہ! مجھے غلط نہ سمجھنا۔ مجھے تمہاری خود سے لاپرواہ نیچر نے متاثر کیا تھا کہ تم نہیں جانتیں کہ تمہارے بال کتنے حسین ہیں جو کسی کو بھی اپنا اسیر کر سکتے ہیں لیکن میں جب تمہارے قریب سے گزرا تو ایک بھینی بھینی مہک نے مجھے اپنے حصار میں اس طرح سے لے لیا کہ میں تمہارے گھر تک جا پہنچا۔ تمہارے انکار پر میں دل گرفتہ اور بہت رنجیدہ تھا۔ تب مجھے میری اسسٹنٹ فاطمہ نے بتایا کہ سر! مائرہ بہت خوددار اور عزت دار گھرانے کی لڑکی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ تمہارے بالوں کی خوشبو نے مجھے بہت اٹریکٹ کیا۔"

"ابرش صاحب! میں اس قابل تو نہیں تھی لیکن ہمیں قسمت یہاں تک لے آئی اور میری زندگی کا ایک حصہ اس کا سیکرٹ اور میرا نصیب "لائف بوائے شیمپو" سے جڑا ہوا ہے۔ ورنہ میرے یہ لمبے اور گھنے بال بڑے روکھے اور الجھے الجھے رہتے تھے۔ جب سے میں نے لائف بوائے شیمپو استعمال کیا اس دن سے میری قسمت ہی بدل گئی لیکن ساتھ ہی ایک تکلیف دہ احساس بھی میرے ساتھ رہا ہے۔" ابرش نے اس کا مہندی بھرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"اس تکلیف دہ احساس کو تم کیا میرے ساتھ شیئر کر سکتی ہو؟"

"ابرش صاحب! رمشہ اور جویریہ مجھ سے بہت قریب تھیں وہ مجھ سے بہت ہمدردی کرتی تھیں۔ میرے اجڑے اور روکھے بالوں پر وہ ہنستی تھیں۔ میری غربت انہیں تسکین دیتی تھی لیکن لائف بوائے شیمپو نے میرے بالوں کی حالت بدل دی۔ پر رمشہ اور جویریہ مجھ سے دور ہو گئی ہیں۔"

"مائرہ! ایسا ہی ہونا تھا قسمت میں۔ پر یہ بھی تو دیکھو میں تو تم سے قریب ہو گیا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے۔" مائرہ نے مسکرا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

☆......☆

## افسانہ

# لے جائیں گی دھن بہائیں گی

آج چھوٹی بجو واپس جا رہی تھیں، شائستہ کے اسکول کی چھٹیاں بھی ختم ہوگئی تھیں مگر اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''تاشی تم اپنے اسکول میں درخواست بھجوا



دو''۔ ذین سب سے بڑا اور کھٹا مالٹا چھیلتے ہوئے بولا۔

''کس کے ہاتھ بھجواؤں اور پھر اس کا جو میاں ہے ناں (چھوٹی بجو کا) وہ جا کر جھٹ شکایت لگا آئے گا اسکول میں میری''۔ تاشی کے سو مسئلے تھے۔

''او انصر جا کمرے میں ماں سے میری عینک لے کر آ''۔ سلور کے بڑے سے کٹورے میں چائے پیتے بڑے پھوپھا نے انصر سے کہا جو زین سے آدھے مالٹے پر لڑ رہا تھا اور جانے کی صورت میں وہ ہار جاتا سو ان سنی کر گیا۔

''انصر! میری کوئی گل (بات) سن وی لیا کر، جا عینک لے کر آ''۔ پھوپھا دوبارہ بولے مگر انصر اور زین کی لڑائی اب فائنل مرحلے میں داخل ہو گئی تھی، مالٹے کا کچومر نکل گیا تھا مگر ہار کوئی نہیں مان رہا تھا۔

''اے تو پیچھے ہو جا، اس کے اندر گر جائیں گی''۔ بابا کمرے کے آگے بنے پانی کے گڑھے میں ہاتھ مارتی جیناں سے بولے۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے اور میں ناں کہوں گی کہ میری عینک بھی ٹوٹ گئی ہے''۔ تاشی دھنیے کے پودوں میں سے انصر کی پرانی ٹوٹی ہوئی عینک اٹھا کر بولی۔

''اے تاشی! میرے پاس سفید پٹی پڑی ہے وہ باندھ لے ٹانگ پہ''۔ مدر ٹریسا کے پاس ایسی چیزیں دستیاب ہوتی تھیں۔

''یو منڈا میری کوئی گل نہیں سندا (یہ لڑکا میری کوئی بات نہیں سنتا)''۔ پھوپھا جل بھن کے خود ہی اٹھ گئے، جوتوں سمیت کمرے میں گھس گئے، بڑی پھپھو سے برداشت نہ ہوا، ایکدم ان پر چڑھ دوڑیں۔

''تسی جوتی تے لادو، میں صفائی کر کر ہٹی آں (جوتے تو اتار دو میں نے ابھی صفائی کی ہے)''۔

ایک تو انصر کی نافرمانی اوپر سے عینک نہیں مل رہی تھی پھوپھا کو غصہ آ گیا۔

''یو کوئی مسیت آ جہاں جتیاں لاکر آؤ (یہ کوئی مسجد ہے جہاں جوتیاں اتار کے آؤ''۔ بابا نے کہا۔

''انصر میں سگریٹ لانا بھول گیا، جا اندر مسیت (مسجد) ماں تے میری سگریٹ لے آ''۔ انصر اور زین دونوں بھڑتے ہوئے چارپائی سے نیچے گرے اور جیناں سے ٹکرا گئے، وہ اوندھے منہ غڑاپ سے گندے پانی میں لڑھک گئی۔

''ماما جی، ماما جی''۔ ثوبی چیختا ہوا ایک طرف کو بھاگا۔

''میں کہی وی جا رہا ہوں کہ اندر گر جائیں گی''۔ بابا نے لت پت جیناں کو اٹھایا۔ پچکا ہوا مالٹا انصر اور زین کے ہاتھوں سے نکل کر پانی میں گر گیا۔

''آجا ثوبی میرے پاس''۔ فاطمہ تڑپ اٹھی اسے روتا دیکھ کر۔

''اے آؤ ہم اوپر چلیں''۔ گڈو اور مٹھی اشتہاری مجرموں کی طرح جائے واردات سے بھاگ گئیں۔

''پھوپھا آ گئے''۔ پھاتاں باہر سے کہتی ہوئی آئی اور فاطمہ ایکدم اندر کو بھاگی سفید پٹی لینے۔

☆.........☆.........☆

''خالو جی میں نے درخواست دی ہے، آپ وہ میرے اسکول میں دے دینا، میں صبح بہت زور سے گر گئی ہوں، ٹانگ پر بڑی چوٹ آئی ہے، دیکھیں میری عینک بھی ٹوٹ گئی ہے''۔ تاشی بڑے نپے تلے انداز میں تقریر کر رہی تھی اور چھوٹے

پھوپھا مسکرائے جارہے تھے۔

''سیدھی طرح پڑھ سبق''۔ بابا نے عربی پڑھنے والے لڑکے کی کمر میں ایک ہاتھ جڑتے ہوئے کہا۔

''تاشی! میں مشین لادی آں، اٹھ کے کپڑے دھولے''۔ بڑی پھپھو تاشی کو آواز لگاتے ہوئے بولیں، تاشی گڑبڑا گئی، ادھر اُدھر دیکھا پارٹی کا کوئی بندہ بھی قریب نہیں تھا۔

''اچھا امی!'' وہ بس اتنا ہی بولی، پھر ہاتھ میں پکڑی ٹوٹی عینک کو دیکھا، سفید پٹی بندھی ٹانگ کو اور پھر چھوٹے پھوپھا کے چہرے کو۔

''آلو یہ ہنس کیوں رہا ہے''۔ وہ الجھ گئی۔

''پھپھو! مچھی کھالے (چھوٹی نہیر) میں گر گئی''۔ گڈو گارے اور پانی میں لت پت مچھی کو پکڑ کر اندر لائی، وہ سردی سے ٹھٹھر رہی تھی، حسب عادت منہ کھلا ہوا تھا مگر آواز نہیں تھی، وہ شاید رو رہی تھی۔

''تاشی! اٹھ کر کپڑے دھولے''۔ بڑی پھپھو اس کے سر پر آکر چلائیں، اس نے مدد طلب نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی، فاطمہ کو دیکھا جو ابھی ابھی آئی تھی۔

''امی میں دھولوں گی''۔ وہ ایکدم اٹھی۔

''نہیں تو رہن دے، صبح سے یہ ویلی (فارغ) بیٹھی ہے، یہ دھوئے گی''۔ تاشی بوکھلا گئی۔

''ادھر آتینوں تا میں پوچھاں (پوچھوں) میں کل تینوں نئے کپڑے دیئے تھے اور آج توں گندے وی کر لیتے''۔ بڑی پھپھو دھائیں دھائیں مچھی کو دو ہتھڑوں سے پیٹ رہی تھیں، تاشی کو لگا جیسے کچھ دیر بعد یہ ہی سلوک اس کے ساتھ ہوگا۔

''تو ٹھیک کیوں نئیں پڑھدا''۔ ایک دھکا اور لگا۔

''وے زین اندروں میری دوائی لے کرآ''۔ تاشی فاطمہ کے سہارے اٹھتے ہوئے بولی، واشنگ مشین اندر ہی لگی ہوئی تھی۔

''میرے کول ٹیم نہیں ہے تینوں کٹن کا، تو اتھے چل ہلے تھوڑی دیر بعد تینوں کڈدیاں آں (ابھی میرے پاس تجھے مارنے کا ٹائم نہیں ہے، تو یہاں چل، تو تھوڑی دیر بعد تجھے پوچھتی ہوں''۔ بڑی پھپھو نے کمال فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ تاشی نے باتھ روم میں جاتے ہی ٹانگ سیدھی کر لی، زین اندر سے رضائی لایا اور چارپائی پر بیٹھی لہسن چھیلتی دادی پر ڈال دی، وہ ایکدم بوکھلا گئیں۔

''وے یو کیا آ''۔ سارے لہسن نیچے گر گئے۔

''آپ نے تو کہا تھا اندر سے میری رضائی لے آ''۔ زین اونچا سننے میں ماہر تھا، دادی اپنے بال نوچتی رہ گئیں۔

☆..........☆..........☆

چھوٹی پھپھو چلی گئی تھیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے چاچی ثمینہ نے بتایا تھا کہ صبح ان کے رشتہ دار آرہے ہیں، ان کی بہن، بہنوئی اور بھابی۔ وہ سارے اسی مسئلے کو ڈسکس کرنے کے لئے بابا کے مسکن میں جمع تھے، عاشی اور تاشی صوفے پر اور باقی سب نیچے رضائیوں میں بیٹھے تھے، مونگ پھلیوں کا دور چل رہا تھا۔

''تاشی جب تم بول رہی تھیں تو خالو ہنسے کیوں جا رہے تھے؟'' فاطمہ نے بھی نوٹ کیا تھا۔

''پلان میں گڑبڑ ہو گئی تھی میں انہیں کہے جا رہی تھی کہ میری عینک ٹوٹ گئی اور میری عینک میرے دیدوں پر لگی ہوئی تھی''۔ سب بے ہنگم سے انداز میں ہنس پڑے۔ فاطمہ، پھاتاں اور جیناں کو مونگ پھلیاں چھیل چھیل کر دے رہی تھی جو کمال ہوشیاری سے زین کھائے جا رہا تھا۔

"تم دونوں بہنیں تو بہت ہی تیز کھاتی ہو، وہ چھیلتے چھیلتے ہلکان ہو گئی"۔ انصر نے رضائی کے نیچے سے ہی تاشی کی گود سے ساری مونگ پھلیاں اڑا لیں، اب وہ ہکا بکا اپنی گود دیکھ رہی تھی۔

"یہ مامی کے رشتہ دار کیوں آ رہے ہیں؟" فاطمہ کو کسی کے آنے سے سخت چڑ تھی۔

"ان سے ملنے، عید نہیں ہے آج کل"۔ زین نے سیدھا سا جواب دیا۔

"بہت شوخی اور اونچے دماغ کی ہے عمیرہ"۔ تاشی ثمینہ چاچی کی بھانجی کا نام لے کر بولیں۔

"توبہ تم دونوں بہنیں تو میری بھی کھا لو گی"۔ فاطمہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

"میری ایک بات سن لو، کوئی اس سے زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرے، خاص طور پر تم"۔ تاشی انصر کی طرف اشارہ کر کے بولی تبھی ایک دم لائٹ چلی گئی۔

"میں نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں کمرے کا ایک دروازہ بند ہو جاتا ہے اور دوسرا کھل جاتا ہے اور اس سے بھوت..." فاطمہ نے زین کی کمر میں ایک جڑا۔

"ان کی ساری مونگ پھلیاں تم کھا رہے ہو"۔ بے خیالی میں وہ نیچے سے ہاتھ لے جانے کی بجائے اوپر سے لے گیا تھا۔

"اگر برآمدے والا دروازہ بند ہو جائے اور سڑک والا کھل جائے تو..." تاشی کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ برآمدے والا دروازہ زوردار آواز سے بند ہو گیا، ایک لمحے کو سب چپ کر گئے، انصر نامحسوس انداز سے صوفے کی طرف کو ہو گیا، زین، فاطمہ اور انصر کے بیچ آ گھسا۔

"میرے اوپر نہ چڑھو"۔ اس نے دہائی دی، اچانک سڑک والے دروازے پر ٹھک ٹھک ہوئی، عاشی اور تاشی کی آنکھیں ابل آئیں، لحہ لگا زین کو صوفے پر چڑھنے اور ان دونوں کے بیچ گھسنے میں، جیناں، پھاتاں اور گڈو کے گلے کھینچ گئے۔

"باہر جو بھی چیز ہے وہ اس ڈھول کی آواز سن کر ہی بھاگ جائے گی"۔ انصر کو مذاق سوجھ رہا تھا۔

"اور کیا وہ اس کو دیکھ کر کہے گا سوری باجی، میں غلطی سے آ گیا"۔ زین نے اس کا بھرپور ساتھ دیا، ٹھک ٹھک پھر ہوئی، انصر صوفے کے نیچے گھس گیا، گڈو نے فاطمہ کو روند دیا، کمرے میں ایک ہائے ویلا مچی ہوئی تھی۔

"تاشی، مجھے کچھ عجیب طرح سے نہیں روتی"۔ شانی کو بھی روتی ہوئی نظر بھی آئی۔

"اس کا نام دیکھو چھپی جیسے بچی"۔ انصر ڈر بھگانے کی کوشش کر رہا تھا تبھی ٹھائیں سے کوئی چیز دروازے سے لگی اور سب کی بس ہو گئی، انصر ایکدم صوفے کے نیچے سے اور زین صوفے کے اوپر سے باہر نکلے اور راستے میں آتے بچوں کو روندتے باہر کو بھاگ لئے، گرے ہوئے بچے ابھی اٹھے بھی نہ تھے کہ عاشی اور تاشی کے پیروں تلے آ گئے۔

"اس گڈو کو اپنے ساتھ نہیں بٹھانا آئندہ سے"۔ فاطمہ نے بچوں کو چھوڑ کر بھاگنا گوارا کیا، گڈو کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی، صحن والا دروازہ بند تھا انصر اور زین دونوں اس سے ٹکرا گئے اور پیچھے سے فل اسپیڈ آتیں عاشی اور تاشی ان میں اڑ کر کیاری میں گر گئیں۔

"ہائے کیاری کا بھوت آ گیا"۔ گڈو چلائی۔

"پھاتاں تو کہاں پھنس گئی"۔ فاطمہ پھاتاں کو صوفے کے نیچے سے نکالنے میں ہلکان ہو گئی۔

"جیناں باہر اندھیرا ہونے کی وجہ سے

پلروں میں پھنس گئی تھی، انصر بھوت نے میرے پاؤں پکڑ لئے''۔ تاشی آدھی کیاری کے اندر تھی اور آدھی باہر، ان بچوں کو تو رات کو بھی چین نہیں ہے، ان کی ماؤں کو محفلیں لگانے سے فرصت نہیں ہے ڈرپوک بزدل اولادیں''۔ فاطمہ پھاتاں کو نکال کر باہر آئی تو اپنی جھونک میں پلر سے ٹکرا گئی۔

''ہائے ہائے یہاں کون پھنس گئی' انصر دروازہ تو کھول دو''۔ تاشی چارپائی کے نیچے گھس گئی۔

ایک شورِ عظیم تھا، سارے بچے گیٹ کے پاس ڈھیر ہو گئے۔

''اب سارے بچے گن لو، ایک آدھ کہیں اور نہ پھنسا ہو''۔ فاطمہ کو بھوتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

''گڈو کو چپ کرواؤ سارا شور اس کا ہے''۔ انصر جھنجھلایا۔ حواس باختہ سا دروازہ مخالف سمت میں کھینچے جا رہا تھا مگر گڈو کہیں بھی نہیں تھا، ایکدم دروازہ کھل گیا، تاشی بھوت سمیت کیاری میں ہی رہ گئی، پھاتاں احاطے میں گر گئی، جیناں باہر والی کیاری میں، آگے نکلنے کی کوشش میں عاشی اور زین کھڈے میں گر گئے، شانی گڑھے میں لڑھک گیا، مجھی راستہ بھول کر باتھ روم کی طرف نکل گئی، فاطمہ یہی سوچتی رہ گئی کہ کس کی جان بچائے، جو بندہ دوسرے پورشن میں پہنچا وہ انصر تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایمرجنسی لائٹ میں سب کو ڈھونڈا گیا، بابا سب کو ڈانٹ رہے تھے، تاشی کیاری میں بے ہوش پڑی تھی اور اس کے پاؤں گڈو نے دبوچ رکھے تھے۔

☆.........☆.........☆

چاچی کی بہن، بہنوئی نے ناشتہ آتے ہی مانگ لیا۔

''10 منٹ سفر کر کے آئے ہیں اور کر ایسے رہے ہیں جیسے اجمیر سے آئے ہیں''۔ انصر رات ہی تو ٹونی کے کمرے سے فلم دیکھ کر آیا تھا۔

''آنٹی پلیز! جلدی ناشتہ کروا دیں''۔ عمیرہ بولی تو ان سب کے ایکدم منہ بن گئے۔

''منہ ٹیڑھا کر کے بولنے والے لوگ مجھے زہر لگتے ہیں''۔ عاشی ویسے ہی خطرناک حد تک صاف گو تھی، ماما نے اورنج جوس لا کر سامنے رکھا۔

''یہ تکلف کیوں کیا آنٹی آپ نے، ہم پہلے دادا کی طرف گئے تھے انہوں نے بھی پیپسی لا کر سامنے رکھ دی''۔ تاشی زہرخند ہو گئی۔

''اس کے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم بھی اسے اب بوتل پلائیں''۔ کہتے ہوئے بھول گئی کہ اسی کی خالہ کے کان میں گھس کر بول رہی ہے۔

''فاطمہ کو روٹیاں بنانی آ گئیں؟'' وہ بولی تو فاطمہ اپنا غصہ توے (بڑا توا) پر اتار کر رہ گئی۔

''آنٹی! کبابوں میں مرچیں بہت ہیں''۔ وہ بولی۔

''عاشی نے بنائے ہیں''۔ ثمینہ چچی بول پڑیں۔

''عاشی زیادہ مرچیں کھانے سے بندہ کالا ہو جاتا ہے''۔ وہ عاشی کی نسبتاً گندمی رنگت پر چوٹ کرتی ہوئی بولی، عاشی کو بمشکل زین باہر لے گیا۔

دوپہر تک ان سب کی بس ہو گئی۔ شام کو شائستہ سب بچوں کو ہوم ورک کروانے لگ گئی، انصر اور زین کرکٹ کھیلنے لگ گئے اور عاشی اپنی اسائنمنٹ بنانے لگی۔

''شانی کتاب نکال لے''۔ تاشی کے گھر کنے پر اس نے کتاب تو نکال لی مگر دھیان کھیل کی طرف تھا۔ تاشی اسے سمجھانے لگی، ایکدم گڈو اور پھاتاں لڑتی ہوئیں اس کے اوپر آ گریں۔

''یہ کیا ہو گیا ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو سکون

تھا''۔

''نبیل اور ادریس نلکے سے بالٹی بھر''۔ فاطمہ نے عربی پڑھنے والے بچے سے کہا اور بڑی سی بالٹی لا کر رکھ دی۔

''اس نے میری پنسل لے لی''۔ گڈو نے پھاتاں کو نوچ دیا۔

''بھائی انصر! ڈیڈ بال کروا اسے''۔ شانی پھر کھیل کی طرف لگ گیا۔

''گڈو ٹھہر میں لے کر... ''لیکن پھاتاں تب تک گڈو کے ڈنڈا جڑ چکی تھی۔

''باجی بس کروں''۔ لڑکا بولا۔

''ابھی اور بھر''۔ فاطمہ سنی ان سنی کر کے بولی۔

''پھاتاں ایسے نہیں''۔ لیکن وہ دونوں تاشی کی پہنچ سے دور تھیں۔

''باجی بس کروں''۔

''اور بھر ابھی''۔ شانی سے انصر کا آؤٹ ہونا برداشت نہ ہوا، کتاب چارپائی پر گرا کر بھاگ لیا۔ تاشی کو غصہ آتا نہیں تھا مگر جب آتا تھا تو خاصا کھل کر آتا تھا، اس نے ایکدم ڈنڈا اٹھا لیا۔

''میں آؤٹ کرتا ہوں اسے''۔ وہ زین کو بال کرواتے ہوئے بولا۔

''باجی بس کروں''۔ فاطمہ کی بس ہو گئی، اس نے لڑکے کی کمر میں ایک مکا جڑا، بے چارا لڑکھڑایا، پانی کی بالٹی میں گرا اور بالٹی لڑھک گئی، سارا پانی بہہ گیا، تاشی نے گڈو اور پھاتاں کو دھن کر رکھ دیا، ان کے شور سے تنگ آ کر عاشی اٹھ گئی، تاشی کا رخ اب شانی کی طرف تھا۔

☆.........☆.........☆

وہ سب کمپیوٹر کے آگے بیٹھے ہیری پوٹر (Last Part) دیکھ رہے تھے جب انصر ایکدم اٹھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''پانی پینے''۔ وہ کہتا ہوا باہر آ گیا۔ فریج دوسرے کمرے کے بالکل آگے رکھا تھا، اس نے بوتل نکالی اور منہ سے لگانے ہی لگا تھا کہ اپنا نام سن کر رک گیا، آواز ثمینہ چاچی کی تھی۔

''مگر ابا جی انصر مان جائے گا کیا؟'' وہ بولیں۔

''کیسے نہیں مانے گا، کیا کمی ہے عمیرہ میں''۔ بڑے بابا بولے تھے، انصر کا سانس رک گیا۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ عمیرہ میں کوئی کمی نہیں ہے مگر انصر...''

''تم اس کی فکر نہ کرو، میں بات کروں گا انصر سے''۔ بابا نے انہیں اطمینان دلایا، انصر کی پیاس ایکدم ختم ہو گئی۔

''ابا جی انصر اور عمیرہ کی شادی ہو جائے تو شاہینہ باجی کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے''۔ اس سے زیادہ سننے کی تاب نہیں تھی، وہ اندھوں کی طرح دوڑتا ہوا اندر آیا اور سب کے اوپر سے گزرتا ہوا اپنی جگہ پر گر گیا۔

''پلیز تم لوگ میری مدد کرو''۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔

''کیا ہوا انصر؟'' وہ سب ایک ساتھ بولے۔

انصر نے ساری بات بتا دی پھر امید بھری نظروں سے تاشی کو دیکھا۔

''یہ سب تمہارے دماغ کی خرافات ہے''۔ تاشی کہہ کر اٹھ گئی، اس نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

''توبہ توبہ''۔ وہ استغفار پڑھتی ہوئی اٹھ گئی۔

''خود غرض''۔ انصر کوس کر رہ گیا۔ زین کی طرف اس نے خود ہی نہ دیکھا، وہ تو اتنا خود غرض تھا کہ اپنے مطلب کے بغیر مرتے ہوئے کو پانی نہ پلائے، لے دے کر عاشی رہ گئی۔

''انصر! میں نے پہلے ہی تمہاری مدد کرنے کی بہت سزا بھگت لی''۔ وہ صاف صاف لہجے میں بولی۔

''عاشی! میں مشکل میں ہوں، بے شک میرا دل لڑکی دیکھ کر بے عزت ہونے کو مچل جاتا ہے، عمیرہ، تو بالکل نہیں، ابھی میری عمر ہی کیا ہے''۔ انصر رونے والا ہو گیا۔

''میں کچھ نہیں کر سکتی انصر!'' عاشی کسی طور رضا مند نہیں تھی۔

''تو ٹھیک ہے میں بھی کل بڑی نہر جا کر خودکشی کر لوں گا''۔

''خودکشی حرام موت ہے، اس کی سزا موت کے بعد بھی ملتی ہے''۔ فاطمہ نے اسے لیکچر دے دیا۔

''تو چپ کر مولون''۔ انصر کو تاؤ آ گیا۔

''عاشی! اس بار میری مدد کر دو، آئندہ بے شک نہ کرنا''۔ اس نے پوچھا، بڑی مشکلوں سے اس نے عاشی کو راضی کیا۔

''تم نے ٹھیک سے تو سنا ہے ناں؟'' اس نے پوچھا، انصر نے شدومد سے سر ہلا دیا۔

''پہلے بات کنفرم کرتے ہیں، میں صبح باتوں باتوں میں ثمینہ چاچی سے پوچھتی ہوں کہ عمیرہ کی شادی کس سے کر رہی ہیں وہ لوگ''۔ انصر نے ہاں میں سر ہلا دیا اور صبح موقع پا کر عاشی نے ثمینہ چاچی کو پھانس لیا۔

''یہ عمیرہ کی شادی کب ہو رہی ہے چاچی؟''

''اگلے مہینے''۔ وہ فرش دھو رہی تھیں۔

''اچھا، کس سے؟'' وہ بولی۔

''رشتہ دار ہیں، انصر نام ہے لڑکے کا''۔ عاشی نے انصر پر فاتحہ پڑھ لی۔

''ابا جی آج یا کل بات کریں گے اس سے''۔

''یعنی جو کچھ کرنا تھا وہ آج اور کل میں کرنا تھا''۔ عاشی نے سوچا۔

''عاشی کچھ ایسا ہو کہ وہ خود انکار کر دے، میں صاف بچ جاؤں''۔ عاشی سوچ میں پڑ گئی۔

''انصر! میں پتہ کرتی ہوں اسے کیا پسند ہے اور کیا نہیں، پھر جو اسے ناپسند ہو گا ناں وہ سب برائیاں ہم تمہارے اندر جمع کر دیں گے اور اس کے سامنے یہ سب برائیاں شو کرنا''۔

''اس سے کیا ہو گا؟'' انصر بولا۔

''وہ تم جیسے ناپسندیدہ بندے سے شادی سے انکار کر دے گی''۔ آئیڈیا اچھا تھا، دونوں نے مل کر کام شروع کیا، عمیرہ کی ناپسندیدہ چیزیں سگریٹ، پان، گندے مندے پاپڑ، میٹھے چاول اور کالا رنگ اسے ناپسند تھا، سب سے بڑی چیز فلرٹ سے اسے نفرت تھی، عاشی نے دائن پھروا پھروا کر انصر کا منہ سرخ کر دیا۔

''اس کے سامنے پان کھا کر الٹی نہ کر دینا''۔ اگلے دن ہی گھٹیا قسم کے پان منگوائے گئے، جہاں کہیں عمیرہ نظر آتی، انصر اس کے سامنے جا کر اکٹھے دو تین پان منہ میں رکھ لیتا، اس کا سارا منہ پک گیا، معدہ الگ خراب ہو گیا، عاشی نے خصوصی طور پر اسے میٹھے چاول پکا کر دیئے۔

''لگتا ہے انصر کو میٹھے چاول بہت پسند ہیں''۔ عمیرہ اسے دیکھ کر بولی۔

''اور کیا، ہے ناں انصر''۔ عاشی کا اشارہ پا کر انصر نے چند لقمے اور ٹھونسنے چاہے مگر گنجائش نہیں تھی۔

''عاشی! میں اب ساری زندگی میٹھے چاول نہیں کھاؤں گا''۔ وہ رات کو دہائیاں دے رہا تھا، کالے رنگ کا پرانا سوٹ پان کے رنگوں سے بھر دیا تھا مگر وہ اتار نہیں رہا تھا۔

''انصر کو سیاہ رنگ بہت پسند ہے''۔ عاشی نے عمیرہ کے پوچھنے پر بتایا۔

''عاشی میں سگریٹ کیسے پیوں؟'' انصر پریشان تھا۔

''جیسے بھی پینا، اپنے ابو کی چرالینا''۔

☆.............☆.............☆

آج ان کے پلان کا فائنل سین تھا، عاشی پلر کے پاس کھڑی عمیرہ سے باتیں کر رہی تھی، انصر اپنا موبائل وہیں شیلف پر چھوڑ گیا، اور عاشی کا لے گیا۔ اچانک انصر کا موبائل بجا، عمیرہ قریب تھی اس نے اٹھایا، کسی نرما کی کال تھی، عاشی نے مسکرا کر کاٹ دی۔

''انصر کی نئی دوست ہے، بہت خوبصورت ہے، میں نے دیکھی ہے''۔ عمیرہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ عاشی نے چند سیکنڈ میں اپنا نمبر ردا کے نام سے change کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ردا کی کال آئی۔

''انصر کی پرانی دوست ہے''۔ وہ ہنس دی۔ پھر تو سلسلہ ہی شروع ہو گیا، تھوڑی دیر بعد انصر آ گیا۔ عمیرہ حیران رہ گئی۔ اس کے منہ میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔

''انصر! تمہیں سگریٹ ابھی سے پینا آ گیا''۔

''ہاں تو اس میں کیا مشکل ہے''۔ انصر نے کش لگایا اور بمشکل کھانسی روکی۔

''پتہ ہے ردا اوہ سوری عمیرہ! انصر بس ایسا ہی ہے، لاپرواہ اور فلرٹی سا، اتنی ساری دوستیں ہیں اس کی، پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا، سگریٹ کی اسے لت لگ گئی ہے، یہ تو پان والا نشہ بھی کرنے لگا ہے، ہر وقت کالے کپڑے چڑھائے رکھتا ہے، مجھے لگتا ہے یہ جوا بھی کھیلتا ہے، ہر برائی اس کے اندر ہے، تم اس کی MMS لسٹ دیکھنا ذرا توبہ اتنی گندی ہے، ہر وقت پان کھاتا رہتا ہے، ہر وقت اس کے منہ سے گندی بدبو آتی ہے، اس کے گھر والوں کو بھی نہیں پتہ''۔ عاشی، انصر کے اشاروں سے بے نیاز بولے جارہی تھی، وہ تب رکی جب اس کی گردن پر بڑے بابا کا ہاتھ پڑا اور اس کا گال ماما کے تھپڑ نے رنگ دیا، انصر کو تو پھوپھا اور بڑی پھپھو نے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا تھا۔

☆.............☆.............☆

وہ کب سے اپنے کمرے میں بند تھی، آنسو نکلے آرہے تھے، آج انصر کی وجہ سے اس کی اتنی بے عزتی ہوئی تھی، اچانک اسے بھوک لگی، وہ بمشکل اٹھ کے باہر آئی۔ چاچو والے پورشن میں بہت شور تھا۔

''کون آیا ہے شانی؟'' اس نے پاس سے گزرتے شانی سے پوچھا۔

''انصر بھائی آئے ہیں''۔ وہ ٹھنک گئی۔

''انصر، کون انصر؟'' اچانک اسے تاشی نظر آئی۔

''تاشی کون سا انصر آیا ہے؟''

''عمیرہ والا انصر، جس سے اس کی شادی ہو رہی ہے، تم دونوں تو پاگل ہو، خوامخواہ پریشان ہو گئے، جس سے عمیرہ کی شادی ہو رہی تھی اس کا نام بھی انصر ہے''۔ عاشی کچھ بول نہ سکی، چند لمحوں بعد کوٹھڑی کی طرف بھاگی، جہاں بے تحاشا مار کھائے انصر پڑا تھا، اس نے بہت مار کھائی تھی۔

''انصر! تمہاری شادی تو عمیرہ سے نہیں ہو رہی، وہ تو کوئی اور انصر ہے''۔ انصر کی آنکھیں بے یقین تھیں۔

''سوری عاشی میری وجہ سے تمہیں تھپڑ پڑا''۔ انصر نادم تھا۔

''اوکے مگر آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا''۔ انصر بول نہ سکا، اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ یہ تو وقت بتائے گا۔

☆.............☆.............☆

اسویرہ علی

افسانہ

# تیری چاہت میں

آج تین سال بعد اس نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنی مٹی کی خوشبو کو اپنے وجود میں اتارا۔ وہ یک دم تروتازہ ہو گیا۔ اپنوں سے ملنے کی خواہش نے اس





کے جسم میں توانائی بھر دی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے کو بڑھا۔ اچانک کسی کی یاد نے اس کے بڑھتے قدم جکڑ لیے۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ خوشی سے دمکتا چہرہ، تاریک ہو گیا اور وہ بے جان سا وجود لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆......☆

''دادو، دادو کہاں ہیں آپ جلدی باہر آئیں۔'' وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بھاگتی ہوئی کبھی اُس کمرے میں تو کبھی اِس کمرے میں انہیں ڈھونڈ رہی تھی۔

''کیا آفت پڑی ہے۔ کیوں شور مچا رکھا ہے؟'' وہ اپنے پوتے کے کمرے سے باہر آئیں۔

''آپ یہاں تھیں؟'' فرزین کو حیرت نے آن گھیرا۔

''ہاں! تو کیا یہاں آنا منع ہے؟'' وہ غصے میں آ گئیں۔

''نن...... نہیں دادو! وہ میں نے آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈ لیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ یہاں بھی ہو سکتی ہیں۔'' فرزین گڑبڑا گئی۔

''یہ بھی اس گھر کا حصہ ہے۔'' انہوں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو وہ چپ سی ہو گئی۔

''کیوں ڈھونڈ رہی تھیں؟'' انہوں نے بات بدل دی تو فرزین کو یکدم ہوش آیا اور وہ پھر سے اپنے پہلے والے موڈ میں آ گئی۔

''دادو! جلدی نیچے چلیں آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔'' وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کا جوش و خروش قابل دید تھا۔

''اے لڑکی باؤلی ہو گئی ہے کیا خود بھی گرے گی اور مجھے بھی گرائے گی۔ ارے دم تو لے۔'' وہ اس کی تیزی پر حیران اسے سنائے جا رہی تھیں مگر فرزین نے بھی ان کی ایک نہ سنی اور انہیں ڈائننگ روم میں پہنچا کر ہی دم لیا۔

''آخر ایسا کون آ گیا جو......'' باقی کے الفاظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے۔ سامنے جو نظر ٹھہری تو پلکوں نے جھپکنے سے انکار کر دیا۔ انہیں اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان ہوا۔ وہ لڑکھڑا گئیں۔

''سنبھل کر دادو! یہ میں ہی ہوں۔ آپ کا پوتا۔ آپ کی جان۔'' ایزد نے آگے بڑھ کر انہیں سنبھال لیا اور نزدیکی صوفے پر بٹھایا۔

''ایزد! میرے بچے۔'' ان کے بے آواز لب ہلے۔

''ہاں آپ کا ایزد۔ نہیں رہ پایا آپ لوگوں کے بنا۔ آ گیا ہوں میں واپس ہمیشہ کے لیے۔'' نم آنکھوں کے ساتھ وہ ان کے سینے سے لگ گیا۔ انہوں نے بے اختیار اسے تھام کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر ڈرائنگ روم میں موجود ہر شخص کی آنکھ اشکبار ہو گئیں۔

''اماں! اب بس بھی کر دیں ناں۔ اب تو یہ آ گیا ہے۔'' ثاقب شاہ نے اپنی ماں کے برابر میں بیٹھتے ہوئے انہیں تسلی دی اور ان کے آنسو صاف کیے۔

''ہاں تو تو جیسے مسکرا رہا ہے ناں۔ خود کی آنکھیں بھری پڑی ہیں اور مجھے نصیحت کر رہا ہے۔'' وہ اپنے بیٹے کو ڈپٹتے ہوئے مسکرائیں۔

''پاپا پلیز! اب میں آ گیا ہوں اس لیے کوئی بھی سزا دینی ہے تو ضرور دیں مگر پلیز اب روئے گا کوئی نہیں۔'' اس نے سب پر پیار بھری دھونس جمائی۔

''ارے چوہیا! وہاں کیوں کھڑی ہو؟ اپنے بھائی سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا کیا؟'' اچانک ایزد کی نظر دروازے کے پاس کھڑی فرزین پر پڑی تو وہ بے اختیار بولا۔

''بھائی......!'' وہ بھاگ کے اس کے پاس آئی اور اس کے سینے سے لگ گئی۔

''اب تم رونا شروع مت کر دینا۔'' ایزد نے اس کی روہانسی شکل دیکھی تو پہلے ہی ٹوک دیا۔

"کتنی بڑی ہوگئی ہے۔" وہ دادو سے مخاطب ہوا۔
"جی نہیں میں بالکل ویسی ہی ہوں جیسی تین سال پہلے تھی۔" وہ لفظ "بڑی" پر برا مان گئی تو سب مسکرا دیے۔
"چچا جان اور چچی نظر نہیں آرہے؟" اس نے نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔
"وہ مارکیٹ تک گئے ہیں۔ فون کر کے بتا دیا ہے میں نے۔ بس آتے ہی والے ہوں گے۔" فرزین نے آگاہ کیا۔
"اچھا۔" مختصر سا جواب دے کر وہ متلاشی نظروں سے کسی کو ڈھونڈنے لگا۔
"کسے ڈھونڈ رہے ہو صاحب زادے؟" ثاقب شاہ نے بیٹے کی بے چین نظروں کو بھانپ لیا تھا۔
"کسی کو نہیں پاپا!" وہ سٹپٹا گیا اور چاہ کر بھی اس دشمن جاں کے بارے میں نہ پوچھ سکا۔ فرزین نے بھی اس کی بے چینی محسوس کی۔
"آپ فریش ہو جائیں۔ میں جب تک کھانا ٹیبل پر لگاتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"نہیں کھانے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ ٹائم نہیں ہے کھانے کا تم چائے تیار کرو میں آتا ہوں۔" اس نے گھڑی دیکھی شام کے پانچ بج رہے تھے۔ جہاز میں کھانے کی وجہ سے ابھی پیٹ میں گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے وہ سہولت سے منع کر گیا۔
"بھائی آپ کا کمرہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے آپ چھوڑ کر گئے تھے اور دادو وہاں کی صفائی کرواتی تھیں کے پتا نہیں آپ کب واپس آجائیں۔" فرزین نے اسے آگاہ کیا تو وہ اپنی دادو کی محبت پر نثار ہو گیا اور ان کے گلے سے لگ کر ان کے دل کو سکون پہنچایا۔
"چل جا، اپنے کمرے میں جا کر فریش ہو کر آجا۔" انہوں نے اسے خود سے الگ کر کے اس کا ماتھا چوما تو وہ مسکرا کر اوپر کی منزل پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆

کمرے میں داخل ہوا تو سب کچھ پہلے کی طرح موجود پایا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ وہ سکون و اطمینان محسوس کرتا اپنے بیڈ پر جا گرا اور پرانی یادوں میں محو ہو گیا۔
"کاش...... کے وہ بھی مجھے بالکل ویسی ہی ملے۔ جیسے تین سال پہلے تھی۔ ہنستی، مسکراتی مجھ سے بے پناہ محبت کرتی مگر محبت کے اظہار سے مکرتی، پیار بھری لڑائی کرتی۔ کاش کے جیسے میرے کمرے کی اک اک چیز اپنی جگہ موجود ہے وہ بھی اسی طرح ہو۔" وہ خود سے مخاطب آس و امید کے دریا میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔
"وہ کوئی چیز نہیں ہے مسٹر ایزد! ایک جیتی جاگتی ذی ہوش لڑکی ہے۔ تم کس امید پر اسے حاصل کرنے کا سوچ رہے ہو۔ چھوڑ کر تم اسے گئے تھے وہ نہیں اور اب تک وہ تمہیں کہیں نظر آئی ہے۔ جو تم اس کی تمنا کر بیٹھے ہو۔ کیا معلوم وہ تمہاری دسترس سے بہت دور ہو چکی ہو۔" یہ خیال آتے ہی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔
اسے سانس لینا محال ہونے لگا۔ اسے وحشت نے آن گھیرا وہ کانپ اٹھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ جنونی کیفیت میں کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول بیٹھا تاکہ تازہ ہوا اندر آسکے۔
"ایزد پلیز! اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھیں۔ اب اگر آپ نے اس پلیٹ سے ایک بھی چیز اٹھائی ناں تو میں آپ کا حشر کر دوں گی۔" مصفرہ کچن کی سلیب پر رکھی سلاد کی پلیٹ دوبارہ ڈیکوریٹ کر چکی تھی مگر اس کا تایا زاد ایزد اس میں سے کچھ نہ کچھ اٹھا کر کھا لیتا تھا اور سلاد کی ساری سجاوٹ خراب ہو جاتی تھی۔ تیسری بار ایزد کا ہاتھ پلیٹ تک پہنچتا دیکھ کر مصفرہ چیخ اٹھی۔
"کیا ہے یار! کھانے کے لیے ہی بنائی ہے ناں تو کھانے دو۔ سجاوٹ کا اچار ڈالنا ہے۔"
"ایزد! آپ کو پتا ہے ناں مجھے ہر چیز پرفیکٹ

پسند ہے اور ویسے بھی ظاہری خوب صورتی نہ ہو تو کوئی بھی چیز چاہے اندر سے کتنی اچھی کیوں نہ ہو مجھے پسند نہیں آتی اس لیے مجھے تنگ نہ کریں۔" اپنا بار بار کا پیش کیا گیا فلسفہ اس نے پھر دہرایا۔

"یار! ایک تو تم ہر وقت "مس پرفیکشن" بنی گھومتی رہتی ہو۔ دنیا میں کوئی بھی چیز پرفیکٹ نہیں ہے یہ بات تمہیں سمجھ کب آئے گی؟" وہ جھنجلایا۔

"کبھی نہیں اور نہ میں سمجھنا چاہتی ہوں۔" وہ سلاد کی پلیٹ ہاتھ میں لیے اسے انگوٹھا دکھاتی کچن سے نکل گئی۔

☆......☆

تازہ ہوا میں سانس لینے کے بعد وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر اپنی پیروں پر گئی۔ سیدھے پیر کی آخری دو انگلیاں جو امریکہ میں ہونے والے حادثے کی نذر ہوگئی تھیں اور بری طرح کچلی جانے کے بعد کاٹ دی گئی تھیں۔ اسے حقیقت کا سامنا کرا گئیں۔ وہ مصفرہ سے منگنی کے بعد امریکہ اپنا ایم بی اے کمپلیٹ کرنے گیا تھا مگر ایک کار حادثے میں جب اپنے پیر کی انگلیاں گنوا بیٹھا اور ساتھ ہی ٹانگ میں ہلکا سا نقص پایا تو اسے مصفرہ کی "پرفیکٹ تھیوری" یاد آئی اور پھر اسی وجہ سے اس نے پاکستان میں رابطہ نہ ہونے کے برابر کرلیا۔ صرف پاپا سے بات کرتا وہ بھی ہفتوں بعد اور سب کے بلانے کے باوجود امریکہ سے واپس نہ آیا۔ جب دل نے شدت سے اسے پکارا اس کے بغیر جینا محال ہونے لگا تو وہ بناہ اطلاع کے پاکستان آگیا یہ سوچے بغیر کے شاید اب وہ اس کی منتظر نہ ہو۔

☆......☆

"ایزد بھائی! ممی پاپا آگئے ہیں۔ آپ سے ملنے کو بے چین ہیں اور آپ اپنے کمرے کے ہو کر ہی رہ گئے۔" فرزین نے اس کے کمرے کا دروازہ ناک کیا اور اطلاع دی تو وہ خیالوں کی وادی سے نکل آیا۔

"بس آتا ہوں۔" وہ واش روم کی طرف مڑا اور فرزین واپس نیچے چلی گئی۔ وہ فریش ہو کر نیچے آیا تو وہ دل کی ملکہ سب کے ساتھ موجود تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ نظر تھی کہ پلٹنا بھول گئی تھی۔ مصفرہ نے بھی نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پل بھر کو وہ بھی بت بن گئی مگر فوراً ہی ہوش میں آئی اور اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں یہ سامان کمرے میں رکھ کر آتی ہوں۔" وہ شاپنگ بیگ اٹھا کر سب کے بیچ سے نکل گئی۔

"ارے یار! وہاں کیوں کھڑے ہو۔ اپنے چچا سے نہیں ملو گے کیا۔" عاقب شاہ نے خود سے آگے بڑھ کر اسے گرم جوشی سے گلے لگالیا۔

"چچا جان! کیسے ہیں آپ۔ میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔" وہ شرمسار تھا۔

"چچی جان! پلیز کچھ مت پوچھیے گا۔ نہ کوئی شکوہ کیجیے۔ بس مجھ گناہ گار کو معاف کردیں۔ آپ سب کا مجرم ہوں۔ جانتا ہوں۔ آپ سب کو بہت تکلیف دی ہے۔" اپنی چچی کے وا ہوتے لب دیکھ کر وہ ان سے پہلے خود انہیں پکار بیٹھا اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے التجا کرنے لگا۔ مگر وہ ہنوز خفا ہی رہیں البتہ آنکھوں سے اشک جاری تھے۔

"میری سگی ماں تو اس دنیا میں نہیں ہے۔ بچپن سے آپ کو ہی ماں کہتا اور مانتا آیا ہوں۔ آپ سے ہی دل کی ہر بات کی ہے اور آپ نے کبھی مجھے اس بات کا احساس بھی ہونے نہیں دیا اس لیے یہ بیٹا اپنی ماں سے بہت شرمندہ ہو کر معافی کی درخواست کرتا ہے۔ پلیز معاف کردیں۔" وہ ان کے گھٹنے سے لگا منت کرنے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ سب نے اسے یوں شرمندہ دیکھا تو دل سے معاف کردیا اور سب گلے شکوے بھلا دیے۔

"بھائی یہ کیا؟" فرزین کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

"ہائے میرے بچے! یہ کیا ہوا؟" دادی نے دل پر ہاتھ رکھا تو چچی نے اپنی بے ساختہ چیخ کو روکا۔

"ارے کچھ نہیں ہے یہ وہ بس ایک ایکسیڈنٹ میں...... پاپا کو میں بتا چکا تھا فون پر مگر آپ سب کو بتانے سے منع کیا تھا۔" اس نے مختصر انداز میں پوری کہانی سنا ڈالی۔

"ثاقب تجھے معلوم تھا؟" دادی نے اپنے بڑے بیٹے کو گھورا۔

"جی اماں! اس نے منع کیا تھا اور آپ کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اسی ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اسے چلنے میں بھی تھوڑا مسئلہ ہے۔ میں نے تو آتے ہی دیکھ لیا تھا مگر اتنا محسوس نہیں ہو رہا۔" انہوں نے ایزد کے چپ رہنے کے اشارے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوری بات بتائی۔

"دادی! رونے کی نہیں ہو رہی ہے۔ آپ دیکھیں میں بالکل ٹھیک ہوں اب اور چچی جان پلیز آپ سب لوگ اس طرح سے کریں گے تو میں سمجھوں گا میرے آنے کا ماتم کر رہے ہیں آپ۔ میں کل ہی واپس چلا جاتا ہوں۔" وہ پریشان ہونے لگا۔

"ایزد......" عاقب شاہ نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

"آپ لوگ بھی اب بس کریں۔ بچہ معافی مانگ کر شرمندہ ہو رہا ہے اور آپ لوگ اسے مزید پریشان کر رہے ہیں۔" عاقب شاہ نے سب کو مخاطب کیا اور سمجھایا تو سب افراد حوصلہ کر کے خود کو جذباتی کیفیت سے نکالنے لگے اور اسی دوران ایزد نے بھی اپنی چھوٹی چھوٹی کئی باتوں سے انہیں بہلا لیا۔ اسی وقت فرزین کسی شخص کو ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"ارے کامران میاں! کیا خوب وقت پر آئے ہو۔" عاقب شاہ نے نووارد کو گلے لگا کر ویلکم کیا آنے والا جاذب نظر شخصیت تھا۔ ایزد نے دیکھا سب لوگ اس سے بڑی گرم جوشی سے مل رہے تھے۔ اس نے دادی سے پوچھ ہی لیا کہ آخر یہ ہے کون جسے سب اتنی اہمیت دے رہے ہیں اور وہ اسے جانتا تک نہیں ہے۔

"یہ اپنے عاقب کا داماد ہے۔ دو ماہ پہلے ہی شادی کی ہے عاقب نے اپنی بچی کی ماشاء اللہ بہت اچھا داماد ملا ہے اسے۔" دادی کامران کی تعریفوں کے پل باندھنے جا رہی تھیں۔ ادھر ایزد کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ اسے لگا اس کے جسم سے روح ہی نکل گئی ہو۔ مصفرہ اب کسی اور کی ہو گئی ہے یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ یکدم ہی ساکت ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا ایزد! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" چچی نے اس کا تاریک ہوتا چہرہ دیکھا تو گھبرا گئیں۔ سب لوگوں نے بھی اسی دم اسے دیکھا۔ وہ اپنے پکارے جانے اور سب کے متوجہ ہونے پر چونکا اور ہوش میں آیا۔

"کچھ نہیں۔ شاید تھکن کی وجہ سے آپ کو ایسا لگ رہا ہے اور آپ کیسے ہیں مسٹر کامران۔" وہ دل پر پتھر رکھ کر خود ہی مصافحے کو آگے بڑھا کہ مصفرہ سے اس کی بے پناہ محبت کی خبر وہ کامران کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ اپنے ہر انداز سے اس نے خود کو پرسکون ظاہر کیا اور خود پر گزرنے والی قیامت کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ وہ وہیں سب کے ساتھ بیٹھا گفتگو میں حصہ لیتا رہا۔ کامران کے ساتھ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا یہاں تک کے اسے رخصت کرنے بھی دروازے تک گیا تھا۔ اس نے خود کو کس طرح سنبھالے رکھا تھا یہ وہی جانتا تھا۔ جیسے ہی کامران رخصت ہوا وہ بھی اوپری منزل کی طرف بھاگا۔

"کہاں جا رہے ہو ایزد! واپس آؤ ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" دادی جان نے اسے پکارا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پلٹ آیا۔

"جی کہیے کوئی خاص بات ہے کیا؟" سب بڑوں کو کمرے میں براجمان پا کر وہ پوچھے بنا نہیں رہ سکا۔

"مصفرہ کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟" دادی نے اسے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اصل بات کی طرف فوراً ہی آ گئیں۔

"جی! مم...... میں سمجھا نہیں میرا مطلب ہے اچھا لڑکا ہے کامران۔ اسے خوش رکھے گا۔" اسے وہی سمجھ آیا جو وہ سوچ رہا تھا۔ اس لیے اس نے کامران کے حوالے سے اپنی رائے دی۔

"ہیں...... کامران کا یہاں کیا ذکر۔" چچی نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

"ایک منٹ...... تم اب تک کیا سمجھے ہو۔ میرا مطلب ہے کامران کون ہے تم یہ جانتے ہو کیا؟" ثاقب شاہ نے الجھن بھری آنکھوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا اور جیسے انہیں کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تو وہ فوراً اس سے مخاطب ہوئے۔

"چچا جان کا داماد ہے وہ...... مصفرہ کا شوہر ہے۔ ملا ہوں میں اس سے۔ اچھا لڑکا ہے۔" سب کی استفسار کرتی نگاہوں سے وہ گھبرا کر وضاحت دینے لگا۔

"وہ مصفرہ کا نہیں۔ فرزین کا شوہر ہے بے وقوف لڑکے اور مصفرہ جب تم سے منسوب ہے تو اس کی شادی کسی اور سے کیسے ہوگئی...... بولو۔" ثاقب شاہ نے اسے حقیقت بتائی اور ساتھ اس کی کلاس بھی لے ڈالی مگر اسے تو جیسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔

"پاپا! آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ چچی جان بتائیں ناں پاپا سچ کہہ رہے ہیں؟"

مصفرہ ابھی تک اس کی ہے؟ یہ سن کر اسے لگا کے ہفت اقلیم اسے مل گیا ہو۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو کر ہر ایک سے اس بات کی تصدیق کرنے لگا۔ سب کو اس کی شام والی کیفیت اور بے سکونی کی وجہ سمجھ آئی تھی۔

"وہ فرزین کو لینے آیا تھا لیکن تم اتنے عرصے بعد آئے ہو تو فرزین کو تمہاری وجہ سے نہیں لے کر گیا ورنہ تم جب ہی سمجھ جاتے۔" دادی سمیت سب نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور خوب سنائیں۔

"اچھا بھئی، اب یہ ڈانٹنا بند کریں اسے اور اس سے مصفرہ کے بارے میں پوچھیں کیا جواب ہے تمہارا۔" ثاقب شاہ نے سب چپ کروا دیا تھا اور خود ہی اس سے پوچھنے لگے۔

"پاپا! میں کل بھی تیار تھا۔ میرا جواب آج بھی ہاں میں ہی ہے۔ بس آپ ایک بار مصفرہ سے بھی پوچھ لیں۔" مصفرہ کی "پرفیکٹ تھیوری" کو لے کر وہ بے اعتبار ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا مصفرہ کو ہر چیز مکمل چاہیے ہوتی ہے اور ایزد میں اب امریکہ میں ہونے والے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے عیب موجود تھا اور مصفرہ کی اسی تھیوری کی وجہ سے وہ امریکہ سے پاکستان واپس نہیں آ رہا تھا کہ وہ انکار کر دے گی اور اب بھی اسے اسی بات کا ڈر تھا اور اس کا یہ ڈر دوسرے دن ہی یقین میں بدل گیا۔ جب مصفرہ نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ گھر کے سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اس سے وجہ پوچھ پوچھ کر تھک گئے مگر اس نے نہ وجہ بتائی اور نہ اس کا انکار اقرار میں بدلا۔ البتہ ایزد کو انکار کی وجہ سمجھ آ گئی تھی۔

☆......☆

وہ رات میں لان میں ٹہل رہی تھی۔

آنسو ایک تواتر سے اس کے گال پر بہہ رہے تھے۔ ایزد نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھا تو اس کے پاس چلا آیا۔

"مصفرہ!" بہت آہستہ سے اس نے پکارا مگر وہ پھر بھی بری طرح چونک گئی۔

"پلیز میری بات سن لو۔ پھر بے شک چلی جانا۔ بس پانچ منٹ۔" وہ غصے سے واپس جانے کو مڑی تو وہ اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

"مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔" وہ رخ موڑ گئی۔

"جانتا ہوں ناراض ہو تم اور حق ہے تمہیں۔ میں

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



نے تکلیف بھی تو بہت دی ہے ناں تمہیں۔ دل کو توڑا ہے تمہارے۔ ان آنکھوں کو بہت رلایا ہے۔ جانتا ہوں میں قصور ناقابل معافی ہے۔'' اس تمہید باندھی۔

''مجھے کچھ نہیں سننا میرے راستے سے ہٹیں۔'' وہ ہٹ دھرمی سے چلائی۔

''ہٹ جاؤں گا تمہارے راستے سے۔ بلکہ میں واپس چلا جاؤں گا۔ میں تو بس آخری بار تم سے ملنے آیا تھا۔ تم سے وہ سب کہنے جس پر صرف تمہارا حق ہے اپنے دل کا وہ راز جو میں نے خود سے بھی چھپا کر رکھا تھا۔'' وہ بجھا بجھا سا دل گرفتہ سا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''مصفرہ! میں نے تم سے بہت محبت کی ہے اور کرتا ہوں مگر اس ایکسیڈنٹ کے بعد مجھے لگا کہ میں تمہارے آئیڈیل سے بہت دور ہو گیا ہوں۔ تمہیں ہمیشہ سے پرفیکٹ چیزیں پسند تھیں اور میں......'' مصفرہ نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ چیز نہیں ہیں ایک انسان ہیں اور میں نے انسانوں کے بارے میں کبھی ایسا کچھ نہیں کہا۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ اس بات کا بہانہ بنا کر آپ کو مجھ سے نجات حاصل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔'' وہ تڑپ کر بولی تھی۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تم سے دور صرف تمہاری وجہ سے ہی ہوا تھا تا کہ تم پر کوئی الزام نہ آئے۔ مجھے لگا کے تم مجھے اس حال میں قبول نہیں کرو گی مگر میرا دل دن رات تمہارے نام کی مالا جپتا رہا اور بالآخر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر واپس چلا آیا مگر بے فکر رہو تم پر کوئی زبردستی نہیں کر سکتا۔ ابھی یہ گھر والے تم سے خفا ہیں مگر جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو سب کو لگے گا کے تم نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا اور پھر سب لوگ دوبارہ سے تمہارے اپنے بن جائیں گے۔'' وہ اسے تسلی دینے لگا اور مصفرہ دنگ رہ گئی۔

''جب جانا ہی تھا تو آئے کیوں تھے آپ میرا تماشا دیکھنے۔ یہ دیکھنے آئے تھے کہ پاکستان میں مصفرہ نام کی ایک لڑکی جو اپنے منگیتر کو ٹوٹ کر چاہتی ہے وہ اپنے بکھرے وجود کے ساتھ کیسی لگے گی؟ یہی دیکھنا چاہتے تھے ناں آپ؟ اب دیکھ لیا میرا تماشا ہو گئی آپ کو تسلی۔ مل گئی آپ کے دل کو ٹھنڈک۔'' وہ بلک بلک کر رو دی اور ایزد اس کے محبت کے اقرار پر حیران اسے دیکھے گیا۔

''تم نے مجھے زندگی لوٹا دی ہے مصفرہ! میرا وعدہ ہے میں تمہیں کبھی رونے نہیں دوں گا۔ تمہارا یہ اظہار محبت میرے لیے آب حیات ہے۔'' وہ مصفرہ کو تھام کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

''کیا بکواس ہے یہ میں نے کوئی اقرار نہیں کیا۔'' وہ غصے سے چلائی تو وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ مصفرہ آگ بگولہ ہو گئی۔

''یار! مجھے معلوم ہے۔ تم مر کر بھی اقرار نہ کرو۔ یہ تو بے اختیاری میں بے قراری سے تم نے اپنی محبت کا اقرار کیا ہے جو میری پوری زندگی کے لیے کافی ہے اور اب تم جتنا بھی چیخو چلاؤ کسی پر اثر نہیں ہو گا۔ کیوں کہ تمہیں صرف میرا بننا ہے۔ میں پہلے ہی پاپا سے قاضی کا بندوبست کروانے جا رہا ہوں۔ اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے کی ابتداء میں شادی کی پہلی رات سے ہی شروع کر دوں گا ویسے تمہیں دیکھ کر جاتے کو دل چاہ رہا۔ تمہیں اتنے قریب دیکھ کر بہکنے لگا ہوں۔ دل چاہ رہا ہے کہ......'' وہ اس کے بے حد قریب آیا تو وہ شپٹا کر وہاں سے بھاگ گی۔ غصہ، ناراضی، انکار سب بھول گئی اور ایزد اس کی اتنی تیزی پر دل کھول کر مسکرایا اور اسے پکارا تو وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو چاہت کے اتنے گہرے رنگ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر آسمان پر چمکتا چاند بھی مسکرانے لگا۔

......☆......

روشانے عبدالقیوم بونیری

سلسلے وار ناولٹ

# دیدۂ عبرت نگاہ

''اماں! میں ذرا زبیدہ خالہ کے ہاں چکر لگانے جارہا ہوں' فرحان سے تو ملاقات نہ ہو سکی' اس کے گھر سے خیر خبر مل جائے گی' آخر کو ہم کلاس فیلو رہ چکے ہیں''۔ ماں کے پوچھنے پر اس نے بتایا اور قمیض کی آستین فولڈ کرنے لگا۔



''ٹھیک ہے جاؤ''۔ وہ مطمئن ہو گئیں۔

جاتے جاتے اس کی نگاہ باتیں کرتی فلک پر پڑی اور ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔

''فلک......؟'' اس نے فلک کو آواز دی وہ کھڑی ہو گئی۔

''جی بھائی''۔

''میرے جانے سے پہلے تم نے حرم نامی لڑکی کا ذکر کیا تھا' کون ہے وہ؟'' کچن کی سمت جاتی روبینہ نے مڑ کر حیرت سے بیٹے کو دیکھا تھا۔

''اکبر اور کسی لڑکی کا پوچھے کہیں میں بے ہوش نہ ہو جاؤں''۔ بہنوں نے بھی اپنے سر پھرے بھائی کو حیرت سے دیکھا تھا۔

## قسط نمبر3



''بولو کون ہے وہ؟'' اس نے اچنبھے سے بت کھڑی فلک کو ٹوکا۔
''بیٹا! میں جاؤں گی رشتے کی بات کرنے اگر تمہیں پسند ہو تو رشتہ ڈال دوں گی''۔ انہوں نے کسی سوچ کے تحت بیٹے کو روکنا چاہا۔
''کمال ہے آپ اماں! میں صرف پوچھ رہا ہوں کون سا ابھی جا کر اسے اٹھا لاؤں گا''۔ وہ مخصوص بے باک اور دو ٹوک انداز میں ناگواری سے بولا تاخیر اسے کھٹک رہی تھی اور ماں بہنیں اس کا امتحان لینے کھڑی تھیں سیدھے سادھے پتہ بتا دیتیں' لائبہ اور فلک اس کی بات پر شرم سے کٹ گئی تھیں۔
''بری بات اکبر! بیٹے کسی کی بہن بیٹیوں کے لئے ایسے الفاظ نہیں کہتے''۔ روبینہ نے سمجھایا اس کا یہی خونخوار انداز ہی تو زبان بندی پر اکسا رہا تھا۔
''تو میں نے کیا کیا ہے اک لڑکی کا ہی پوچھا ہے آپ لوگ تو میرا ضبط آزما رہے ہیں''۔ اب کے اس نے روبینہ سے نظر ہٹا کر سر جھکائے کھڑی فلک کو گھورا۔
''بتاتی ہو یا لگاؤں ایک؟'' اس کی بات پر فلک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے روبینہ نے سر پکڑ لیا تھا۔
''حرم! سیماب کی کزن ہے' ان کے ہاں رہتی ہے''۔ اس نے سوں سوں کرتے روتے ہوئے بتایا۔
''نوکرانی ہے' بیچاری بیوہ ہے''۔ زبیدہ خالہ کا جوایک اور اس کا دودھیا ہاتھ سے صفائی کرتی لڑکی میں الجھ جانا' آج یہ گتھی سلجھ گئی تھی۔
''خالہ سے تو میں نمٹ لوں گا''۔ جب سے اس پری کو دیکھا تھا جو اب جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی تھی تب سے اسے ہر لڑکی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی' کیا خبر وہی ہو جس کی تلاش ہے' اس کا دل گواہی دے رہا تھا' کہ ہو نا ہو حرم نامی لڑکی ہی وہ پری ہو گی۔
''اپنی بیٹیوں کو مجھ سے ملنے دیتی ہیں اور حرم کو چھپاتی ہیں مطلب وہ ایک قیمتی ہیرا ہے جیسے چھپا کر رکھا جاتا ہے' کہیں جوہری کی نگاہ نہ پڑ جائے''۔ اس بات کو سوچ کر اس کا دل چاہا قہقہہ لگائے مگر ضبط کر گیا۔
''جانے کب سدھرے گا یہ لڑکا' بڑی بہنوں سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں' رلا دیا بیچاری کو''۔ روبینہ بڑبڑاتے ہوئے فلک کے پاس آئیں اور اسے گلے سے لگا لیا۔ اکبر نے سوچوں سے نکل کر بہن کو روتے دیکھا تو شرمندہ ہو گیا وہ ظالم ہی سہی مگر بہنوں کے معاملے میں اس کا دل پگھل جاتا۔
''سوری فلک بہنا! تم تو جانتی ہو اگر کوئی میری بات کا جواب نہ دے یا کچھ چھپانے کی کوشش کرے تو مجھے کتنا غصہ آ جاتا ہے''۔ اس نے فلک کو بازو کے گھیرے میں لے کر اس کا سر چوما۔
''کوئی بات نہیں''۔ اتنی محبت پر فلک بھی سخت نہ بن سکی۔
''ہونہہ...... پہلے بڑی بہنوں سے بدتمیزی کرتے ہو' رلاتے ہو اور پھر سوری کہہ دیتے ہو' یہ اچھی منطق ہے''۔ روبینہ نے شکایت بھری نظروں سے اپنے خوبرو مضبوط جوان بیٹے کو دیکھا تھا۔
''کون سا دس سال بڑی ہے' ایک سال ہی تو بڑی ہے مجھ سے اور پھر لگتی تو چھوٹی ہی ہے ناں' میرے گھٹنے تک آتی ہے اتنی تو چھوٹی ہے''۔ اس کی بات پر وہ سب ہنسی تھیں جبکہ فلک اپنے چھوٹے قد اور نازک وجود پر کیے گئے چوٹ کی وجہ سے جھینپ گئی تھی۔
''بھائی''۔ اس نے پیر پٹخ کر احتجاج کیا اور اکبر کی گرفت سے نکلنا چاہا۔ اکبر نے دوسرے ہاتھ سے بھی اسے جکڑ لیا۔ لائبہ اور روبینہ بھی ان کی محبت کو مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔

''اچھا اماں میں چلا''۔ وہ ہاتھ ہلاتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

''اکبر بیٹے ایسا ویسا کچھ مت کرنا وہ بہت معصوم ہے''۔ اکبر کو اپنی پشت پر ماں کی لجاجت بھری خوفزدہ سی آواز آئی تھی۔

''جھلی ہے میری ماں بھی میں کون سا اس کی معصومیت چرانے جارہا ہوں' دیکھنا ہی تو ہے کہ وہ واقعی میری والی پری ہے یا نہیں''۔ اس نے پلٹ کر ماں کو جواب دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔

☆☆☆☆

گیٹ سے پرے بڑا سا احاطہ اور پھر صحن تھا دوسری طرف بڑی سی جگہ پھول پودے اگائے گئے تھے اس گھر میں یا تو اشفاق صاحب تھے یا حرم جوان پودوں کا خیال رکھتے تھے۔ حرم نے آج کھانٹ چھانٹ کر کے پائپ لگایا اور سارے پودوں کو پانی دینے لگی' یہ حصہ باہر سے آنے جانے والوں کو دکھائی نہیں دیتا تھا الگ سے آ کر دیکھنے پر یہ خوبصورت ہریالی دیکھنے کو ملتی اس طرح سے اوجھل تھا۔ اکبر بے تکلفی سے کھلے گیٹ سے اندر آیا اور صحن واحاطے سے ہو کر اندرونی دروازے کو ٹھوکر ماری' وہ کھل گیا' لاؤنج میں وہ تینوں ماں بیٹیاں ڈرائی فروٹ کی پلیٹ میں سے کھاتیں صوفے پر مزے سے آڑھی ترچھی بیٹھی پرانی فلم دیکھنے میں مگن تھیں۔ دھڑام کی آواز پر سیدھی ہوئیں اور اکبر کو دیکھ کر حلیے بھی صحیح کر لئے تھے۔

''السلام علیکم اکبر بھائی''۔ سعدیہ اور سیماب نے کھڑے ہو کر منہ پر مسکراہٹ سجاتے سلام کیا۔

''مت کہو مجھے بھائی! بہنیں تم جیسی نہیں ہوتیں''۔ وہ ڈپٹ کر تیزی سے بولا۔

''کیا ہوا اکبر بیٹے! اتنے برہم کیوں ہو''۔ زبیدہ نے دل میں خوف محسوس کیا تھا مگر لجاجت سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

''مت کہیں مجھے بیٹا' آپ مجھے فرحان کی طرح اپنا بیٹا سمجھتی ہی نہیں خالہ! وگرنہ مجھ سے جھوٹ نہ بولتیں''۔ وہ ان کے قریب آ کر ناگواری سے بولا تھا۔

''کیسا جھوٹ؟'' ان کی آواز سرسراتی سی تھی۔

''کہاں ہے آپ کی وہ بیوہ بیچاری نوکرانی؟'' اکبر نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔ وہ نظریں چرا گئیں۔

''آپ جانتی ہیں میرا اصول' پہلی بات اور دوسری گولی''۔ اس نے خوفزدہ کھڑی زبیدہ پر نظریں گاڑھے پستول نکالی تھی۔

''میں ایک کے بعد دوسری بات نہیں کرتا' ڈائریکٹ گولی چلاتا ہوں۔ خاموش رہنے والے کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیتا ہوں''۔ اس نے پستول پر پھونک مارتے نادیدہ دھول کو اڑانا چاہا اور باری باری تینوں خوفزدہ خواتین کو دیکھا تھا۔

''جو مرنا نہیں چاہتی وہ جلدی سے بتادے کہ حرم کہاں ہے؟'' اس کی سرد بات پر زبیدہ کا دل اتھاہ میں اترا تھا۔

''روبینہ میں تمہیں ایسی عورت نہیں سمجھتی تھی کم از کم یتیم بچی کا ہی سوچ لیتیں اگر اپنی بیٹیوں کا خوف نہ تھا تو...... اللہ کرے تمہارے آگے آئے' برباد ہو جاؤ تم' یہ طوفان میرے گھر کی سمت موڑ کر تم نے اچھا نہیں کیا''۔ وہ قسمت کے لکھے اور اللہ کے فیصلے کو روبینہ کی کارسائی سمجھ رہی تھیں۔

''تم تو مجھے بالکل فرحان کی طرح اپنا سگا بھائی سمجھتی ہو' بولو بھائی کی مشکل آسان نہیں کرو گی کیا؟'' وہ دو قدم چل کر سیماب کے پاس آیا اور جھک کر اس کی خوفزدہ آنکھوں میں دیکھا۔

''وہ...... وہ...... حرم باہر ہے...... پودوں کے پاس''۔ وہ بمشکل خوف سے کانپتی بولی تھی۔

"گڈ گرل! اب لگی ہو نا تم بہن جیتی رہو"۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر وہ مسکرایا تھا۔ وہ باہر آیا تو مطلوبہ جگہ سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا کیونکہ حرم کی پشت تھی اور وہ مگن سے انداز میں پودوں کو پانی دے رہی تھی۔

"اے لڑکی! ادھر دیکھو"۔ وہ ہنوز فاصلے پر کھڑی اونچی آواز سے بولا' حرم اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

"یہ آواز تو......" اس سے آگے اس کی سوچ مفلوج ہوگئی۔

"نہیں نہیں...... میرا وہم ہوگا' بھلا وہ مجھے کیوں آواز دینے لگا وہ بھی گھر کے اندر"۔ اس نے دل کو تسلی دینا چاہی۔

"پلٹ کر دیکھو...... ورنہ مجبوراً مجھے اپنا طریقہ آزمانا ہوگا"۔ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اس کے حرکت کرتے ہاتھ ساکت ہوگئے آنکھیں خوف کی زیادتی سے پھیل گئیں' پائپ چھوٹ کر نیچے قدموں میں جاگرا۔

"تو نہیں دیکھو گی"۔ اسے ساکت کھڑا دیکھ کر اس نے خود کلامی کی اور پستول اوپر کر کے ٹریگر دبا دیا اک خوفناک سی آواز نے سکوت کو توڑا تھا' حرم لہرا کر زمین پر آرہی' اب رخ سامنے تھا' وہ بے ہوش پڑی لڑکی' وہی پری تھی' جسے وہ دن رات سوچتا اور ہر چہرے میں تلاشتا تھا' مسکرا کر اس نے پستول واپس رکھی اور باہر کی سمت قدم بڑھا دیئے۔ زبیدہ گرتی پڑتی باہر آئی تھیں گولی کی آواز سن کر سعدیہ اور سیماب بھی خوفزدہ سی باہر کی سمت بھاگی آئیں۔

"ہائے کوئی آکر دیکھے تو سہی' جلاد نے کہیں اس معصوم پر گولی تو نہیں چلا دی' دیکھو نبض چل رہی ہے یا مر گئی بدنصیب"۔ زمین پر گری' ہوش و حواس سے بیگانہ پڑی حرم کو دیکھ کر وہ سینہ پیٹتے ہوئے دہائی دینے لگیں۔

"امی...... مجھے تو کوئی زخم نظر نہیں آرہا' خون بھی نہیں ہے' لگتا ہے خوف سے بے ہوش ہوگئی ہے یہ"۔ سعدیہ نے اعصاب پر قابو پاتے حرم کا جائزہ لیا تھا۔ جبکہ سیماب ماں کے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپتی رو رہی تھی۔

"اس دن کو رو رہی تھی' ہائے کتنا منع کیا تم لوگوں کو' مگر تم ماں کی سنتی تب نا' کیسے اکبر بھائی' اکبر بھائی کرتے اس کے گرد منڈلاتی تھیں' منع بھی کیا کہ زیادہ سر نہ چڑھاؤ' بدمعاش کو' نتیجہ دیکھ لیا' بغیر دستک دیئے اندر چلا آتا ہے' عورتوں کی عزت یا لحاظ کا اس کے ہاں کوئی رواج نہیں' جو اولاد ماں کی نہیں سنتی وہ ایسے ہی پچھتاتی ہے' سر پکڑ کر روتی ہے"۔ انہوں نے بیٹیوں کو گھورا آج انہوں نے تڑخ کر کرارا جواب نہیں دیا خاموشی سے سنتی رہیں۔

"آؤ...... اندر لے چلیں اس کو' کیسے پیلی پڑ گئی ہے"۔ زبیدہ نے حرم کے پاس آکر دیکھتے بیٹیوں کو مخاطب کیا تھا' وہ دونوں سعادت مندی سے آگے آئیں تھیں۔

☆☆☆☆

"اماں مل گئی تمہاری بہو' شادی کی تیاری شروع کردو' حرم ہی وہ لڑکی ہے۔ جس نے تمہارے بیٹے کا دل چرا لیا ہے"۔ گھر میں داخل ہو کر صحن میں موجود روبینہ کو دیکھ کر وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"فلک کہاں ہو میری پیاری بہن' تم نے تو وہ کام کر دیا جو تمہارا بھائی بھی نہ کرسکا' تم نے مجھے بہت خوشی دی ہے' مانگو آج کیا مانگتی ہو' ہر چیز دینے کو تیار ہوں"۔ وہ شور مچاتا آگے کمرے کی سمت بڑھنے لگا۔

"تم وہاں گئے تھے؟" روبینہ کا دل خوف سے کانپ اٹھا۔

"ہاں اماں! ایسا گیا کہ دل وہیں چھوڑ آیا"۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر ماں کی سمت پلٹ کر پلکیں موندتا مزے سے بولا۔

"تم نے حرم کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟ کچھ کہا تو نہیں اس سے؟" وہ دو قدم آگے آئیں۔ زیادہ تو کچھ نہیں کہا' بس ایک فائر کیا تھا' میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی' شاید مجھ سے شرما رہی تھی' مگر میں نے بھی اسے اپنا چہرہ دکھانے پر مجبور کر دیا' آخر کب تک اسے تلاش کرتا"۔ اس کے چہرے پر کچھ پا لینے کی مخصوص چمک تھی۔

''الٰہی خیر! کہیں زخمی تو نہیں کردیا بچی کو؟'' روبینہ تو لفظ فائر پر اٹک گئیں تھی دہل کر بولیں۔
''نہیں...... بے ہوش ضرور کردیا' جا کر اپنی بہو کی خیریت ضرور دریافت کر لیجئے گا' بعد میں گلہ کرے گی کہ اکبر نے آپ کو بتایا ہی نہیں''۔ وہ مسکرا کر کہتے پلٹ کر اندر گیا تھا۔
''اللہ...... کیا کروں اس لڑکے کا' کسی بات کی پرواہ ہی نہیں''۔ روبینہ بے دم سی تخت پر بیٹھی تھیں۔ فلک نے چوٹی گوندھ کر پشت پر گرائی اور دوپٹہ سر پر اوڑھتی کنگھی کو اپنی جگہ پر رکھ کر پلٹی تھی۔
''فلک...... میری پیاری بہن' تمہاری وجہ سے مجھے آج میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی نصیب ہوئی ہے''۔ وہ بولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور فلک کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر کسی بچے کی طرح گول گول گھما ڈالا۔
''ارے...... بھائی...... چھوڑیں...... گر جاؤں گی...... اکبر بھائی اتاریں نیچے''۔ وہ چلاتی رہی مزاحمت کرتی رہی' مگر وہ تو اپنی ہی خوشی میں مست پر جوش ہو رہا تھا۔
''اتاریں پلیز اکبر بھائی''۔ اس نے ہنستے ہوئے خوفزدہ ہو کر کہا تھا۔
''لو اتار دیا' آج تو تمہاری ہر بات ماننے کو جی چاہتا ہے''۔ اس نے فلک کو دھپ سے نرم بستر پر گرا دیا۔
''بولو...... کیا مانگتی ہو' آج جان بھی مانگو گی تو دے دوں گا''۔ اس نے فلک کی چوٹی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔
''بھائی...... خدا نہ کرے''۔ وہ دہل کر چیخی۔ شور سن کر لائبہ بھی ہاتھ پونچھتی اندر آئی تھی۔
''فلک' لائبہ' اماں سے کہہ دو' تم لوگ بھی سن لو' حرم تم لوگوں کی بھابی بن کر جلد ہی ہمارے گھر آ جائے گی' تم سب تیاریاں شروع کر دو''۔ اکبر نے خوشی خوشی بتایا تھا' دونوں بہت خوش ہوئیں تھیں کہاں تو اکبر شادی کا نام سننا تک پسند نہیں کرتا تھا اور آج خود اپنے منہ سے اپنی شادی کی خبر سنا رہا تھا۔
''خوش ہو تم دونوں؟'' اکبر نے کسی خیال کے تحت دونوں بہنوں کو دیکھا۔
''بہت زیادہ''۔ دونوں مسکرائی تھیں۔
''ہمیشہ یونہی خوش رہنا''۔ اکبر نے دونوں کو بازوؤں کے حصار میں لے کر اپنے ساتھ لگایا تھا۔ دلہن بنی حرم نے تصور میں آ کر منظر مکمل کر دیا تھا۔

☆☆☆☆

''کس منہ سے آئی ہو یہاں' ذرا خوف خدا نہیں تمہیں' اب کیا لینے آئی ہو' جو تم نے کرنا تھا کر لیا' اب ہمارا تماشہ دیکھنے آنے کی کیا ضرورت تھی' چلی جاؤ' میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی' ایک شریف عورت سمجھتی تھی میں تمہیں' مگر تم تو بہت ہی گھٹیا نکلیں''۔ زبیدہ نے روبینہ کو اپنے گھر دیکھا تو جو منہ میں آیا بلا جھجک بول دیا۔
''تمہارا غصہ بجا ہے دھکے دے کر بھی نکالو گی تو برا نہیں مناؤں گی' برا بھلا کہہ لو' مگر خدارا یہ مت کہو کہ میں کچھ جانتی تھی یا اکبر کو میں نے یہاں بھیجا تھا' میں کچھ نہیں جانتی بلکہ ابھی گھر آ کر اس نے جو کچھ بتایا میرا دل دہل گیا' حرم مجھے اپنی بیٹیوں سے زیادہ پیاری ہے کیونکہ اس کی ماں نہیں' میں بھی اس کے لئے برا نہیں سوچ سکتی' اکبر اپنی مرضی کا مالک ہے' میری یا اپنے باپ کی کب سنتا ہے جو اثر لے' اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں' بہت شرمندہ ہوں تم سے اور حرم سے''۔ روبینہ کے مناسب الفاظ اور پر اثر انداز نے زبیدہ کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔
''جو بھی ہوا اکبر نے آج بہت بدتمیزی کی ہے' میرا ابھی لحاظ نہیں کیا''۔ وہ ہنوز خفا تھیں۔
''میں شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی' اولاد جوان ہو جائے تو اپنی مرضی کرتی ہے' بوڑھے والدین کا لحاظ بھی بھول جاتی ہے' میری مجبوری کو سمجھو''۔ وہ بیچارگی اور ندامت سے بولیں۔ زبیدہ خاموش رہی۔

"میں...... حرم بیٹی سے...... مل سکتی ہوں؟" بہت ڈرتے جھجکتے انہوں نے پوچھا تھا۔
"نہیں...... جان چھوڑ دو تم ماں بیٹا اس بیچاری کی، پہلے ہی خوفزدہ ہے تمہیں دیکھ کر مزید ہو جائے گی، جان لے کر باز آؤ گے کیا اس بدنصیب کی"۔ وہ طیش میں آ کر ہاتھ جوڑتے بولیں۔
"اچھا میں چلتی ہوں، ہو سکے تو معاف کر دینا"۔ روبینہ چادر سنبھالتی شرمندہ شرمندہ سی چلی گئیں۔
"ویسے پرسنالٹی غضب کی ہے نین نقش بھی لاجواب ہے اور دبنگ انداز اور دوٹوک بات کرنا تو دل چرا لیتا ہے، کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں اکبر جنگجو، اگر ڈر نہ لگتا ناں تو قسم سے کسی کا نہ ہونے دیتی اسے"۔ زبیدہ سعدیہ سے کچھ کہنے آئی تھیں مگر اس کی بات سن کر دروازے ہی میں رک گئیں۔
"کہیں محبت تو نہیں ہو گئی اکبر بھائی سے؟" سیماب کی مسکراتی شرارت بھری آواز ابھری۔ زبیدہ کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔
"ہو بھی جاتی اگر جو اس میں تھوڑی لچک ہوتی، ہر وقت انگارے چباتا ہے، مجھے ایسے نڈر لوگ بلکہ مرد، بہت اچھے لگتے ہیں، جو زبردستی اپنی منواتے ہیں، دیکھا نہیں تھا تم نے، کیسے دھڑلے سے آ کر حرم کا پوچھ رہا تھا، کسی کا خوف یا کسی کا لحاظ کیے بغیر، وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا کے مانند، کسی فاتح بہادر جرنیل کی طرح"۔ سعدیہ بہت ہی متاثر ہوئی تھی، خواب ناک لہجے میں بولی اب بہت ہو گیا تھا زبیدہ میں مزید گوہر افشانیاں سننے کی تاب نہیں تھی۔
"اتنی ہی متاثر ہو اکبر سے، کہو تو شادی کروا دیتی ہوں تمہاری"۔ وہ کمرے میں آ کر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر بولیں۔
اک پل کو دونوں اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر سیدھی ہوئی تھیں مگر پھر سے ہمیشہ والا لاپرواہ انداز عود کر آیا۔
"میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی، توبہ! اس بدمعاش سے کوئی پاگل ہی شادی کرے گا، صبح شام تو وہ نمک مرچ کم ہونے پر گولیاں چلا چلا کر بیوی کو خوف سے ہی مار دے گا، بات تو کرتا نہیں وہ غنڈہ، ہر وقت انگلی ٹریگر پر ٹکی رہتی ہے"۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"امی"۔ سیماب کی پھنسی پھنسی خوفزدہ سی آواز نے دونوں ماں بیٹی کو متوجہ کیا تھا۔
"کیا ہوا، تم کیوں ہونق بن گئیں؟" زبیدہ نے بیٹی کو گھور کر دیکھا۔
"وہ...... اکبر بھائی"۔ اس نے خوفزدہ سے انداز میں دروازے کی سمت اشارہ کیا تھا۔ زبیدہ اور سعدیہ کی سانسیں تک خوف سے بند ہو چکی تھیں، موت چاروں طرف رقص کرتی دکھائی دینے لگی بہ یک وقت دونوں نے مڑ کر دروازے کی سمت دیکھا تھا۔
سیماب ان دونوں کو ساکت اور خوفزدہ دیکھ کر قہقہہ لگا کر تالیاں بجانے لگی۔ دروازہ خالی تھا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔
"دیکھا کیسے غنڈہ بدمعاش کہہ رہی تھی، اب کہاں گئی ساری تیزی"۔ وہ ہنستے ہنستے دہری ہو گئی۔
"تمہاری تو میں ابھی ساری مستی نکالتی ہوں"۔ سعدیہ کو اپنی طرف لپکتے دیکھ کر سیماب نے چھلانگ لگائی اور ماں کے پیچھے آ گئی تھی۔
"بدتمیز"۔ زبیدہ نے بھی خوف کم ہونے پر سیماب کو سانس خارج کرتے مسکرا کر چپت لگائی تھی۔

☆☆☆☆

"چچی ابھی تک آئیں کیوں نہیں؟" حرم اسٹاف روم میں بیٹھی زبیدہ کا انتظار کر رہی تھی (وہ اب گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی مگر زبیدہ نے زبردستی اپنے ساتھ اکیڈمی لے جاتے سمجھایا تھا۔
"آج تمہاری سیلری ملنے والی ہے وہ بھی لے لینا اور وہاں کہہ دینا کہ اپنے لئے کسی اور ٹیوٹر کا بندوبست

کرلیں اگر پوچھیں تو کہنا ایمرجنسی میں چھوڑنا پڑ رہا ہے' ڈرنا مت واپسی میں لینے آ جاؤں گی''۔ پندرہ منٹ گزر گئے' وہ ڈری سی بیٹھی تھی کہ چپراسی نے آ کر بتایا۔

''آپ کے گھر سے فون تھا سر کہہ رہے ہیں آپ خود چلی جائیں' آپ کی چچی کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے لینے نہیں آ رہے''۔ وہ پیغام دے کر چلا گیا مگر حرم کی جان پر بن گئی۔ آہستہ آہستہ پورا اسٹاف روم خالی ہو گیا' آخر وہ کب تک بیٹھی رہتی ہمت کر کے اٹھی تھی۔

''میں تو بس تیری چاہت میں' چاہوں رہنا سدا......

میں تو بس تیری قربت میں' چاہوں رہنا سدا

سایہ بھی تیرا میں' ہونے ناں دوں جدا.......

میں نے طے کرلیا!!!

سو فیصد اکبر کی ٹھنڈی سنجیدہ آواز تھی جیسے دوٹوک وہ بات کرتا تھا اس طرح راحت فتح علی کا یہ گیت بھی گا رہا تھا' حرم کو سیدھا چلنا تھا اور پھر بائیں ہاتھ کی گلی کی طرف مڑنا تھا' جہاں اکبر چبوترے پر بیٹھا بلا جھجک اور لاپرواہ سے انداز میں اسے نظروں کی گرفت میں لئے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا وہیں سے اسے مڑ کر بائیں طرف مڑنا تھا۔ وہ اسے آواز کی حد تک جانتی تھی دیکھا نہیں تھا مگر گانے کے یہ بول سن کر اس نے رفتار تیز کی تھی ٹانگیں یوں کانپ رہی تھیں گویا ابھی گر پڑے گی' دوپہر کا مخصوص سناٹا چھایا تھا' گلی کا بچہ بھی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خوف سے اس کا دل بند ہو رہا تھا۔

''اے گلاب کی کلی' رکو' قسم سے کل تو تم نے میرا دل خوش کر دیا' بڑی استاد نکلیں' میں تو تمہیں بہت معصوم سمجھتا تھا کیسے اپنی جھلک دکھلا کر چھپ جاتی تھیں آخر ڈھونڈ ہی لیا میں نے' کل اپنی پری کو تمہارے روپ میں دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا تھا میں...... بہت شکریہ تمہارا میری پیاری حرم''۔ وہ اس کی نظروں کے سامنے سے گزر کر بائیں طرف مڑی تھی اپنی پشت پر اس کی تیز آواز میں کہے گئے الفاظ سن کر وہ شرم سے زمین میں گڑ گئی تھی۔

''کل تو تم نے میرا دل خوش کر دیا تھا' میری پیاری حرم!!! اس کی سماعتوں سے یہ جملے چمٹ گئے تھے' زار و قطار روتے وہ خوفزدہ سی بھاگنے لگی۔

''ایک تو یہ پگلی شرماتی بہت ہے''۔ اس نے حرم پر نظریں جمائے اک ہاتھ کو جھٹکا تھا۔

بھاگ کر گھر آئی تو اندرونی دروازہ لاک کر کے وہ روتے ہوئے فائل اور پرس زمین پر گراتی لاؤنج میں سر کو باندھے بیزاری بیٹھیں زبیدہ سے جا کر لپٹی تھی۔ وہ سر درد سے بے حال تھیں اس اچانک افتاد پر بوکھلا گئیں۔

''الٰہی خیر...... کیا ہو گیا؟'' وہ جھنجلائیں۔

''وہ بہت بے شرم اور بدتمیز شخص ہے چچی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے' آخر وہ کیوں مجھے تنگ کر رہا ہے' میں نے تو کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی' کس بات کا بدلہ لے رہا ہے؟'' وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

''کون اکبر......؟'' وہ سن ہوتے دماغ سے ٹھہرے لہجے میں بولیں۔

''مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے چچی! وہ بہت خطرناک شخص ہے''۔ حرم کا خوف اور رونا کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہوتا' تم فکر مت کرو''۔ اس کو تسلی دیتے خود وہ اندر سے بے تحاشہ خوفزدہ تھیں۔

''چچی! میں مر جاؤں گی''۔ وہ ان کی قمیص کو ہاتھ میں بھینچ کر ایسے دل دوز انداز میں بولیں کہ زبیدہ کا کلیجہ شق ہو گیا۔

''کچھ نہیں ہوتا' حوصلہ مت ہارو' اللہ سے اچھی امید رکھو''۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نم لہجے میں بولیں۔

ان کے ہاتھ نے حرم کو کیا چھوا گویا بھٹی میں ہاتھ دے دیا ہو۔
"حرم! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے میری بچی' تم جا کر آرام کرو' اور کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے"۔ وہ حرم کی حالت دیکھ کر پگھل گئیں۔ اسے خود سہارا دے کر کمرے میں لائیں اور پلنگ پر لٹا کر چادر اوڑھائی تھی۔
"کیا ہوا اسے؟" سعید صاحب کو تشویش ہوئی۔
"کچھ نہیں بھائی صاحب وہ بس تھوڑی سی حرارت ہے' آرام کرے گی تو ٹھیک ہو جائے گی"۔ ان کو تسلی دے کر وہ باہر چلی گئیں' وہ کچن میں پانی پی رہی تھیں کہ اندرونی دروازہ بری طرح سے بجنے لگا۔
"سیماب بیٹے! جا کر دیکھو کون ہے دروازہ توڑے گا کیا' آج کل کے لوگوں میں ذرا جو صبر ہو"۔ انہوں نے وہیں سے آواز دی۔
"کیا مصیبت ہے"۔ وہ منہ بناتے چپل اڑس کر دوپٹہ گلے میں لٹکاتی اٹھی تھی' ڈرامہ دلچسپی کے موڑ پر آیا تو اٹھنا پڑا تھا غصہ تو آنا ہی تھا۔
"دن دھاڑے دروازہ بند کرنے کی کیا ضرورت تھی"۔ وہ کوفت سے دروازہ کھولتے بڑبڑائی۔ دروازے کا لاک کیا کھولا کہ کسی نے دروازہ ہاتھ سے دھکیلا وہ پیچھے نہ ہوتی تو ضرور چوٹ لگ جاتی۔
"اکبر بھائی"۔ وہ حواس باختہ سی دل پر ہاتھ رکھے بولی تھی مگر اکبر کو تو اتنی جلدی تھی بغیر ادھر ادھر دیکھے کمروں میں جھانکنے لگا۔ سیماب خوف کی وجہ سے کچھ کہہ بھی نہ پا رہی تھی بس خاموشی سے اس کی کارروائی ملاحظہ کر رہی تھی۔
"کون ہے سیماب سو گئی ہو کیا؟" وہ جھنجلا کر کہتے کچن سے نکلیں اور بیٹی کو دیکھا' کچھ غلط ہونے کا احساس کر کے انہوں نے دھڑکتے دل سے سیماب کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا' اکبر اب ان دونوں بہنوں کے مشترکہ کمرے میں دروازہ کھول کر جھانکنے لگا۔ اندر بغیر دوپٹے کے بستر پر دراز سعدیہ پیر ہلاتی گانا سن رہی تھی اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر سیدھی ہوئی اور جھٹ سے دوپٹہ اپنے گرد لپیٹا تھا' اب ایک ہی کمرہ رہ گیا تھا کونے والا وہ اس کی سمت بڑھا۔
"اکبر بیٹے! یہ کیا طریقہ ہے اس طرح کسی کے گھروں میں نہیں جھانکتے یہ شریفوں کا گھر ہے"۔ وہ خوفزدہ بھی تھیں مگر ساری زندگی عزت سے گزاری تھی' یوں غلط بات پر خاموش بھی نہیں رہ سکتی تھیں۔
"آپ لوگ شریف اور خاندانی لوگ ہیں تو کیا میں بے عزت بے خاندان ہوں؟ آسمان سے ٹپکا تھا یا سمندر نے اگلا تھا' عجیب بات کرتی ہیں خالہ میرے ماں باپ بھی خاندانی شریف لوگ ہیں' میں بدمعاش ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ میرے منہ پر مجھے بے عزت کریں"۔ وہ پلٹ کر زبیدہ کو گھورتا حتی الامکان سکون سے مگر دوٹوک لہجے میں بدلحاظی سے بولا۔ وہ چپ رہ گئی تھیں۔
"اکبر حرم اور سعید صاحب کے مشترکہ کمرے کی سمت بڑھا تھا' ماں بیٹیوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا' سعید صاحب کی آنکھیں بند تھیں سو نہیں رہے تھے' حرم بخار کی وجہ سے چادر میں چھپی غنودگی میں تھی' اکبر نے بلا جھجک دروازہ کھولا' اندر داخل ہوا اور سیدھا حرم کے سر پر پہنچا تھا۔
"اٹھو' کتنی بری بات ہے تمہارا ہونے والا شوہر آیا ہے اور تم سر منہ لپیٹے سو رہی ہو' شاباش اٹھو' چائے بناؤ' کچھ خاطر مدارات کرو"۔ وہ بے تکلف بولتا آگے ہوا اور حرم کے سرہانے سے دو انگلیوں میں چادر کو تھام کر اپنی طرف کھینچا تھا' شور پر حرم کی آنکھیں کھل گئیں اس پر سے چادر ہٹی ہوئی تھی اور اکبر سامنے کھڑا اسے محبت پاش نظروں

سے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔اس کی قوت گویائی اور حرکت کرنے کی قوت اچانک دھچکے کی وجہ سے بالکل شاکی تھی۔ آنکھیں خوف اور حیرت کی زیادتی سے پھٹ پڑی تھیں۔

''تم لوگ اپنے کمرے میں جاؤ' باہر مت نکلنا' میں دیکھتی ہوں''۔زبیدہ نے بیٹیوں کو ہدایت دی اور کلمہ پڑھتی حرم کے کمرے میں آئی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے برخوردار کون ہو تم اور یہ کیا طریقہ ہے' عزت دار لوگوں کو ہراساں کرنے کا''۔سعید صاحب نے طیش سے اکبر کو گھورا تھا۔

''خالہ! آپ نے ان کو بتایا نہیں' اوہو' کتنی بری بات ہے خالہ' چلیں میں بتا دیتا ہوں' بزرگوار میں آپ کا ہونے والا داماد ہوں''۔اکبر نے زبیدہ کو اندر آتے دیکھ کر مخاطب کیا اور پھر سعید صاحب کو مخاطب کرتے سلام کے لئے ہاتھ آگے کیا۔سعید صاحب تو گویا صدمے میں چلے گئے تھے بالکل ساکت۔

''یہ بھی بالکل جھلی ہے' بتاؤ ناں بابا کو کہ بہت جلد ہماری شادی ہونے والی ہے''۔اکبر نے رخ موڑ کر اب کی بار حرم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا تھا گویا وہ دونوں بہت بے تکلف ہوں وہ بیچاری کیا کہتی خود صدمے سے سکتہ ہو گیا تھا' زبیدہ حرم کی حالت دیکھ کر اس کے پاس آئیں اور سرہانے بیٹھ گئیں۔

''زبیدہ! کون ہے یہ اور کیا کہہ رہا ہے؟''سعید صاحب نے بھابھی کو شک کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

''میری مجبوری کا فائدہ اٹھا کر شاید میری معصوم بیٹی کی قیمت لگائی ہو''۔

''ابھی کچھ نہ پوچھیں بھائی صاحب! سب کچھ بتا دوں گی مگر ابھی کچھ نہ پوچھیں''۔زبیدہ نے ساکت سی حرم کو سینے سے لگا کر روتے ہوئے کہا' حرم نے نرم آغوش ملتے ہی خوف سے ان کے سینے میں منہ چھپا لیا کسی خوفزدہ بچے کی طرح۔

''یہ کیا آپ لوگ ڈھکے چھپے الفاظ استعمال کر رہے ہیں' خالہ آپ بتاتی کیوں نہیں کہ حرم میری ہونے والی بیوی ہے' بہت جلد ہم شادی کر رہے ہیں''۔اکبر کو غصہ آ گیا۔

''اکبر! تمہیں خدا کا واسطہ چلے جاؤ' حرم کی طبیعت ٹھیک نہیں بھائی صاحب بھی بیمار ہیں رحم کرو' ہماری حالت پر' خدا کے لئے چلے جاؤ''۔زبیدہ نے اس سے التجا کی تھی۔

''ٹھیک ہے چلا جاتا ہوں مگر حرم تمہیں تو خیال کرنا چاہئے تھا' خیر کوئی بات نہیں اگلی بار آؤں گا تو بغیر چائے کے واپس نہیں جاؤں گا' تمہیں میری خاطر مدارات کرنی پڑے گی''۔اکبر نے حرم سے کہا اور سعید صاحب کو سلام کرتا دروازے سے نکل گیا۔زبیدہ نے اتنی آسانی سے بلاٹل جانے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆☆

''اتنا سب کچھ ہو گیا اور تم مجھے اب بتا رہی ہو' آخر اس نے حرم کو سمجھ کیا رکھا ہے' خدانخواستہ لاوارث ہے کیا''۔زبیدہ نے دونوں بھائیوں کے سامنے پوری بات کھول کر بیان کی تو اشفاق صاحب بھڑک اٹھے۔ ''میں پہلے بتا دیتی تو آپ کیا کر لیتے' اکبر جنجوا کا آپ کیا بگاڑ لیتے' اس جیسا شخص جس سے بڑے بڑے ڈرتے ہیں اس کے نام پر دب کر بیٹھ جاتے ہیں' میں اور آپ اس کا کیا بگاڑ لیتے؟''زبیدہ بھی ساری مصلحت بالائے طاق رکھ کر بولیں۔

''ہو گا وہ بدمعاش تو اپنے لئے ہم نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں پانی سر سے گزر گیا تم اب بتا رہی ہو' میں اس کے باپ سے بات کروں گا' یہ کیا طریقہ ہے شریفوں کی بیٹیوں کو رسوا کرے اور ہم خاموش رہیں گے''۔وہ طیش میں آ کر بولے۔

"آپ کیا کہتے ہیں بھائی صاحب؟" انہوں نے بڑے بھائی سے مشورہ لینا چاہا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو، ہم بڑے مل کر بات کریں گے تو شاید سدھر جائے ورنہ پھر دیکھا جائے گا"۔ وہ شکستہ لہجے میں آہستگی سے بولے اشفاق صاحب کو ان پر بہت ترس آیا تھا یکدم وہ بہت بوڑھے سے دکھائی دیئے تھے۔
"آپ اکیلے نہیں بھائی صاحب ہم سب آپ کے ساتھ ہیں"۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بھائی کے شانے پر رکھ کر تسلی دی تھی۔

☆☆☆☆

اشفاق صاحب نے اپنی بات ختم کی تو سلطان صاحب سر جھکائے کچھ پل خاموشی سے سوچتے رہے تھے۔ سعید صاحب بھی وہیل چیئر پر خاموش وادا س سے بیٹھے تھے، باہر صحن میں بچھے تخت پر بیٹھے اکبر کو خاموشی کا یہ وقفہ بہت کھٹکا تھا، جبکہ روبینہ کا دل بوجھل ہو گیا تھا، پہلے اکبر کی غنڈہ گردی اور مرنے مارنے والی شخصیت کی شکایات آتی تھیں۔
"اب بیٹیوں کے بوڑھے باپ بھی آئیں گے شکایت لے کر...... کیسا وقت آیا ہے ہم پر اکبر کی ضد کے سبب"۔ دل دکھ سے بھر گیا۔ تخت ڈرائنگ روم سے باہر پڑا تھا، کھلی کھڑکی اور دروازے کے ریشمی پردوں سے اندر کے بوجھل ماحول کی خبر اور گفتگو باہر تک آرہی تھی۔ روبینہ نے سلام کر کے چائے وغیرہ اندر دے دی تھی مگر خود مردوں کی گفتگو میں حصے دار بننا پسند نہیں کیا، باہر آ کر بیٹھ گئی تھیں جبکہ اکبر کو باپ نے منع کر دیا، بزرگوں کی باتوں میں چھوٹوں کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ ماننے والوں میں سے نہ تھا مگر یہاں معاملہ حرم کا تھا اس کے والد اور چچا آئے تھے وہ اسی لئے خاموشی سے باہر بیٹھ گیا۔
"خوشی تھی کہ وہ لوگ خود شادی کی تاریخ طے کرنے آئے تھے"۔
"سعید صاحب! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں، ناحق آپ کو زحمت ہوئی، مجھ سے عرض کر دیا ہوتا، میں آپ کے ہاں حاضر ہو جاتا، اس بیماری کی حالت میں آپ کو تکلیف ہوئی بہت نادم ہوں، نا ہنجار اولاد پیدا کر کے ماں باپ کے کندھے جھک جاتے ہیں اور میں بھی انہی بدنصیب والدین میں سے ہوں"۔ انہوں نے اضطرابی حالت میں دونوں ہاتھوں کو آپس میں مسلا۔
"یہ تو ابا نے ٹھیک بات کہی، اصولاً تو ہمیں ان کے ہاں جانا چاہئے تھا، لڑکے والے خود جا کر بات کرتے ہیں"۔ اکبر نے ماں کو مخاطب کیا۔
"چپ رہو بے شرم"۔ روبینہ نے غصے سے اس کو جھڑکا۔ اکبر نے حیرت و تعجب سے ماں کا یہ انداز ملاحظہ کیا تھا۔
"ہیں بے شرم......" اس نے سر جھٹکا۔
"حرم آپ کی ہی نہیں میری بھی بیٹی ہے، شرم سے اکبر نے میرا سر جھکا دیا ہے، پہلے بھی اس کی شکایات آتی رہی ہیں مگر ایسی شکایت"۔ شدت جذبات نے ان کی آواز بند کر دی وہ آگے بات نہ کر سکے۔
"آخر بیٹے کا کارنامہ ہی ایسا تھا کہ بندہ شرم سے ڈوب مرے"۔
"ہم اس لئے یہاں حاضر ہوئے ہیں کہ معاملہ خاموشی سے گھر کی چہار دیواری میں نمٹ جائے، بیٹی کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے، ہم نہیں چاہتے ہماری رسوائی ہو، آپ اکبر کو اچھی طرح سے سمجھا دیں، ہماری بیٹی سے دور رہے یہ سب کے حق میں بہتر ہے"۔ اشفاق صاحب کی بات نے اکبر کو آگ میں جھونک دیا تھا۔ وہ اٹھا اور ریشمی

پردے کو ہاتھ سے دھکیل کر اندر داخل ہوا تھا۔

''تم......؟'' باپ نے غصے سے اکبر کو گھورا پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔

''آپ نے اپنی بیٹی سے اس کی مرضی پوچھی ہے جو آپ مجھے اس سے دور کرنے کی گزارش لے کر آئے ہیں' ارے خود سوچیں' آپ معذور ہیں بیٹی کے لئے کہاں اچھا شوہر تلاش کرتے پھریں گے' اور پھر مجھ میں کیا کمی ہے' اچھا خاصہ ہوں آپ کا سہارا بنوں گا' حرم بھی مجھ سے محبت کرتی ہے آپ کیوں ہم دونوں کو الگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں''۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے جھلائے ہوئے انداز میں اونچی آواز سے کہہ رہا تھا۔ سلطان صاحب اسے چپ رہنے کی تلقین کرتے رہے مگر وہ جب بولنے پر آتا تو کسی کی کہاں سنتا تھا۔ باہر روبینہ کو ہول اٹھ رہے تھے' وہ باپ بیٹا تو ویسے ہی ایک دوسرے کے دشمن تھے مہمان کے سامنے جانے کیا تماشہ کھڑا ہو۔

''اپنی زبان کو لگام دو برخوردار! میری بیٹی ایسی بے حیا نہیں''۔ سعید صاحب کا چہرہ مارے غیرت کے لال ہو گیا تھا۔

''کیوں......اس میں بے حیائی کی کیا بات ہے' بالغ ہے سمجھ دار ہے اور پھر اسے پورا حق ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا فیصلہ کرے''۔ اکبر اپنی ہی ہانک رہا تھا۔

''کیا اول فول بک رہے ہو' کچھ تو لحاظ کرو' یہاں سارے تم سے بڑے موجود ہیں' ان سفید بالوں کا ہی کچھ خیال کر لو''۔ وہ طیش میں بیٹے سے بولے تھے۔

''ان سفید بالوں کا ہی خیال کر رہا ہوں ورنہ آپ بھی جانتے ہیں ایک کے بعد میں دوسری بات نہیں کرتا گولی چلاتا ہوں یہ لوگ آرام سے نہیں مان رہے حالانکہ میں نے کافی مصلحت سے کام لیا ہے ورنہ اسے اٹھوا بھی سکتا تھا''۔ اکبر کی اتنی سنگین بات پر مہمان حضرات تو ششدر رہ گئے تھے۔ البتہ باپ کا ہاتھ مارے طیش کے اٹھتے اٹھتے رہ گیا تھا۔

''شرم آنی چاہئے تمہیں' ایک بیٹی کے باپ سے ایسی بات کرتے ہوئے غنڈے' بدمعاش' تم نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا' اس سے تو بہتر ہوتا کہ میری کوئی اولاد ہی نہ ہوتی' افسوس لوگ تم جیسے بیٹوں کے لئے منتیں مرادیں مانتے ہیں اور پھر سر پکڑ کر روتے ہیں''۔ دکھ سے سلطان صاحب کی آواز پھٹ پڑی۔

''چلو یہاں سے اشفاق! مزید ٹھہرنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں''۔ سعید صاحب وہیل چیئر دھکیلتے سینہ مسل کر بولے۔

''تیاری مکمل رکھیئے گا سسر جی! بہت جلد بارات لے کر آؤں گا''۔ اکبر اپنی بات کہہ کر جس طرح آیا تھا ویسے ہی چلا گیا' روبینہ نے اسے روکنا چاہا مگر وہ باہر نکل گیا تھا۔

''میں اس بدمعاش کو سمجھانے کی پوری کوشش کروں گا سعید صاحب! ہو سکے تو مجھ بدنصیب کو معاف کر دیجئے گا' آہ سے بہت ڈر لگتا ہے' میں بھی چار بیٹیوں کا باپ ہوں''۔ وہ عاجزی سے بولے تھے۔ اشفاق صاحب نے آگے بڑھ کر ان کے بندھے ہوئے ہاتھ تھامے تھے' سعید صاحب کی طبیعت لحہ بہ لحہ بگڑ رہی تھی۔

☆☆☆☆

وہ چچا کے لئے چائے بنا کر لائی تو زبیدہ اور اشفاق صاحب اس کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے وہ دروازے میں ہی رک گئی۔

''نہایت ہی بدلحاظ اور خود سر لڑکا ہے اکبر' باپ بیچارہ ہم سے بہت شرمندہ تھا' اللہ بھی اپنے نیک بندوں کو

کیسے کیسے آزماتا ہے کہاں سلطان صاحب اور کہاں اکبر جیسا بیٹا..... مولیٰ تیری شان نرالی"۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھرتے دونوں ہاتھ اٹھا کر تعجب سے اوپر دیکھا تھا۔

"پھر کیا کہا ان لوگوں نے؟" زبیدہ کو یہی تجسس مارے دے رہا تھا۔ سعید صاحب بھی جب سے آئے تھے نہ کوئی بات کر رہے تھے اور نہ کچھ کھا پی رہے تھے۔

"سلطان صاحب کہہ رہے تھے سمجھائیں گے اس کو" وہ ہاتھ کی مٹھی بنا کر لبوں پر رکھتے پرسوچ انداز میں بولے۔

"ہونہہ..... جیسے وہ سمجھائیں گے تو اکبر سمجھ جائے گا' اتنا ہی فرمانبردار ہوتا تو ماں باپ کے سمجھانے پر غنڈہ گردی چھوڑ چکا ہوتا' آپ کو شاید پتا نہیں' بڑے بڑے پولیس افسر بھی اکبر کے نام سے کانپتے ہیں"۔ زبیدہ تنک کر بولیں۔

"جانتا ہوں' اسی لئے تو ڈرتا ہوں کہیں کچھ الٹا سیدھا نہ کر دے بدنامی تو ہماری ہوگی ناں' یہی سوچ کر بھائی صاحب کے ساتھ ان کے ہاں اپنی عزت کی بھیک مانگنے گیا تھا"۔ حرم شرم کے مارے رو پڑی پہلے ہی وہ خوفزدہ اور شرمندہ شرمندہ سی تھی۔

"زبیدہ' ایک بات ذہن میں آئی ہے اس سے ہماری عزت بھی سلامت رہے گی اور حرم کو بھی تحفظ مل جائے گا"۔ وہ کچھ سوچ کر بولے۔

"وہ کیا؟" زبیدہ کا دل دھڑکا۔

"اللہ کرے جو میرا دل کہہ رہا ہے وہ بات نہ ہو"۔

"کیوں ناں حرم کا نکاح فرحان کے ساتھ سادگی سے کر کے اس کے ساتھ ہی رخصت کر دیں' دونوں وہاں آرام سے رہیں گے"۔ اشفاق صاحب کی بات سن کر انہیں کرنٹ لگا تھا۔

"یعنی جو دھڑکا تھا وہی ہوا"۔

"ایسا سوچئے گا بھی نہیں' میرا بیٹا قربانی کا بکرا نہیں' دو ہی بیٹے ہیں میرے انہیں بھی دشمنوں میں جھونک دوں' اکبر حرم کو پاتال سے بھی نکال لے گا' اس کے دماغ میں جو سودا سما جائے وہ کوئی نہیں نکال سکتا' اس خوش فہمی کو ذہن سے نکال دیں یہ کوئی حل نہیں اس مسئلے کا"۔ وہ لحاظ مروت بھول گئیں۔

"کیسی بات کر رہی ہو مشکل میں اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں' بھائی صاحب کیا سوچیں گے؟" وہ آواز کو دھیما کرتے ناصحانہ انداز میں بولے۔

"حرم میں مزید رکنے کی ہمت نہ تھی وہ پلٹ کر بھاگی تھی اور کچن میں کھڑے ہو کر ڈھیر سارا رونے لگی' بے بسی میں بندہ سوائے رونے کے کر بھی کیا سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے آپ اپنوں کے کام آتے رہیں' مگر یہ سن لیں' میں اس گھر میں نہیں رہوں گی پھر اپنوں کو وضاحت دیتے پھریں گے کہ ایسی کیا بات ہوئی کہ ایک ماں بیٹے کے نکاح میں شریک نہیں"۔ وہ طیش سے کہہ کر اٹھیں اور باہر نکل گئیں' اشفاق صاحب نے سر پکڑ لیا تھا۔ وہ کچن میں پانی پینے آئی تھیں مگر وہاں حرم کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک کر رکیں' وہ رخ پھیرے رو رہی تھی پاس ہی سلیب پر ٹرے میں چائے کے دمگ پڑے تھے وہ سمجھ گئیں کہ حرم نے ان کی گفتگو سن کر اندر جانے کی ہمت نہیں کی بلکہ کچن میں چلی آئی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وہ پاٹ دار انداز میں بولیں پہلے ہی اس پر کافی غصہ تھا۔ حرم نے جلدی سے آنسو پونچھ کر رخ ان کی سمت پلٹا۔

"کچھ نہیں"۔ آواز میں بھی آنسوؤں کی نمی پوشیدہ تھی وہ نظریں جھکائے ہوئے تھی مگر سرخ ملاحت کئے چہرہ

بتا رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے روتی رہی ہے۔
"کس کی یاد میں یہ آنسو بہائے جا رہے ہیں؟" ان کا طیش کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اتنی گھٹیا بات پر بھلا کیا جواب دیتی' آنسو پھر سے رواں ہو گئے۔
"اپنے آنسوؤں سے مجھے رام کرنے کی کوشش مت کرنا' سارے کس بل نکال دوں گی' میں نے ذرا سی ہمدردی کیا دکھا دی تم تو میرے بیٹے کو ہتھیانے کے چکروں میں پڑ گئیں بے شرم' میں تمہیں معصوم سمجھتی تھی مگر کیسے تم نے چچا کے ذہن میں فرحان کی بات ڈال دی حالانکہ میں نے پہلے ہی باور کروا دیا تھا میرے بیٹے سے دور رہنا' دکھا دی ناں اپنی اصلیت۔" وہ پاس آ کر اس کا ہاتھ مروڑتے ہوئے بولی تھیں۔
"نہیں چچی! میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا' وہ روتے ہوئے ان الزامات پر تڑپ اٹھی۔
"سوچنا بھی مت' میں تمہیں کبھی اپنی بہو نہیں بناؤں گی' اگر کبھی مجھ سے ٹکر لینے کی کوشش کی تو یاد رکھنا زبیدہ تمہارا وہ حشر کرے گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گی بہتر یہی ہے چپ چاپ اکبر سے شادی کر لو ہم سب کی اور تمہاری بہتری اسی میں ہے۔" زبیدہ کی بات پر حرم کی جان نکل گئی۔
"پلیز چچی! ایسا مت کہیں مجھے اس شخص سے شادی نہیں کرنی"۔ وہ روتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ کر التجائیہ انداز میں بولی۔
"ہٹو پرے"۔ انہوں نے حقارت سے اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے دھکیلا۔
"ہمارے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دے گا وہ ایک بار جو وہ کہہ دے وہ پتھر پر لکیر ہوتی ہے' تم اب بھی اسے جان نہیں سکی وہ اس شہر کا بہت بڑا بدمعاش اور خطرناک شخص ہے اس پر اپنے سگے ماں باپ کی نہیں چلتی تو ہماری کیا سنے گا"۔ اپنی بات کہہ کر وہ بغیر پانی پیئے باہر چلی گئیں۔
"نہیں"۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھتی نیچے گرتی چلی گئی' التجا سننے والا کوئی نہ تھا۔

☆☆☆☆

"ابھی اسی وقت تجھے جانا ہو گا اماں! ورنہ کلمہ پڑھ لینا بیٹے پر' قیامت تک شکل نہیں ملے گی دیکھنے کو' بڑا اکبر اکبر کرتی ہے ناں' آج میں دیکھتا ہوں تو کتنی محبت کرتی ہے مجھ سے"۔ اکبر تنا بیٹھا تھا ہاتھ میں پستول لئے باپ کو پرواہ نہ تھی مگر روبینہ کی جان پر بنی تھی۔
"خدا نہ کرے اکبر! کیسی منحوس باتیں منہ سے نکال کر میرا دل ہولا رہے ہو مریں تمہارے دشمن بیٹا' ضد چھوڑ دو' پھر کسی وقت چلی جاؤں گی"۔ وہ دہل کر کہتے آخر میں لجاجت سے بولیں۔
"مر جاؤ' بوجھ ہو تم اس زمین پر' کتنے لوگوں کو تم نے نیچا رکھا ہے جینا حرام کر رکھا ہے اچھے بھلے لوگوں کا حرم سے شادی کرنے سے بہتر ہے تم مر جاؤ' چلا لو خود پر گولی' ہم نہیں آنے والے تمہاری دھمکیوں میں"۔ سلطان صاحب بھرے بیٹھے تھے تپ کر بولے۔
"میں تو مروں گا ہی مگر یہ مت سمجھئے کہ میرے مرنے پر آپ سب کو سکون ملے گا' آپ سب کا بھی جینا دوبھر کر دوں گا' اے ایس پی' آئی جی اور تمام پولیس والوں کو تحریر لکھ کر بھجوا دی ہے میرے مرنے میں میرے باپ سمیت تین لوگ ذمہ دار ہوں گے اشفاق اور سعید صاحب' کیونکہ میں اور حرم (سعید صاحب کی بیٹی) شادی کرنا چاہتے تھے مگر یہ تینوں بزرگ ایسا نہیں چاہتے تھے لہٰذا مجھے ان تینوں سے جان کا خطرہ ہے"۔ اکبر کہاں چوکنے والا تھا جھٹ بول دیا۔

''نابنجار' شخص جانے کس پر گیا ہے تو' میرا خون تو اتنا گندہ نہیں تھا''۔ وہ لاٹھی ہاتھ میں لئے اس کی سمت بڑھے روبینہ درمیان میں آگئیں۔

''کیا کر رہے ہیں وہ طیش میں ہے' جانتے ہیں جوان خون ہے' کہاں ٹھنڈا ہونے والا ہے آپ بھی بچے کے ساتھ بچہ بن گئے' ابھی مجھے رشتہ لے کر جانے دیں جو ہوگا دیکھا جائے گا' غصہ ٹھنڈا ہوگا تو میں سمجھادوں گی خود ہی سمجھ جائے گا آپ کو میری ممتا کا واسطہ خاموش ہو جائیں لوگوں سے بات کریں گے انکار ہوگا تو خود ہی چپ ہو جائے گا''۔ روبینہ نے آہستگی سے التجا کی تھی۔

''ہونہہ...... یہ سدھرنے والا نہیں' ہمیشہ یونہی میرا دل جلاتا رہے گا لکھ کر رکھ لو روبینہ بیگم''۔ وہ اس کی سمت لاٹھی لہراتے طیش سے بولے اور انہی قدموں باہر لوٹ گئے۔ اکبر نے جواباً سر جھٹک کر ہونہہ کہا تھا۔

''اماں! جا رہی ہو تم یا اڑا لوں اپنا بھیجہ؟'' اکبر نے سرے سے غصے میں آکر پستول کنپٹی پر رکھی۔

''ارے رے...... اکبر بیٹا' ہٹاؤ اس منحوس کو' جا رہی ہوں' لائبہ اندر سے میری چادر لادو بیٹی''۔ انہوں نے پستول کو دیکھتے دہل کر کہا اور پھر اندر کی جانب ہانک لگائی۔

''اب کیا ہے ناں اکبر جنگجو کی ماں والا کام' جلدی سے خوش خبری کے ساتھ آنا اور ہاں تاریخ بھی آج ہی طے کر لینا''۔ وہ خوش ہو کر ماں کی پشت سے اونچی آواز میں مخاطب ہوا تھا۔

''بالکل اتاؤلا ہے یہ اکبر بھی''۔ ماں نے کوفت سے سوچا تھا۔

☆☆☆☆

''داغ دل ہم کو یاد آنے لگے
لوگ اپنے دیئے جلانے لگے''

پورے کمرے میں مغنیہ کی خوبصورت آواز بکھر کر فسوں پھیلا رہی تھی کسی کی یاد کا چراغ اس کے دل کو منور کر رہا تھا' اتنی دوری کے باوجود وہ چہرہ دل و دماغ پر حاوی تھا' آج کسی پل حرم کا حسین چہرہ اداس آنکھیں تصور کے پردے سے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔

''ایک پل میں وہاں سے ہم اٹھے
بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے''

وہ اٹھ بیٹھا دل پر عجیب سی وحشت و ویرانی سی چھا رہی تھی۔

فون اٹھا کر نمبر ملایا' خرم کی طرف سے دل عجیب وہموں میں گرفتار تھا' دل سے دعا نکلی کہ وہی اٹھائے' اس نے بے تابی سے ہیلو کہا تھا' کیونکہ دوسری سمت سے ریسیو کر لیا گیا تھا اسے خلیل جبران کا فلسفہ بروقت یاد آیا تھا۔

''آہ! میری شوریدہ بختی کہ مایوس تمنا روح کو تو اب قرار نہیں' وہ تمہاری جستجو میں فضاؤں میں چکر کاٹتی ہے' اس غریب الوطنی پرندے کی طرح جس کا کہیں مسکن ہو نہ ٹھکانہ۔ وہ ایک ایک کنج میں ڈھونڈتی پھرتی ہے' ہم آہ! تم تو کہیں بھی نظر نہیں آتیں اور نہ ہی تمہاری کوئی یادگار' اپنی خرماں نصیبی پر وہ اس طرح بے چین ہو جاتی ہے جیسے ساز کے پرسکون تاروں میں متلاطم نغمہ اور پھر میری مایوس وافسردہ روح!! وہ ناکام واپس آجاتی ہے' محفل تمہاری شیریں یاد کا سہارا لئے اور بازیافت کے بھر دسے پر''۔

بے قراری' جستجو و مسرت کا صحیح مفہوم اسے ان پلوں میں ہوا تھا۔ اس کا لمبا چوڑا وجود پروں کی طرح ہلکا ہوا اور اڑان بھرنے لگا۔

"ہیلو ہاں بیٹے' کیسے ہو خیریت' پرسوں ہی تو تمہاری بات ہوئی تھی' فون کیسے کیا؟" بیٹے کی آواز پہچان کر وہ ایک ہی سانس میں بولی تھیں۔ اسے جلد سے جلد نمٹا کر روبینہ کی بھی تو خبر لینی تھی' خود دو منٹ پہلے آئی تھی' صحیح سے لتاڑا بھی نہ تھا کہ فرحان کا فون آ گیا۔

"السلام علیکم اماں! کیسی ہیں آپ؟ میں خیریت سے ہوں' بس آپ لوگوں کی طرف سے دل کچھ پریشان تھا سوچا خیریت پوچھ لوں"۔ وہ بجھ سا گیا پروں کی طرح ہلکا وجود پھر سے بھاری ہو گیا۔

"نہیں بیٹے پریشان مت ہونا' یہاں سب خیریت سے ہے' اچھا میں فون بند کرتی ہوں' ابھی مہمان آئے بیٹھے ہیں' اپنا خیال رکھنا' خدا حافظ"۔ جلدی سے آخری کلمات ادا کر کے انہوں نے فون پٹخا گویا روبینہ ہو۔ فرحان بیچارہ ریسیور کو ہی دیکھتا رہ گیا۔

"کس مٹی کی بنی ہو تم' شرم و حیا تو رہی نہیں' اب کس منہ سے آئی ہو' کوئی اور بے عزتی رہ گئی ہے۔ جو پھر سے بیٹے کی وکالت کرنے آئی ہو"۔ زبیدہ نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کر طنز کے تیر برسائے۔

"جو کہنا ہے کہہ لو' میں بہت مجبور ہو کر آئی ہوں' ایک بار تحمل سے غور کر لو میری بات پر' وہ پورے شہر کو آگ لگا دے گا' اگر ہم بڑے ساری بات طے کر لیں تو ہر کوئی نقصان سے بچ جائے گا' میں اس کی ماں ہوں' جانتی ہوں دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے مگر وہ اپنی بات سے نہیں پھرتا' کوئی بھی نقصان ہونے سے پہلے ٹھنڈے دماغ سے سوچو' معاملہ بچی کا ہے' ایک انگلی اٹھ گئی تو پھر دنیا کو بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا"۔ روبینہ نہایت عاجزی سے بولی تھیں۔

"اچھا تو اب تم ہمیں ہمارے ہی گھر میں دھمکانے آئی ہو' خوب شاباش ہے تمہاری جرات کو"۔ وہ آگ بگولا ہوئیں۔

"زبیدہ بات سمجھنے کی کوشش کرو' دونوں گھرانے تباہ ہو جائیں گے' تم اکبر کو جانتی ہو' قیامت تک پھر کسی کو نہیں بخشتا' بہتر ہے کہ بزرگ اس معاملے میں دخل دیں' سارا مسئلہ سدھر جائے گا' میں حرم کو اپنی بیٹیوں سے زیادہ محبت اور توجہ دوں گی' ایک بار سعید صاحب سے بات کروا دو"۔ وہ منت آمیز لہجے میں مخاطب تھیں۔ اس سے پہلے کہ زبیدہ بیگم جواب دیتیں' سعید صاحب وہیل چیئر گھسیٹتے لاؤنج میں آئے تھے۔

"میں آپ کی تمام بات چیت سن چکا ہوں' چاہے اکبر کتنا ہی بڑا غنڈہ بدمعاش سہی' ہم اس سے ڈرنے والے نہیں' جان بوجھ کر میں اپنی بیٹی کو جہنم میں نہیں دھکیل سکتا' میری بے زبان' فرمانبردار بیٹی اس شخص کے قابل ہرگز نہیں' جب تک میں زندہ ہوں یہ خیال ہر کوئی اپنے دل و دماغ سے نکال دے' اب آپ جا سکتی ہیں' میں آپ کی مجبوری سمجھ سکتا ہوں آپ ماں ہیں' اسی طرح میری مجبوری بھی سمجھئے' میں بھی ایک باپ ہوں' حرم کو اپنے ہاتھوں پال پوس کر بڑا کیا ہے کیسے اسے اکبر جیسے غنڈے کو سونپ دوں"۔ وہ آبدیدہ ہو گئے' باقی کچھ سننے کو بچا ہی نہ تھا' وہ نم آنکھوں کو خشک کرتیں' بیرونی دروازے کی سمت بڑھیں تھیں۔ اندر حرم خوف و شرم سے رو رہی تھی اس کی وجہ سے ہر کوئی اذیت میں تھا بوڑھا معذور باپ لوگوں کی منتیں کر رہا تھا۔

☆☆☆☆

"کیا ہوا؟ کون سی تاریخ دی ہے حرم کے باپ نے؟" اکبر روبینہ کو خاموشی سے دیکھتا رہا' انہوں نے چادر اتار کر اندر جا کر لٹکائے اور پھر باہر آ کر کچن سے پانی پی کر نکل آئیں' اکبر سے صبر نہ ہوا تو خود ہی پوچھ لیا۔

"بیٹا......وہ' میں کہنے تو جا رہی ہوں' مگر تحمل سے میری بات سننا' طیش میں آنے کی ضرورت نہیں' وہ بھی مجبور ہیں' آخر کو بیٹی کا معاملہ ہے"۔ روبینہ اس کے پاس آ کر بیٹھیں اور لجاجت سے گویا ہوئیں۔

''سمجھ گیا' کچھ کہنے کی ضرورت نہیں''۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جیب تھپتھپا کر تسلی کی' پستول جیب میں ڈالی تھا۔
''کہاں جا رہے ہو بات تو سنو''۔ روبینہ بھی اس کے پیچھے تیزی سے بڑھی تھیں۔
''حرم کو تمہاری بہو ہی بناؤں گا' میرے گھر کے سوا وہ کہیں نہیں جا سکتی''۔ وہ پراسرار سے انداز میں بولا۔
''تمہیں اپنی ممتا کا واسطہ دیتی ہوں' کچھ غلط مت کرنا' بخش دو ان لوگوں کو آخر کب تک تم اس بچی کے پیچھے پڑے رہو گے؟'' وہ بہت عاجزی سے بولی تھیں۔

''جس دن کتاب عشق کی تکمیل ہو گی
رکھ دیں گے زندگی! تیرا بستہ اتار کر''

اس نے ہاتھ اٹھا کر سر دھنتے ہوئے شعر پڑھا اور ماں کی بار بار پکار پر بھی نہ رکا۔
''اللہ تجھ سے' بہت عاجز بندی کی اک التجا ہے' قبول کر لے' میرے بیٹے کے ہاتھوں کچھ غلط نہ کرنا' حرم کو رسوائی سے بچا' اکبر کا غصہ ٹھنڈا کر دے''۔ وہ رونے لگی تھیں۔

☆☆☆☆

''السلام علیکم اکبر بھائی''۔ سیماب نے دوپٹہ اوڑھ کر سلام کیا تھا۔
''کہاں ہیں سارے؟'' گھر کی خاموشی محسوس کر کے اس نے پوچھا۔
''ہاسپٹل''۔ وہ اتنا ہی کہہ سکی' کیونکہ نظریں پستول پر ٹھہر گئی تھیں۔ اکبر نے تھپتھپا کر واپس مطلوبہ جگہ رکھ دی۔ کچن سے نکلتی سعدیہ اکبر کو دیکھ کر واپس کچن میں گھسنے لگی تھی کہ اکبر کی نگاہ پڑ گئی۔
''کچھ ہی دنوں میں تمہارا دولہا بھائی بن جاؤں گا' اور تم ہو کہ مجھ سے چھپ رہی ہو' چائے پانی کچھ نہیں پوچھا' عجیب سالیاں ہو''۔ اس کی لتاڑ پر سعدیہ شرمندہ اور ڈری ڈری سی نکلی تھی۔
''چائے لاؤں؟'' آواز بھی مری مری سی نکلی۔
''رہنے دو اب''۔ وہ جھنجلا کر بولا۔
''ہاں بیٹا! تم کیا کہہ رہی تھیں؟ ہاسپٹل......کون سا ہاسپٹل؟ بیمار کون ہے؟'' وہ سیماب کی سمت متوجہ ہوا۔
''پورے شہر میں ایک وہی سرکاری ٹوٹا پھوٹا ہاسپٹل ہی رہ گیا تھا بڑے کنجوس لوگ ہو ویسے''۔ اسے سیماب کا جواب سن کر تپ چڑھا' لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا' دونوں بہنوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆☆

''حرم بیٹے ڈرنا نہیں' میں ذرا تمہاری چچی کو گھر چھوڑ کر آتا ہوں' بچیاں اکیلی ہوں گی' پندرہ منٹ لگیں گے' ٹھیک ہے بالکل گھبرانا نہیں''۔ اشفاق صاحب نے حرم کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی۔
سعید صاحب کو الگ کمرے میں رکھا گیا تھا کمرا کیا تھا ڈربہ تھا انہیں معمولی سا اٹیک ہوا تھا' کافی بیماریاں تھیں' جن میں سرفہرست ہارٹ اور سانس کا مسئلہ تھا اوپر سے کمزوری الگ یہ اسپتال کم کلینک دراصل گھر سے نزدیک تھا' بھی ان کی خراب حالت کو مدنظر رکھ کر یہاں لایا گیا تھا وہ ابھی تک آکسیجن کے ذریعے سانس لے رہے تھے۔
چچا چچی کے جاتے ہی وہ کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں' حرم بہت گھبرا گئی تھی' دنیا میں باپ کا واحد سہارا ابھی اسے ہاتھ سے نکلتا محسوس ہو رہا تھا اتنا روئی تھی کہ اتنے گھنٹے گزرنے کے بعد بھی چہرہ دھلا دھلا اور آنکھیں متورم تھیں' وہ سعید صاحب پر نظریں جمائے بیٹھی تھی کہ دروازہ کھلا اور جو ہستی اندر داخل ہوئی تھی' حرم کی آنکھوں

میں خوف اتر آیا تھا' وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی' وہ دروازہ بند کر کے سعید صاحب کے سامنے سرہانے کھڑا ہو گیا۔

''ہر بات مجھ سے چھپاتی ہو' میں کوئی غیر تو نہیں' میرا سسر اتنا بیمار ہے اور کسی نے خبر کرنا بھی گوارا نہ کیا''۔ اس نے ساکت کھڑی حرم کو مخاطب کیا' وہ اسے اپنا واہمہ سمجھ کر آنکھیں پھیلائے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

''مجھے کوئی بات بری لگی ہو تو خیر کوئی بات نہیں مگر تم سے اتنی بے مروتی کی بھی امید نہ تھی' میری ماں تمہارے گھر تاریخ مانگنے آئیں اور تمہارے آپ نے انکار کر دیا تم نے انہیں سمجھایا کیوں نہیں' آخر کیوں ہمارے درمیان لوگ مداخلت کر رہے ہیں' تم کہہ دیتی ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں' ہمیں شادی کرنے دیں' میں تمہیں سزا دینے آیا ہوں تا کہ آئندہ کوئی ہمارے معاملے میں مداخلت کی جرات کرے تو تم منہ توڑ جواب دے سکو''۔ وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے دونوں بہت گہری محبت کرنے والے ہوں۔

''تمہارے باپ نے مداخلت کی تھی ناں؟ لو میں قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں' پھر تو کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی درمیان میں''۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور سعید صاحب کے منہ پر لگا آکسیجن نکال دیا۔ حرم اتنی خوفزدہ تھی اکبر کو دیکھ کر کہ باپ کے تڑپنے جسم نے بھی اسے جنبش پر مجبور نہ کیا بس ساکت سی اکبر کو تکتی جا رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ تڑپتے رہے بالآخر ان کا کمزور جھٹکے کھاتا وجود ساکت ہو گیا۔ اکبر نے تسلی کر لینے کے بعد آکسیجن دوبارہ ان کے منہ پر لگا دیا اور ہاتھ جھاڑ کر خوفزدہ ساکت سی حرم کو دیکھا۔

''دی اینڈ''۔ اور دامن جھاڑ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر میں اشفاق صاحب آئے تو حرم کو ساکت کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''بھائی صاحب؟'' سعید صاحب کو دیکھ کر انہیں کسی خطرے کا احساس ہوا تھا' اور جب وہ پاس آئے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے روتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کی کھلی آنکھیں بند کی تھیں۔

☆☆☆☆

مرحوم سعید صاحب کا سوئم بھی گزر گیا' مگر حرم کی چپ نہ ٹوٹی فرحان نے بھی فون کیا تسلی کے بول بولتا رہا مگر حرم چپ چاپ تھی اک جامد چپ تھی جس نے اس کی شخصیت کو جکڑ رکھا تھا' زبیدہ نے فرحان سے کہہ دیا کہ باپ کا صدمہ ہے کسی سے بات نہیں کرتی' ابھی سکتے میں ہے' وہ بہت پریشان رہا افسوس بھی ہوا کاش وہ پاس ہوتا تو ڈھارس دے دیتا' آخر چوتھے دن اسے یقین دلایا گیا کہ سعید صاحب انتقال فرما گئے ہیں وہ دھاڑیں مار مار کر روئی سارے منظر یاد آتے گئے ہر آنکھ اشکبار تھی۔ جس دن ان کا انتقال ہوا تھا اس دن روبینہ بیٹے کا انتظار کر رہی تھیں۔ (جس طرح سے وہ گیا تھا وہ ہول رہی تھیں کہ اکبر خون خرابا کر کے حرم کو ہاتھ سے پکڑے گھر لا رہا ہو گا' ایسا کچھ نہ ہوا وہ بہت پرسکون خاموش سا آیا کچن سے پانی پی کر تخت پر لیٹ گیا' روبینہ آتے کے ساتھ ہی پوچھتی رہی کیا ہوا وہ بولا۔

''میرے سسر صاحب قضائے الٰہی سے رحلت فرما گئے ہیں جا کر بہو کو سینے سے لگا کر تسلی دے دیجئے گا''۔ وہ اکبر کے پرسکون انداز کے برعکس دل پر ہاتھ رکھ کر ہول گئی تھیں۔

''ہائے بیچاری''۔ اور پھر روبینہ بھی گئی تھیں تعزیت کرنے سارا گھر کچا کچ بھرا ہوا تھا' جنازہ اٹھا تو کہرام مچ گیا' یہاں تک کہ سعدیہ سیماب بھی تایا کی وفات پر رو رہی تھیں' اگر کوئی چپ تھا تو وہ حرم تھی سیاہ سادہ لباس میں ان سوگوار غمزدہ سی سکتے کی کیفیت میں بیٹھی حرم کندھا دینے والوں میں سے اکبر بھی تھا' حرم کو دیکھ چکا تھا' اشفاق صاحب کو اکبر کا آنا ناگوار تو گزرا تھا مگر ایسے وقت میں وہ خاموش تھے اب کیا ہنگامہ کرنا' البتہ زبیدہ نے روبینہ کو

سلام دعا تک کرنے اور بیٹھنے کا کہنا بھی زحمت نہ کی تھی' وہ خود ہی حرم کو تسلی دیتی کچھ دیر کو بیٹھی تھیں۔ حرم کے لئے باپ کے بغیر گزرتے یہ دن بہت بھاری تھے۔

☆☆☆☆

دن گزرتے رہے' سعید صاحب کی وفات کو دو مہینے ہو گئے تھے' مگر حرم کی زبان کو مقفل کر گئے تھے وہ پہلے بھی کم گو تھی مگر اب جیسے گونگی ہو گئی تھی چپ چاپ سارا دن گھر کے کاموں میں لگی رہتی' اس نے زبان نہ کھولی کہ باپ کی موت کیونکہ واقع ہوئی تھی کہہ بھی دیتی تو کون سا اکبر کا کچھ بگڑ جاتا' زبیدہ اس کی زبان بند کروا دیتیں' وہ تو ویسے بھی اکبر سے ڈرتی تھیں' بقول ان کے وہ اپنے بیٹوں کے لئے دشمن نہیں پال سکتیں۔ ایسے ہی ایک اداس دن وہ تار پر کپڑے پھیلا رہی تھی کہ اکبر اور روبینہ گیٹ سے اندر آئے تھے' اکبر نے ماں کو اندر بھیجا اور خود اس کی سمت چلا آیا۔

''آج میں اپنی والدہ کو رشتے کے لئے لایا ہوں' تاریخ بھی آج ہی لے کر جاؤں گا''۔ اکبر کی آواز کو اپنے اتنے قریب محسوس کر کے وہ اچھل کر پلٹی اور خوفزدہ ہو گئی۔ وہ مجسم سامنے کھڑا تھا۔ حرم کی نگاہیں جھک گئیں وہ دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔

''اپنے باپ کی موت کا منظر تو تمہیں یاد ہی ہوگا''۔ اس کی سنگین بات پر حرم کو وہ منظر یاد آیا تو نئے سرے سے آنکھیں بھیگ گئیں۔

''ٹھیک اسی طرح' اندر موجود ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا' پستول میری جیب میں بھرا پڑا ہے' آج تم اقرار کرو گی' میرے ساتھ شادی کا اقرار' سب کے سامنے' اگر نہیں کیا تو سارا خاندان تمہاری وجہ سے مر جائے گا' نہیں مریں گے تو ہم دونوں کیونکہ مولوی نکاح تب ہی پڑھاتا ہے جب دولہا دولہن موجود ہوں' اور میں کوئی پاگل نہیں جو اپنی اتنی پیاری بیوی کو مار دوں''۔ وہ سرد انداز میں جیب تھپتھپا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا تھا' حرم خوف سے زمین میں دھنسنے کو تھی۔

''بولا کرو گی ناں اقرار' کہ ہم دونوں محبت کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں''۔ وہ دھمکاتے ہوئے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولا۔

''دھمکانا اسے خوب آتا تھا' اور اگر سامنے حرم جیسی خوفزدہ لڑکی ہو تو یہ کام مزید آسان ہو جاتا' حرم نے روتے ہوئے آنکھیں میچ کر سر کو اثبات میں ہلا دیا تھا' ایک پل میں ہی وہ پل صراط پر لوٹ گئی تھی۔

''شاباش یہ ہوئی ناں بات''۔ وہ اس کا گال تھپتھپا کر اندر کی سمت بڑھا تھا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا' پھر کیوں آئی ہو؟ کیا عزت راس نہیں دھکے دے کر نکالوں گی تو سمجھ میں آئے گا؟'' اکبر نے زبیدہ کو روبینہ پر برستے دیکھا اور سنا تھا۔

''گرم گرم نہیں کھاتے خالہ! منہ جل جاتا ہے' ٹھنڈا کر کے کھائیے لطف آ جائے گا''۔ وہ مبہم سا مسکرایا۔

''یہ کہاں سے آ ٹپکا؟'' وہ تھوڑا خوفزدہ ہوئیں۔

''شادی کی تاریخ مانگنے آئے ہیں' کوئی بھیک نہیں تمیز سے آرام سے لڑکے والوں کو بٹھایا جاتا ہے خالہ کیا یہ سب بھی بھول گئیں''۔ اکبر نے جتانے والے انداز میں کہا اور خود ہی بلاتکلف صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

''آؤ اماں! اپنا ہی گھر ہے' تمہاری بہو ابھی آ کر تمہاری خاطر مدارات کرے گی خالہ اور اس کی بیٹیوں سے ایسی توقع رکھنا عبث ہے''۔ وہ صوفے کی پشت پر ہاتھ پھیلاتا' سکون سے بیٹھا تھا۔

''بیٹھو''۔ ناچار زبیدہ نے روبینہ کو کہا۔ اکبر کا ڈر جو تھا۔ ابھی وہ بیٹھیں ہی تھیں کہ اشفاق صاحب کمرے سے نکلے تھے' اکبر کو دیکھ کر ان کا پارہ چڑھ گیا۔

''تم...... تمہاری جرات کیسے ہوئی یہاں آنے کی' نکل جاؤ میرے گھر سے' غنڈے بدمعاش کہیں کے''۔ وہ انگلی اٹھا کر کف اڑاتے ہوئے بولے تھے چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''آرام سے بزرگوار آرام سے''۔ اکبر سیدھا ہوا اور ہاتھ اٹھا کر پرسکون رہنے کو کہا۔

''ہماری بھی سن لیجئے' مہمان ہیں' ہم گھر آئے مہمانوں کو کیا آپ لوگ یونہی بے عزت کر کے نکالتے ہیں؟ تحمل سے بیٹھ کر بات کریں' کچھ آپ سمجھائیں' کچھ ہم سمجھائیں گے تو ہی بات بنے گی' ایسے کیسے چلے گا؟'' اکبر یوں بولا جیسے اس سے سیدھا روئے زمین پر دوسرا کوئی نہ ہو۔

''بیٹھ جائیں''۔ زبیدہ نے بھی لجاجت سے کہتے آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کی تھی' ناچار وہ بیٹھ گئے۔

''ہفتہ بعد میری دو بہنوں کی شادی ہے' اس کے بعد اماں بالکل اکیلی رہ جائیں گی' اسی لئے ہم شادی کی تاریخ لینے آئے ہیں''۔ اکبر نے مدعا بڑی سنجیدگی اور تمیز سے بیان کیا تھا۔

''پھر وہی بات' جب ہم نے رشتہ ہی نہیں دیا تو کیسی تاریخ کہاں کی تاریخ؟'' اشفاق صاحب پھر سے طیش میں آ کر اپنی جگہ سے کچھ سرکے تھے۔

''نہ ایسے ناں کہیں پہلے حرم سے پوچھ لیں اس کی مرضی بھی اہم ہے پہلے ہی باپ کا صدمہ ہے' اب آپ اسے دوسرا صدمہ دیں گے تو سہار نہ پائے گی' دو محبت کرنے والوں کو جدا کر کے کیا ملے گا آپ کو؟ ہم دونوں بہت محبت کرتے ہیں' پلیز ہمیں شادی کرنے دیں''۔ وہ اتنے استحقاق اور طیش سے بولا کہ اشفاق صاحب ششدر رہ گئے۔

''تم ہوش میں تو ہو' ہمارے ہی گھر میں ہماری بچی کو رسوا کرنے آئے ہو' میں حرم کو جانتا ہوں وہ ایسی لڑکی نہیں''۔ جلال عود کر آیا۔

''پھر وہی بات ٹھیک ہے اک بار بلا کر اپنے سامنے پوچھ لیجئے' آپ کی تسلی ہو جائے گی''۔ اکبر نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر آسان حل بتایا۔

''سوچ کیا رہے ہیں بلایئے ناں''۔ اس نے پھر سے اشفاق صاحب کو آواز دی۔ جھجک سی تھی۔

''میں اس بدمعاش کے سامنے اپنی بچی کو کیونکر بلا سکتا ہوں' مگر یہ بھی تو پتہ کرنا ہے کہ یہ اتنے استحقاق سے حرم کا نام لے کر ایسی بات کیسے اتنے دھڑلے سے کہہ سکتا ہے''۔ ''زبیدہ حرم کو لے کر آؤ''۔ کسی نتیجے پر پہنچ کر انہوں نے خاموش بیٹھی زبیدہ کو مخاطب کیا۔ وہ اچنبھے سے شوہر کو دیکھتی اٹھی تھیں۔

''یہ تبدیلی؟ اللہ رحم کرنا''۔ اکبر اپنی جیت پر کھل کر مسکرایا تھا' ہر مرحلہ وہی طے کر رہا تھا روبینہ تو بیٹے کے رویے اور باتوں پر حق دق تھیں' حرم کو لا کر اشفاق صاحب کے پہلو میں بٹھایا گیا وہ بہت خوفزدہ اور سر جھکائے بیٹھی تھی' اکبر اور روبینہ کے عین سامنے والے صوفے پر' اکبر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر خوب مزے سے پھیل کر بیٹھا اور اسے نظروں کی گرفت میں لیا تھا۔

''حرم اپنے چچا کو بتاؤ کہ ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں' خدارا ہمیں جدا نہ کریں اور شادی کی تاریخ دے دیں' تم رضامندی دو گی تو ہی چچا بزرگوار کو یقین آئے گا''۔ وہ بہت بے باکی و بے تکلفی سے بھری محفل میں سب کے سامنے حرم کو مخاطب کر کے بولا۔ حرم کا سر مزید جھک گیا' آنکھیں آنسوؤں سے لبریز

ہوگئیں اور حلق میں گولہ سا اٹکا تھا۔

"بولو بیٹا! کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟" وہ پوچھنا نہیں چاہتے تھے' مگر یہ مجبوری تھی اب وہی حرم کے سرپرست تھے' حرم کی آنکھوں میں بے تحاشہ مناظر گھوم گئے' سب سے تکلیف دہ منظر آخری منظر تھا۔

"بولو ناں؟" یہ آواز اکبر کی تھی دھمکاتی ہوئی۔

"یا تو سزائے موت یا عمر قید' دونوں سزاؤں میں سے ایک قیدی کا نصیب ٹھہرتا ہے' وہ بھی ایسی ہی قیدی تھی جس کی خلاصی کسی صورت ممکن نہ تھی۔ اس نے مجبوراً نا چاہتے ہوئے بھی اپنے لئے سنگین سزا مرتب کی تھی۔ سب اس کی سمت متوجہ تھے اس نے بہت مشکلوں سے سر اثبات میں ہلا کر سارے آنسو گود میں گرا دیئے تھے اس نے سب تو نہیں سوچا تھا' خوابوں کا وہ مہربان شہزادہ تو کوئی اور تھا جو بہت دور تھا۔ اکبر بہت خوش ہوا جیب سے اک مخملی ڈبیا نکال کر کھولی اس میں سے خوبصورت سونے کی نازک انگوٹھی نکالی اور اشفاق صاحب کی طرف بڑھادی ان کے سامنے اس نے خوفزدہ اداس سر جھکائے آنسو ضبط کرتی حرم کے سامنے زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھتے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہنادی' سوائے اکبر کے سب ناخوش تھے اور قدرت کے اس اچانک فیصلے پر حیران' اٹھنے سے پہلے اس نے حرم کی پانیوں سے بھری آنکھوں میں مسکرا کر دیکھا تھا' حرم کی نگاہوں میں باپ کے تڑپنے کا تکلیف دہ منظر لہرایا تھا۔ دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہا مگر وہ ضبط کئے بیٹھی رہی باپ کے بعد وہ اپنے خاندان میں مزید خون خرابا نہیں چاہتی تھی اس کا کیا تھا قربانی دینا تو اب مقدر ٹھہر چکا تھا۔

"میں جارہا ہوں' باقی کے معاملات اماں طے کریں گی"۔ اکبر نے حاضرین کو مخاطب کیا اور فاتح جرنیل کی طرح خوشی سے سرشار لوٹ گیا۔ حرم بھی اٹھی اور اپنے کمرے میں آکر دروازہ لاک کئے خوب روئی تھی۔

☆☆☆☆

"چار دن میں شادی......" وہ اچنبھے میں پڑ گئے۔

"ایسے کیسے ہوسکتا ہے' تیاریاں' سارے انتظامات کیسے ہوں گے؟" اشفاق صاحب ششدر رہ گئے۔

"تیاریوں کی کیا ضرورت ہے' تمام انتظامات میری طرف سے ہوں گے' شادی کا پورا خرچ میں اٹھاؤں گا' حرم کے سوا اور اس گھر سے ایک برتن بھی نہیں جائے گا' یہ ساری خریداری دیکھ لیں' بری کا سامان میں نے سارا پچاس لاکھ کا خریدا ہے' کپڑے' جوتے' زیورات' میک اپ کا سامان' غرض ہر شے ایک سے بڑھ کر قیمتی ہے' اپنی حرم کے لئے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں"۔ لاؤنج سامان سے بھر چکا تھا' جو اکبر اور اس کی ماں لائے تھے' اکبر کی آخری بات پر اشفاق صاحب کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔ سامان کی ظاہری چمک سے لگ رہا تھا کہ وہ کن مشہور کمپنیوں کا قیمتی مال ہوگا' سعد یہ سیماب کی تو آنکھیں ڈیلوں سے نکل آئی تھیں۔

"واہ کیا قسمت پائی ہے حرم نے' یعنی جہیز کا ایک ٹکڑا بھی نہیں لے کر جائے گی' اکبر نے تو لگتا ہے پورے دس سال کی شاپنگ ہی پیشگی کردی ہے"۔ زبیدہ بھی متاثر ہوئی تھیں۔

"ان سب چیزوں کی کیا ضرورت تھی روبینہ بہن' یہ تو ہر بچی کا حق ہوتا ہے میں حرم کا باپ ہوں' اب جو کرنا ہے میں نے ہی کرنا ہے' بہت بری بات ہے کہ وہ میرے گھر سے خالی ہاتھ رخصت ہو' اگر کچھ دن کی مزید گنجائش ملتی تو میں کچھ کر لیتا"۔ اشفاق صاحب نے روبینہ کو مخاطب کیا تھا۔

"ہمیں صرف اپنی بیٹی چاہئے مزید کچھ نہیں' آپ تسلی رکھیں یہ روایتی سسرال والا معاملہ نہیں ہوگا' آپ حرم کے حوالے سے بالکل بے فکر ہوجائیں"۔ روبینہ کی بھی وہی بات تھی۔

''اب وہ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو رہنے دیں' شادی تو کرنی ہے جلد یا بدیر کیا' ہماری حرم بہت خوش نصیب ہے ماشاءاللہ''۔ زبیدہ نے بھی حصہ لیا۔

''ہماری اپنی بھی اولادیں ہیں حرم کی فکر میں ان کا کیا ہوگا' کل کو محتاج ہوں گے''۔

''جیسے آپ کی خوشی''۔ ناچار انہیں ماننا پڑا۔

''حرم! بھئی کہاں ہو' جلدی سے آؤ' تھکے ہارے آئیں ہیں' سارا دن شادی کی شاپنگ میں گزر گیا' خوار ہو گئے آج تو...... چائے پانی لے کر آؤ' کچھ تو تھکن اترے''۔ اس نے حرم کے کمرے کی سمت ہانک لگائی۔

''حرم کا معاملہ نہ ہوتا تو اس بدتمیز بیہودہ شخص کو میں اپنے گھر داخل بھی نہ ہونے دیتا غنڈہ کہیں کا''۔ اشفاق صاحب کو اس کی بے تکلفی کافی کھل رہی تھی۔

''میں ذرا نماز پڑھنے جا رہا ہوں' آپ لوگ بیٹھیئے''۔ انہوں نے روبینہ سے کہا اور باہر چلے گئے۔

''السلام علیکم''۔ حرم نے پاس آ کر آہستگی سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام کہاں تھیں؟ جاؤ جلدی سے کڑک سی چائے اور ٹھنڈا پانی پلاؤ''۔ وہ استحقاق سے حکم دے کر کف اوپر کرنے لگا۔

''جی''۔ وہ پلٹی اور کچن کی سمت رخ کیا۔

''لڑکی...... کیا اپنی ساسو ماں سے نہیں ملو گی' سلام دعا کا شاید تمہارے خاندان میں رواج نہیں''۔ آخری جملے میں اس نے زبیدہ کو دیکھا' یعنی جتلایا تھا۔ وہ روبوٹ کی مانند واپس پلٹی اور روبینہ کو سلام کیا انہوں نے خوب بھینچ کر پیار کیا تھا۔

☆☆☆☆

''اماں! کتنا مزہ آئے گا ناں' ہمارے بھائی کی شادی ہوگی' اللہ یقین نہیں آ رہا''۔ فلک کپڑے پھیلائے بیٹھی' بہت خوش تھی۔

''اماں اس کی سلائی ٹھیک ہے؟'' لائبہ نے ماں کو اپنا سوٹ دکھایا جو وہ بنا رہی تھی۔

''ہاں بہت اچھی ہے''۔ روبینہ کے چہرے سے مسکراہٹ اب اک پل کو جدا نہ ہوتی تھی۔

''حرم اس گھر میں چلتی پھرتی کتنی پیاری لگے گی' میرا تو گھر آباد ہو جائے گا''۔ وہ سرخوشی سے بولیں۔

''اماں! مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ اتنے کم وقت میں بھی بھائی شادی دھوم دھام سے کریں گے''۔ فلک اٹھلا کر بولی۔

''لیکن ہمارا بہت کم وقت بسر ہوگا حرم کے ساتھ''۔ لائبہ افسردہ ہوئی۔

''ایسے نہیں کہتے' اکبر نے تم لوگوں کا خیال کر کے ہی تمہاری شادی سے پہلے اپنی شادی کی تاریخ رکھی کہ بھائی کی شادی دیکھ سکو باقی آنا جانا تو بعد میں بھی لگا رہے گا تم دونوں کون سا شہر سے باہر جاؤ گی''۔ ماں نے ان دونوں کو تسلی دی تھی۔

''اماں سویرا اور سونیا ابھی تک کیوں نہیں آئیں' بھائی کی شادی میں شرکت کا ارادہ نہیں کیا؟'' اکبر نے کمرے سے نکل کر ماں بہنوں کو شادی کی تیاریوں میں مصروف دیکھ کر بڑی بہنوں کی کمی محسوس کی تھی۔

''شام تک چلے جانا کہہ رہی تھیں شادی کے بعد بھی ایک دو دن حرم کے ساتھ ٹھہریں گی تو بچوں کی پڑھائی کا حرج ہوگا' اسی لئے دیر سے آ رہی ہیں' شادی بھی تو اچانک ہی ہے' کچھ تیاری کریں گی''۔

(باقی آئندہ)

# ردا کی ڈائری

## روشنی فاطمہ کی ڈائری سے

### منیر نیازی کی غزل

سارے منظر ایک جیسے، ساری باتیں ایک سی
سارے دن ہیں ایک سے اور ساری راتیں ایک سی
بے نتیجہ، بے ثمر جنگ و جدل سود و زیاں
ساری جیتیں ایک سی، ساری ماتیں ایک سی
سب ملاقاتوں کا مقصد کاروبار زرگری
سب کی دہشت ایک سی سب کی گھاتیں ایک سی
اب کسی اگلے وقتوں کی وفا باقی نہیں
سب قبیلے ایک ہیں اب ساری ذاتیں ایک سی
ایک ہی رخ کے اسیری خواب ہے شہروں کا اب
ان کے ماتم ایک سے، ان کی براتیں ایک سی
ہوں اگر زیر زمیں تو فائدہ ہونے کا کیا
سنگ و گوہر ایک ہیں پھر سب دھاتیں ایک سی
اے منیر آزاد اس سحر یک رنگی سے تو
ہو گئے سب زہر یکساں سب بناتیں ایک سی

## تحسین ساجد کی ڈائری سے

### مشتاق شبنم کی غزل

فضا فریب کی کب تک یونہی بنائے رکھوں
میں کھیلوں آگ سے دامن کو بھی بچائے رکھوں
اس عصرِ نو کہاں تک گلے لگائے رکھوں
کہ درد چھتا رہوں زخم زخم چھپائے رکھوں
یہ کیسا جبر! کہ وہ حرف حرف اسے تسلیم
یہ کیا ستم ہے کہ اپنی نہ کوئی رائے رکھوں
ہوائے شہر وفا تجھ سے دشمنی ہی سہی
میں چاہتا ہوں کہ اپنے دیئے جلائے رکھوں
میں باضمیر ہوں شبنم نہ مجھ سے یہ ہو گا
ستم کی دھوپ ہو اور مصلحت کے سائے رکھوں

## بتول امتیاز کی ڈائری سے

### صدف وکٹوریہ کی نظم

مجھے گمنام رہنے کا کچھ ایسا شوق ہے ہمدم
کسی انجان صحرا میں بھٹکتی دھوپ ہو جیسے
جہاں سائے ترستے ہوں کسی پیکر کی آہٹ کو
جہاں زندہ نہ ہو کوئی
جہاں بس موت رہتی ہو
یا پھر کچھ یوں کہ
صحرا کے کہیں اس پار کہہ کر یہ
کسی چڑیا کے بچے کی تڑپتی پیاس ہو جیسے
جو اڑنے کو ترستے ہوں
مگر
حسرت دم آخر
وہ اپنے گھونسلے میں ہی کچھ ایسے جان دے جیسے
ہزاروں کروٹوں کے بعد مری امیدیں مرتی ہیں
مجھے گمنام رہنے کا کچھ ایسا شوق ہے ہمدم

## مہ جبیں بلال کی ڈائری سے

### غزالہ انجم غزل کی ایک خوب صورت غزل

وصل میں جھوٹی تسلی کے سوا کیا ہو گا
بہت اچھا بہت اچھا بہت اچھا ہو گا

دل افسردہ کا جب حال بیان ان سے کیا
پھول کو مسل کے کہا ہاتھ میں ایسا ہو گا
نگاہِ شوق کی خواہش کو سمجھ لو دل میں
ورنہ دو چار گھڑی بعد تقاضا ہو گا
تم کسی کے نہ ہوئے نہ کسی کے ہو گے
دل کسی کا نہ ہوا ہے نہ کسی کا ہو گا
خوبیاں غزل کی جب اس نے سنی سن کے کہا
کیا غرض ہم کو وہ اپنے لیے اچھا ہو گا

## کرن ناز کی ڈائری سے

### کاشی چوہان کا کلام

میں اپنی کتاب زیست کا
انتساب لکھنا چاہتا ہوں
کیا لکھوں
اب کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں میں
اس لمحہ، تسخیر کے نام
جس نے مجھے تمہارے نام کر دیا
اس حسین شام کے نام
جس کا حسن میرے روم روم میں سما گیا
اس مہربان کے نام
جس کے لیے میں اس سر سبز لان میں
آیا اور پھر
اس لالہ رُخ کی شوخی میں کھو گیا
اُن بولتی ستارہ آنکھوں کے نام
جن میں، میں ایسا ڈوبا کہ
پھر کبھی اُبھر نہ سکا
اس طلسم ہوشربا کے نام
جس کی بھول بھلیوں میں
میں اب تک خود کو ڈھونڈ رہا ہوں
لیکن!
رستہ نہیں ملتا اور
سفر مزید خوب صورت ہوتا جا رہا ہے

یا پھر؟
اس بے نام سی موہوم سے سرگوشی کے نام
جو مجھے تمہارے ہونے کی
اکثر نوید سناتی ہے
انتساب زیست کو
کس کے نام کروں
یہ تو سب تمہارے نام ہے
میری زندگی کی ہر سانس
میری ہر آس میرا ہر گمان
میری پہچان میری ہر امید
میرا یقین، میرا اقرار
میری قید، میری رہائی
میری محفل، میری تنہائی
کیا کیا لکھوں
میرا سب کچھ تم ہی تو ہو
میں اپنا آپ
تم پہ وارتا ہوں
جاؤ
یہ کتاب زیست کا مسودہ
بغیر انتساب کے
تمہارا ہوا

## عمیمہ ظہیر کی ڈائری سے

### سیدہ نور الصبا علی کی خوب صورت نظم

تیرے ہاتھ میں میرا ہاتھ ہو
باتوں باتوں میں دل کی بات ہو
میرا اخیال ہو یا ہو خوش فہمی
بس یونہی مجھ کو چاہتے رہو
پیار کے بندھن میں بندھنا پڑے گا
تمہیں اقرار کرنا پڑے گا
یہ کس نے کہا کہ
دل کو میرے آزماتے رہو ☆☆

# اشعار

سُباس گل ـــــــــ رحیم یار خان

شہرِ دل جب سے اُس نے چھوڑا ہے
آرزوئیں ہی کھو گئیں دل کی
دیکھنا کسی نے دی ہے پھر دستک
دھڑکنیں تیز ہو گئیں دل کی

ثوبیہ جواد ـــــــــ ڈی آئی خان

قید کر دیا سانپوں نے سپیروں کو یہ کہہ کر
انسان ہی کافی ہیں انسانوں کو ڈسنے کے لیے

ایم بے قریشی ـــــــــ ڈی آئی خان

دل پر پانی پینے آتی ہیں امیدیں
اس چشمے میں زہر ملایا جا سکتا ہے

سیما ناصر ـــــــــ ڈی آئی خان

ادھورا سا محسوس کرتی ہوں میں خود کو آج کل
جیسے کوئی چھوڑ گیا ہے مجھے تعمیر کرتے کرتے

اسماء جمشید ـــــــــ ڈی آئی خان

میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشہ نہ بنے
تو سمجھتا ہے کہ مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

سمیع اللہ ـــــــــ ڈی آئی خان

یہ قید سکھا دیتی ہے آداب محبت
پنجرے میں پرندے بھی شرارت نہیں کرتے

نوشی ـــــــــ ڈی آئی خان

غلطی ہم سے نجانے کون سی ہو گئی
لوگ ایسے بھول گئے جیسے جانتے ہی نہیں

زونیہ ـــــــــ ڈی آئی خان

بند مٹھی سے گرتی ریت کی مانند
وہ زندگی سے گیا ذرا ذرا کر کے

ثریا ـــــــــ ڈی آئی خان

کمال کی فنکاری ہے اُس میں
وار بھی دل پہ اور راج بھی دل پہ

بینا سجاد ـــــــــ ڈی آئی خان

سجدوں میں گزار دوں گا اپنی ساری زندگی
بس اک بار وہ کہہ دے کہ مجھے خدا سے مانگ لو

اقصیٰ ـــــــــ ڈی آئی خان

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک پہنچی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

غزالہ طاہر ـــــــــ سرگودھا

اسی میں خوش ہوں میرا دکھ کوئی تو سہتا ہے
چلی چلوں گی جہاں تک یہ ساتھ رہتا ہے
میرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے

عنبرین وسیم ـــــــــ گوجرانوالہ

رستہ کہاں سورج کا کوئی روک سکا ہے
ہوتی ہے کہاں رات کے زنداں میں سحر بند

نکہت آصف ـــــــــ اسلام آباد

ہم شہرِ بے وفا میں وفا ڈھونڈتے رہے
حیرت میں اِک جہاں ہے کہ کیا ڈھونڈتے رہے

لمحوں میں کر گیا تھا جو برباد بستیاں
ہم مدتوں وہ دستِ قضا ڈھونڈتے رہے

مہرین ناز ________ کمالیہ

تصور تیرا جو مجھے چھو جائے
میری ہر سانس سے تیری خوشبو آئے
یہ کس موڑ پر لے آئی ہے جستجو
پانی میں عکس میرا ہو اور نظر تو آئے

نازیہ فرقان ________ اسلام آباد

آدمی زینۂ افلاک پہ چڑھ سکتا ہے
اور کچھ چاہے تو کچھ اور بھی بڑھ سکتا ہے
دل کو آئینے کے مانند اگر صاف رکھے
لوحِ محفوظ کی تحریر بھی پڑھ سکتا ہے

صائمہ عطا ________ حیدر آباد

روز تاروں کی نمائش میں خلل پڑتا ہے
چاند پاگل ہے اندھیرے میں نکل پڑتا ہے
ان کی یاد آتی ہے اے سانس ذرا آہستہ چل
دل کے دھڑکنے سے عبادت میں خلل پڑتا ہے

ناہید خان ________ کوئٹہ

اکثر اس سوچ میں رہتی ہوں
کیوں غم اور صدمہ سہتی ہوں
جب پیار کی لہریں اٹھتی ہیں
تو شعر غزل کے کہتی ہوں

ایم حسن نظامی ________ کراچی

چاہتوں کے پھول دل میں سجا کر
دلوں کے غنچے کھلاتی ہے بلبل
پیار کی خوشیاں پوچھو حسین سے
میرے من کو کیسے بہلاتی ہے بلبل

عمارہ لطیف ________ لاہور

جب کشتی اس کے ہاتھ میں ہو
میں ندیا بن کے بہتی ہوں
تصویر ادھوری چھوڑی جو
رنگ اس میں بھرتی رہتی ہوں

زاہدہ خالق ________ کوہاٹ

اداس راتوں میں تیز کافی کی تلخیوں میں
وہ کچھ زیادہ ہی یاد آتا ہے سردیوں میں
مجھے اجازت نہیں اسے پکارنے کی
جو گونجتا ہے لہو میں سینے میں دھڑکنوں میں

نجمہ نعیم ________ کراچی

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجب حال تھا جب اس سے ہو رہے تھے الگ
خیال ان کا بھی آیا تجھے جاناں
جو تجھ سے دور بہت دور جی رہے تھے الگ

نادیہ رئیس ________ کراچی

نہ تھا مسئلہ کسی جیت کا نہ ہی ہار کی کوئی بات تھی
تیرے اعتبار کا معاملہ تیرے اختیار کی بات تھی
کوئی جستجو بھی نہ رہی مگر اب سکون بھی نہ رہا
وہ جو بے قراری دے گئی وہی تو قرار کی بات تھی

شہر بانو ________ لیہ

اس کی یاد جیسے دسمبر کی سردی محسن
بس بڑھتی ہی چلی جارہی ہے

شبانہ زبیر ________ لیہ

روش قہر پہ گر چپ رہے یہ ارض و سما محسن
تو کسی روز یہ بے رنگ خلا بولے گا

نور بانو ________ کوئٹہ

کیا ضروری ہے ہاتھوں میں تیرا ہاتھ بھی ہو
چند یادوں کی رفاقت ہی بہت کافی ہے
لوٹ چلتے ہیں اس پل سے گھروں کی جانب
یہ تھکن اتنی مسافت ہی بہت کافی ہے

......☆......

# اس ماہ میں

## اس ماہ کا قطعہ

اِس وطن کی جس قدر بھی ہو سکے
جان و دل سے قدر کرنی چاہیے
وقت گر چاہے تو پھر کل کی طرح
جان اس کی نذر کرنی چاہیے

راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

## اس ماہ کے سنہرے موتی

☆ محبت کی پہلی شرط عزت ہے جو عزت نہیں دے سکتا سچا پیار بھی نہیں دے سکتا۔

☆ پانی اور نماز دونوں ایک سے ہیں:
(i) پانی محتاج نہیں پینے والوں کا۔
(ii) نماز محتاج نہیں پڑھنے والوں کی۔
دونوں کے لیے پیاس ضروری ہے۔
(i) پانی جسم کے لیے۔
(ii) نماز روح کے لیے۔

☆ سچی دوستی میں انسان بہت کمزور ہو جاتا ہے اور بہت مضبوط بھی۔
(i) مضبوط اتنا کہ دنیا سے لڑ جاتا ہے۔
(ii) کمزور اتنا کہ صرف ایک انسان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

☆ تم دنیا میں ہر کسی سے جیت سکتے ہو مگر اس سے نہیں جیت سکتے جو تمہارے لیے جان بوجھ کر ہار جائے۔

☆ میں اور میرا رب روز بھول جاتے ہیں۔
(i) میں اس کی عطاؤں کو۔
(ii) وہ میری خطاؤں کو۔

سعدیہ جواد۔ لیہ

## اس ماہ کی مزاحیہ نظم

### گھر داماد

تمہارے ہی ماں باپ کی سہولت ہے
گھر داماد اس صدی کی ضرورت ہے
تیرے ہی گھر عمر گزار دوں
دیکھ! تجھ سے کتنی محبت ہے
شادی کر کے خرچہ بھی اٹھاؤں
مجھے پڑی ایسی کیا مصیبت ہے
میں خود ہی تمہارے یہاں آ جاتا ہوں
ویسے بھی جہیز اک لعنت ہے
کہاں ہر مہینے پہلی کا انتظار کرو گی
تمہارے ابا کے بینک میں برکت ہے
سینا پرونا بھی کچھ سیکھ رکھا ہے
بڑوں کی خدمت ہی میری عادت ہے
اگلے گھر جا کر عزت رکھنا ہماری
ماں باپ کی یہی نصیحت ہے
اب مان جاؤ! وقت ضائع نہ کرو
خوبرو داماد کی بڑی قیمت ہے
بتاؤ کس دن بارات لے کر آؤ گی

فیصل کو ودائی کی بڑی چاہت ہے
(فیصل خالد)

انتخاب: ریمانور رضوان۔ کراچی

ہمارے حصے کی نہ ہوں انہیں ساری دنیا مل کر بھی ہماری کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

## اس ماہ کی غزل

میں چاہنے والوں کو مخاطب نہیں کرتا
اور ترکِ تعلق کی میں وضاحت نہیں کرتا
میں اپنی جفاؤں پر نادم نہیں ہوتا
میں اپنی وفاؤں کی تجارت نہیں کرتا
خوشبو کسی تشہیر کی محتاج نہیں ہوتی
سچا ہوں مگر اپنی وکالت نہیں کرتا
احساس کی سولی پہ لٹک جاتا ہوں اکثر
میں جبر مسلسل کی شکایت نہیں کرتا
میں عظمتِ انسان کا قائل تو ہوں محسن
لیکن کبھی بندوں کی عبادت نہیں کرتا
(محسن نقوی)

ایم۔ جے قریشی۔ ڈی آئی خان

اس ماہ کے فلسفے

## نیکی کی شاخیں!

نیکی کی دو شاخیں ہوتی ہیں ایک خدا سے عاجزی اور محبت کا رشتہ بنانے کی طرف لے جاتی ہے، اس کی مخلوق کی خیر خواہی پر ابھارتی ہے اور دوسری دل میں اپنی نیکی کا گھمنڈ پیدا کرتی ہے۔ انسان سے دور کرتی اور صرف اپنی بڑائی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ انسان بھی عجیب شے ہے، بعض اوقات اس کی نظر میں وہ چیز بالکل بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہے جس کے لیے وہ ساری زندگی جدوجہد کرتا ہے جو محبتیں ہمارے نصیب میں لکھی ہوں، دنیا کی کوئی طاقت انہیں ہم سے نہیں چھین سکتی، وہ ہمیں ضرور ملتی ہیں اور جو محبتیں

## تعریف و توصیف

بدقسمتی سے ہمارے یہاں آدمی کے چلے جانے کے بعد اس کی تعریف ہوتی ہے اگر اب لاہور کے سب سے بڑے قبرستان میں جا کر دیکھیں تو بہت سے کتبے آپ کو ایسے نظر آئیں گے جن کے اوپر مرحوم کا نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات لکھی ہوگی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ توصیفی کلمات بھی ہوں گے۔ اب وہ بے چارہ باہر نکل کر تو نہیں دیکھ سکتا کہ کتبے پر کیا لکھا ہے۔ یہ تو اس کے کام نہیں آیا۔ بہتر یہی تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے تعریف و توصیف ہو جائے تو اس کو سہارا ہو۔ اس کو پتا چلے کہ میرے ارد گرد رہنے والے لوگ جو ہیں وہ بہت تقویت عطا کرنے والے لوگ ہیں۔ (اشفاق احمد: زاویہ صفحہ: 69)

ظہیر الدین۔ کراچی

## موت

دنیا کے انسانوں پر جو سب سے بڑا حادثہ اور سب سے بڑی مصیبت آنے والی ہے وہ موت ہے اور انسانی فطرت ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی آفتوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ منصوبے بناتا ہے۔ کل کی سوچ رکھتا ہے۔ کتنے ارمانوں سے انسان گھر بناتا ہے اور پھر خاموشی سے چھوڑ کے لوگوں کے کندھے پر سوار ہو کر اندھیر کوٹھڑی (قبر) میں جا کے سو جاتا ہے۔ اسپین سے کمبل منگوائے تھے سونے کے لیے پانچ برس بھی سونے نہ پائے تھے کہ ہمیشہ کے لیے مٹی کی چادر اوڑھ

کے سو گیا۔ بڑے سائز کے خوب صورت ڈیزائن کے پلنگ بنوائے اور جب اٹھے تو ایک پل میں اٹھ کے چلے گئے اور جا کر مٹی کے بستر پر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ تو جس انسان کا یہ حسرت۔ ک انجام ہو کہ موت اس کی شکاری ہو۔ آفات کے پھندے اس کے چاروں طرف قائم کیے جا چکے ہوں۔ غموں کے بادل بھی اس کے افق سے ہٹتے ہی نہ ہوں۔ مصیبتوں کی کھائیاں قدم قدم پر اس کے لیے کھودی گئی ہوں۔ خوشیوں کی کرن بجلی کی چمک کی طرح آ کے گزر جاتی ہو۔ پریشانیوں اور تفکرات کے سمندروں میں ڈوبا ہوا ہو اور بیماریاں اس کے ساتھ اپنا کردار ادا کر رہی ہوں۔ دوستوں کی بے وفائیاں، اولاد کی نافرمانیاں اس کے دل پر نشتر چلا رہی ہوں اور قبر اسے روزانہ پکار رہی ہو۔ میں تنہائی کا گھر ہوں۔ میں اندھیرے کا گھر ہوں میں کیڑے مکوڑوں کا گھر ہوں۔ میرے پاس آنا ہے تو کوئی زادِ راہ لے کے آنا۔ اس ناپائیدار زندگی کے لیے اپنے آپ کو بیچ دینا بہت بڑی ہلاکت ہے۔ عقل مند وہ ہے جو موت سے پہلے موت کی تیاری شروع کر دے۔

فلک شیر تابش۔ رحیم یار خان

## اس ماہ کے لطیفے

امتحان میں فیل ہونے کے بعد ایک لڑکے نے گھر جانے سے پہلے بہن کو فون پر کہا۔ ''میں فیل ہو گیا ہوں میرے آنے سے پہلے ابا کو تیار کرلو۔''

بہن نے کہا۔ ''ابا کو اطلاع مل چکی ہے اپنے آپ کو تیار کرلو۔''

☆

چور کی بیوی۔ ''گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے۔''

چور غصے سے بولا۔ ''لے آؤں گا پہلے دکانیں تو بند ہونے دو۔''

☆

مجسٹریٹ نے چور لڑکے کے باپ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''آخر تم اپنے لڑکے کی اصلاح کیوں نہیں کرتے اسے کیوں نہیں بتاتے کہ درست راستہ کیا ہے چور لڑکے کے باپ نے جواب دیا۔ ''جناب میں نے اس کو بہت دفعہ سمجھایا اور تربیت دی لیکن ایسا بے وقوف ہے کہ ہر دفعہ ہی پکڑا جاتا ہے۔''

☆

ایک وکیل دوسرے سے۔ ''تم نے دیکھا میں نے ایک شخص کو جعلی کرنسی کے مقدمے سے بری کروا دیا لیکن اس نے میرے ساتھ کیا کیا۔''

دوسرے وکیل صاحب نے پوچھا۔ ''کیا کیا؟''

پہلے وکیل نے جواب دیا۔ ''وہ مجھے فیس میں جعلی کرنسی ہی دے گا۔''

پلوشہ خان۔ پشاور

## اس ماہ کی پیاری بات

دل میں محبت اور چہرے پر ناراضی دوسروں کو بہت اذیت میں مبتلا کرتی ہے۔ اکثر ناراضی بھانپ کر رخ بدل کر چھوڑ جاتے ہیں اور زندگی بھر دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا اگر محبت ہو تو دل میں بھی اور چہرے پر بھی محبت کے آثار رکھو جو دوسروں کی خوشی کا باعث بنے اور وہ ہزاروں سال آپ کو بھول نہ پائیں۔

ایم یعقوب۔ کراچی

......☆......

# خوشبو

## سچ کے احکامات قرآن پاک کی روشنی میں

☆ جنتی وہ ہیں صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور فرمانبردار اور خرچ کرنے والے اور صبح کے وقتوں میں معافی مانگنے والے۔

(پارہ 3، سورۃ آل عمران)

☆ اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

(پارہ 28، آیت نمبر 3 سورۃ الصف)

روشنی فاطمہ۔ کراچی

## نعتیہ قطعہ

سرکارؐ کے دربار میں بیٹھا ہوں ادب سے
فریاد کناں ہوں میں یہاں اور ہی ڈھب سے
احوال میرا رُو کے سنائیں میری آنکھیں
کہنے ہی نہیں دیتیں مجھے کچھ اور میرے لب

راؤ تہذیب حسین تہذیب

## اسلام میں بیٹی کی اہمیت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عورت کے لیے یہ بہت مبارک ہے کہ اس کی پہلی اولاد لڑکی ہو۔

جس شخص کی بیٹیاں ہوں اس کو برا مت سمجھو اس لیے کہ میں بھی بیٹی کا باپ ہوں۔

جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ اے لڑکی! تو زمین میں اتر میں تیرے باپ کی مدد کروں گا۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

## دعا

نصیب سے زیادہ قیمتی دعا ہوتی ہے کیونکہ جب زندگی میں سب کچھ بدل جائے تب انسان کے پاس دعا ہی بچتی ہے جو نصیب بدل دیتی ہے۔

مصباح مسکان، روؤف، ایمن روؤف۔ جہلم

## کام کی باتیں

☆ بڑی چیز حاصل ہو جانے سے چھوٹی چیز کو کبھی نہ بھولیں کیونکہ جہاں سوئی کی ضرورت ہو وہاں تلوار کام نہیں آئے گی۔

☆ ایک بچے نے اپنی ماں سے پوچھا کہ ماں میں کب اتنا بڑا ہو جاؤں گا کہ میں آپ سے پوچھے بنا کہیں بھی آ جا سکوں گا۔ قربان جاؤں اس عظیم ماں کے جس نے بہت پیارا جواب دیا کہ بیٹا اتنے بڑے تو ابھی آپ کے ابو بھی نہیں ہوئے۔

☆ اگر انسان اپنی انگلیوں کا استعمال اپنی ہی غلطیوں کو گننے کے لیے کرے تو دوسروں پر انگلی اٹھانے کا وقت ہی نہیں ملے گا۔

☆ اچھا دوست سفید رنگ کی طرح ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ رنگ ہر رنگ کو بنا سکتا ہے لیکن سب رنگ مل کر سفید رنگ نہیں بنا سکتے۔

شازیہ تبسم۔ گجرات

## حفظ ماتقدم

ایک صاحب نہایت کم گو واقع ہوئے تھے۔ خصوصاً سفر کے دوران وہ بالکل خاموش رہنا پسند کرتے تھے۔ ایک بار وہ ٹرین کے ذریعے کراچی سے لاہور جا رہے تھے۔ ٹرین روانہ ہوئی تو ان کے برابر بیٹھے ہوئے صاحب نے سفر کی عمومی روایات کے مطابق بات چیت کا آغاز کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ لاہور جا رہے ہیں؟“

”جی ہاں! میں لاہور جا رہا ہوں۔ پیشے کے اعتبار سے میں الیکٹریکل انجینئر ہوں اور ان دنوں ایک کارخانے میں ملازم ہوں۔ میرے تین بچے ہیں دو کی شادی ہو گئی ہے۔ ایک بیٹا پڑھ رہا ہے۔ میری عمر 58 سال کے قریب ہے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ والد صاحب کا بھی کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ وہ بزنس مین تھے۔ مکان میرا ذاتی ہے۔ ہمارا خانساماں پچھلے دنوں بھاگ گیا ہے۔ مالی ہمارے ہاں پارٹ ٹائم آتا ہے۔ میں نے ابھی اپنی گاڑی سی این جی پر نہیں کرائی۔ سبزی، گوشت اور سودا سلف وغیرہ میں خود نہیں لاتا لیکن میں آپ سے متفق ہوں کہ مہنگائی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اس ٹرین سے سفر کرنے کا مجھے کوئی تجربہ نہیں لیکن سنا ہے کہ یہ چین سے منگوائی گئی ہے۔ پہلے یہ بہت اچھی ہوا کرتی تھی مگر اب اس کا بھی بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ میرے ایک بھتیجے کے بال جوانی میں ہی گر رہے ہیں۔ جوڑوں کے درد اور بلڈ پریشر کی دواؤں کے نام مجھے معلوم نہیں۔ میں کراچی میں رہتا ہوں۔ امید ہے میرے بارے میں آپ کو مزید کچھ پوچھنا اور جاننا نہیں ہوگا۔ ایک سانس میں ان صاحب نے یہ سب کچھ کہہ کر سیٹ پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

## سکون

غم کی بارش برس رہی ہے
سکون دل کو بچائے رکھنا

سکون کتنا خوب صورت ہوتا ہے۔ بکھرے وجود کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اس کی آغوش میں شفقت کا لمس، روحانیت بخشتا ہے۔ اس کے چند لمحے بھی امر ہوتے ہیں۔ ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے جب روٹھ جاتا ہے تو روح ریزہ ریزہ ہو کر ویرانوں میں بھٹکنے لگتی ہے۔ کاش اسے کوئی ہمیشہ کے لیے پالے۔

مرسلہ: فرزانہ شوکت۔ کراچی

## محبت

محبت ایک آکٹوپس ہے جو انسان کو اپنے اندر پورا کا پورا جکڑ لیتا ہے۔ محبت روح تو ہے نظر تو نہیں آتی محسوس ہوتی ہے۔ درد ایسا ہے کہ انسان کو ساری عمر تڑپاتا رہتا ہے۔ سچ ہے انسان اپنا پہلا پیار کبھی نہیں بھولتا۔ وہ زندگی میں آگے بڑھ جاتا ہے۔ ترقی کرتا ہے، ہنستا ہے، بولتا ہے مگر اس کے دل میں اس کا محبوب رہتا ہے جو جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ انسان کو قدم قدم پر اپنا پہلا پیار یاد آتا ہے۔ وہ ہنستا ہے تو اس

کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر انسان خوش ہے۔ بہت سے لوگوں کی مسکراہٹ میں غم چھپا ہوتا ہے جو ہر کسی کو نظر نہیں آتا۔ محبت کرنے والے لوگ تحمل سے کام لیتے ہیں۔ بڑے سے بڑے غم کو اپنے سینے میں بند کر لیتے ہیں۔ محبت آفاقی جذبہ بھی کہلاتا ہے جو ہر انسان کے دل میں پنپتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کو لبھاتے ہیں اور بہت سے اس کو زیادہ کرتے ہیں۔ محبت اکثر اس لیے ضائع ہو جاتی ہے، ہم اس کو غلط ہاتھوں میں سونپ دیتے ہیں۔ محبت اندھا کر دیتی ہے۔ انسان کو جب محبت سر چڑھ کر بولتی ہے تو انسان میں سوچنے سمجھنے کی بھی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ لوگ جذبات کی رو میں بہہ کر غلط فیصلے کرتے ہیں بعد میں پچھتاوے کی آگ میں ساری عمر جلتے رہتے ہیں۔ جب کسی کو کسی سے شدت سے محبت ہو جاتی ہے تو دوسرے دل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ سچ ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ محبت چل پڑتا ہے۔ محبت ملتی ہے، دی جاتی ہے، خریدی نہیں جاسکتی۔ یہ کب کہاں ہو جائے پتا نہیں چلتا۔ جب چین سکون لوٹ جاتا ہے جب محسوس ہوتی ہے۔ درد بھی ہے مگر محبت کا درد ہر احساس سے اچھا ہوتا ہے۔ محبت کرنے سے انسان میں نکھار آتا ہے اور انسان جینا بھی سیکھ جاتا ہے۔ محبت میں یہ قباحت ہے کہ جس سے محبت ہو جائے اسے آسانی سے بھولا نہیں جاتا۔ کیونکہ بھولنے سے دل کو بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ میری دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ رب پاک سب کی پاکیزہ محبت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچائے۔

سمیرا بنت یوسف۔ کراچی

## انمول موتی

☆ خواہش کے نصیب میں تکمیل کہاں کچھ آرزوئیں اختیار سے باہر ہوتی ہیں نہ کوئی انت ہوتا ہے نہ حد کہ انسان گھوم پھر کر تھک ہار کر بیٹھ تو سکتا ہے لیکن تمناؤں کے سرے ہاتھ نہیں آتے۔

☆ محبتیں مارتی نہیں انسان کو زندہ رہنے پر اکساتی ہیں۔ زندگی بخشتی ہیں ان کے کھو جانے کا ڈر تو روگ بن کر جان کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔

☆ کچھ لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں انہیں خبر ہوتی ہے کہ ان کی جھولی میں کوئی صرف کانٹے ڈال کر جا رہا ہے پھر بھی کچھ نہیں کہتے یا شاید جنہیں چاہا جائے ان سے شکوہ کیا ہی نہیں جاتا۔

حنا علی۔ سیالکوٹ

## موسم

موسم جانے کیوں دل کی بستی سے جڑے ہوتے ہیں۔ گہرے موسم ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان جس لے پر دل دھڑکتا ہے۔ موسم بھی ویسے ہی پلٹا کھاتے ہیں۔ کبھی بہار اور کبھی پت جھڑ...... اور کبھی!!

عروج موسم، زوال موسم
عجب ہیں زندگی میں بے شمار موسم
ہر سو جو پھیلی ہو رشتوں کی مہک
کیا خوب ہوتے ہیں وہ بہار موسم
طویل مسافتوں کے بعد جو آتی ہے منزل
کرتے ہیں جی بھر کر سرشار موسم
گھروں سے پنچھی جب اڑ جاتے ہیں
تو لوٹ آنے کا کرتے ہیں انتظار موسم
یادوں کی نگری میں جھانکا تو کر گئیں آنکھیں نم
سحر کرتے ہیں اکثر یونہی بے اختیار موسم

ثمرین عزیز۔ کراچی

☆

# ذرا پھر سے کہنا

## غزل

تیری تصویر کو آنکھوں میں سجانا چاہوں
دل کی دھڑکن میں تیری یاد بسانا چاہوں
فاصلے بڑھتے ہیں پر آج ملو گے مجھ سے
گزری باتیں ہیں جو تجھ کو سنانا چاہوں
کتنے اشک ہیں جو آنکھوں پر دھرے رہتے ہیں
خود ڈھلکتے ہیں انہیں جتنا چھپانا چاہوں
پھر سے ہو جائے میرا جشنِ تباہی ہم دم
مدتوں بعد میں خود کو رلانا چاہوں
اے میرے دوست میری زیست سے آنکھ نہ چرا
ایک ذرا ٹھہر میں کچھ زخم تجھے دکھانا چاہوں
اس کو یہ زعم کہ وہ جیتنا چاہے مجھ سے
مجھ کو یہ ضد کہ خود کو ہرانا چاہوں

شہلا گل سحر

## سلام

دکھے ہوئے دل ہیں میرا مذہب میرا عقیدہ
دُکھے ہوئے دل
مرے حرم ہیں، مرے کلیسا، میرا شوالے
دُکھے ہوئے دل
چراغ میرے، گلاب میرے
دکھے ہوئے دل
کہ روشنی بھی ہیں اور خوشبو بھی زندگی کی
دکھے ہوئے دل
کہ زندگی کا عظیم سچ ہیں
دکھے ہوئے دل
جہاں کہیں ہیں
دکھے ہوئے دل میرا دل ہیں
دکھے ہوئے دلوں کو سلام میرا

فرزانہ شوکت

## نظم

تیرے ہاتھ میں میرا ہاتھ ہو
باتوں باتوں میں دل کی بات ہو
میرا خیال ہو یا ہو خوش فہمی
بس یونہی مجھ کو چاہتے رہو
پیار کے بندھن میں بندھنا پڑے گا
تمھیں اقرار کرنا پڑے گا
یہ کس نے کہا ہے کہ!!
دل کو میرے آزماتے رہو

زرده وصمان

## نظم

زندگی کیا ہے؟
تیرا مسکرانا زندگی ہے
خوشی کیا ہے؟
تیرا آنا خوشی ہے
انتظار کیا ہے؟
اک موت
اور موت کیا ہے؟
تیرا جانا موت ہے

زندگی کی موت ہر خوشی کی موت
اور
میری موت

ثناء کنول اللہ دتہ

## غزل

سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے بہاروں کا
کس نے مقام پر کھا ہے تاروں کا
حوصلہ دیتے ہیں آج کل یار بھی
وہ پہلے سا جلوہ نہ تھا نظاروں کا
یادوں کے سفر میں ہمیشہ سے تھا تنہا
بیگانوں سے پوچھ لیتا ہوں ستم رہگزاروں کا
ہاتھ ملا کے بھی لوگ چھوڑ جاتے ہیں یہاں
زندگی رستہ ہے پھر سے خار زاروں کا
بے رخی سے تیری یہ زخم ملے ہیں ہم کو
وہ پہلے سا جذبہ نہیں رہا اب سہاروں کا
قسمت میں اپنی کچھ آنسو اور آہیں ہیں جاوید
موسم بدل گیا ہے آج پھر سے شراروں کا

محمد اسلم جاوید

## ہائیکو!

ہے وہ ہی قاتل
اس کے چاند سے چہرے پر
ننھا سا اک تل

☆

لگتی ہیں پیاری
سانولی، گوری یا کالی
لڑکیاں ساری

☆

نازک ہیں کتنی
چھو لو تو اڑ جائے رنگ
تتلی اور لڑکی

☆

خشک نہ ہو پانی
مر جائیں گے ہم سے قبل
مینڈک اور مچھلی

☆

اے شاخ زیتون
تیری خاطر دیں گے ہم
اک اک قطرہ خون

☆

مل لینا مت بھول
مژدہ ہیں بہاروں کا
باداموں کے پھول

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

## غزل

مٹی کے خدا کی کبھی تعظیم نہ کرنا
دل جس کو نہ مانے اسے تسلیم نہ کرنا
دنیا سے مری ذات کا انداز جدا ہے
تم میرے خیالات میں ترمیم نہ کرنا
یہ حق ہے ترے چاہنے والوں کا مری جان
غیروں میں محبت کبھی تقسیم نہ کرنا
انسان کی عظمت ہے فقط علم و ہنر سے
دنیا کی نذر جذبۂ تعلیم نہ کرنا
مل جل کے رہو گے تو سدا شاد رہو گے
فرقوں میں کبھی قوم کو تقسیم نہ کرنا
ہر شخص کو ملتی ہے کہاں درد کی دولت
یہ نام کسی اور کے اقلیم نہ کرنا
تعلیم جو اسلام سے کرتی ہے بغاوت
تسلیم نہ کرنا اسے تسلیم نہ کرنا

حکیم خان حکیم

## اُردو ماہیا

لو بادل گھر آئے
دور گئے ساجن دل کیسے سکوں پائے
جب چاند نکل آئے
ان کا حسیں چہرہ آنکھوں میں سما جائے
یہ کھلتی ہوئی کلیاں
تجھ بن سونی لگیں اس شہر کی سب گلیاں
خوشبو ہے گلابوں کی
تیرا حسیں چہرہ تعبیر ہے خوابوں کی
یہ شوخ ادا تیری
بھول نہ پاؤں گا ظالم میں جفا تیری
مستی ہے شرابوں کی
تیرا بچھڑ جانا صورت ہے عذابوں کی
تم پیار نبھا سکتے
توڑ کے سب رسمیں مجھے ملنے کو آ سکتے
بے تاب سا رہتا ہوں
ہجر کے صدموں کو چپ رہ کر سہتا ہوں
ریاض حسین قمر

## ضروری بات

سنو بیٹی!
مجھے تم سے ضروری بات کہنی ہے
تمہیں معلوم ہے بیٹی
تمہارا باپ شاعر ہے
کہ جس نے عمر بھر الفاظ کے سکے کمائے ہیں
وہی سکے جو اس بازار میں چلتے نہیں
جس میں سبھی ایسی دکانیں ہیں
جہاں کاغذ کے ٹکڑوں کے عوض
کچھ خواب بکتے ہیں
جہاں پر بیٹیوں کے قیمتی ارمان بکتے ہیں
سنو بیٹی!
تمہارے خواب اور ارمان
ان لفظوں کے سکوں سے خریدے جا نہیں سکتے
جو میرا کل اثاثہ ہیں
سنو بیٹی!
تمہارا باپ شاعر ہی نہیں
مجرم بھی ہے
جس نے وہ سب سکے کمائے ہیں
جو دنیا کے کسی بازار میں بھی چل نہیں سکتے
خوشی میں ڈھل نہیں سکتے!
سنو بیٹی!
مرا اے کاش! لفظوں سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا
میں منڈی میں تجارت کر کے
وہ کاغذ کماتا
جو ہر اک ارمان
ہر اک خواب کی قیمت چکا سکتے
تمہارا گھر سجا سکتے
تمہیں دلہن بنا سکتے
سنو بیٹی!
مجھے تم سے ضروری بات کہنی ہے
جبار واصف

## سیاستدان

ستارے توڑ لانے کی
فلک پہ گھر سجانے کی
تمہارے اک اشارے پر
جہاں کو بھول جانے کی
یہ باتیں خوب صورت ہیں، مگر جاناں
یہ باتیں جو بھی کرتا ہے، وہ عاشق ہو نہ ہو لیکن
سیاستدان ہوتا ہے
سید بشارت شاہ

# سندیسے

**رابعہ افضال خان ـــــ کراچی**

ڈھیر ساری محبت کی خوشبو، نیک تمناؤں اور پرخلوص دعاؤں کے موتیوں سمیت دستک دیتا سلام محبت۔ پیاری سی صالحہ آپی کیوٹ سی نورین ملک، ڈیئر رائٹرز و قارئین اینڈ ردا اسٹاف کی خدمت میں سلام حاضر ہے۔ قبول کیجیے۔ اب بات کرتے ہیں اکتوبر کے ردا کے ٹائٹل گرل کے روپ میں کیوٹ سی رانیہ خان سادہ سے ہیئر اسٹائل اور ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ بہت پیاری لگی۔ ''گوشۂ آگہی'' میں صالحہ آپی کے بکھرے لفظوں کو بغور پڑھا اور یادداشت میں محفوظ کرلیا۔ ''ردائے جنت'' ہمیشہ کی طرح بے مثال تھا۔ عروہ سے ملاقات دلچسپ رہی۔ اب آتے ہیں سلسلے وار ناولز کی طرف ''صحراؤں کی گلیوں میں عشق'' قمروش جی آپ کے ناول کی دوسری قسط نے تو دل میں اودھم مچادیا۔ دل کررہا تھا بس پڑھتے ہی جائیں لیکن باقی آئندہ کے الفاظ منہ چڑا رہے تھے۔ ''دیدۂ عبرت نگاہ'' روشانے آپ کا ناول بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ ''زندگی پھول، محبت، خوشبو'' شازیہ جی آپ کے ناول کی قسط دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ آپ کا ناول بھی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ مکمل ناولز میں ''ہمیں مار گئی تیری چاہ پیا'' فریدہ فرید فنٹاسٹک یار بہت خوب صورتی سے آپ کا ناول اختتام پذیر ہوا۔ آپ کا یہ ناول میں ہمیشہ یاد رکھوں گی پرسٹی مجھے بہت پسند آیا ہے۔ ''کوہِ عشق'' ثناء ناز کتنے مزے سے سبک روی سے پڑھتے آگے کی طرف دوڑتے جارہے تھے کہ باقی آئندہ دیکھ کر بریک لگانا پڑا۔ ناولٹ میں ''اعتبار محبت'' عائشہ فاروق نے بھی بہت اچھی تحریر لکھی۔ ''رشتوں کی ڈور'' مریم شیراز نے بھی رشتوں کی اہمیت کو بہت خوب صورتی سے واضح کیا۔ افسانوں میں ''ہے محبت کی گواہی کافی'' فاطمہ خان نے اچھا لکھا۔ ''اداسی پیراہن اپنا'' قرۃ العین کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ ''زندگی کے رنگ'' عائشہ ذوالفقار نے زندگی کے رنگوں کو اپنے انداز میں واضح کیا۔ اچھا لگا۔ ''جسے چاہا تھا'' مریم فاطمہ کی تحریر بھی اچھی تھی۔ ''سوتیلی'' جویریہ بانو کی تحریر نے حقیقت کو بڑی خوب صورتی سے واضح کیا ہے۔ ''زرد پتوں کا موسم'' حنا اصغر اندھا بھروسا یوں ہی کبھی بھی انسان کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ ''قربانی ذاتِ نمو انسانیت'' فرح ناز کی تحریر بھی اچھی لگی۔ ''خوشبو کا حصار'' حورینہ سعد نے بھی اچھا لکھا۔ ''ردا کی ڈائری'' سے مہوش جواد کی ڈائری سے نوشی گیلانی کا کلام آسیہ علی کی ڈائری سے محسن نیازی کا کلام بہت اچھا لگا۔ ''اشعار'' سب ہی اچھے تھے۔ ''اس ماہ میں'' اس ماہ کے اقوال بہت اچھے لگے۔ اس ماہ میں بیٹیوں کے لیے پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ سچ ہی ہے بیٹیاں تو ہوتی بہت اچھی ہیں۔ ''خوشبو'' میں لکھا ہر لفظ گلاب کی مانند مہکتا ہوا تھا۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں سب ہی کا کلام بہت اچھا لگا مگر میں نے دیکھی تو نہیں کربلا نظیر فاطمہ نمبر لے گئیں۔ بہت اچھا کلام تھا۔ ''سندیسے'' کی محفل میں سب ہی خوب

سے خوب تر رونق بکھیرتے نظر آتے ہیں۔
"دوستوں کے نام پیغام" میں سب کے پیغام اچھے لگے۔ ڈیئر ثناء ہم آپ کے لیے دل سے دعا گو ہیں کہ اللہ آپ کو ڈھیروں ڈھیر خوشیاں عطا کرے، آمین۔ "کچن" میں نظر آئی تمام ڈشز ہی مزے دار تھیں۔ "سنگھار" میں بھی بہترین ٹپس تھیں۔ سوئیٹ سی فرینڈ فریدہ فرید، صبا عبدالغنی، حافظہ مون شاہ کہاں غائب ہو؟ یار آئی مس یو مائی فرینڈز اگر بھول گئی ہیں تو میں اتنی آسانی سے بھولنے ہرگز نہیں دوں گی۔ اوکے ردا کے لیے دل کی تمام تر گہرائیوں سے دعا ہے کہ اللہ ردا کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی سے ہمکنار کرے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو ہمارے اس پیارے سے پاکستان کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ اس کے ساتھ ہی اپنی سسٹر کیوٹ سی سوئیٹی سی (ہاہاہا) رابعہ افضال کو اجازت دیجیے، اللہ نگہبان۔"

**زاھدہ ھاشمی زاھی ——— کراچی**

ڈیئر صالحہ آپی، نورین آپی اور ردا قارئین و رائٹرز کو زاہدہ ہاشمی کا پیار سے بھرا السلام علیکم! اسلامی سال سب کو مبارک ہو۔ اکتوبر کا ردا مجھے آج ملا اور مجھے انتظار اس کا 30 تاریخ سے ہوتا ہے۔ رانیہ خان کا جگمگاتا ٹائٹل دل خوش کر گیا اور "گوشۂ آگہی" کی تحریر میں موجود موتیوں نے ہمیشہ کی طرح دل کے تاروں کو چھولیا۔ آپی آپ اتنا زبردست لکھتی ہیں کہ بے اختیار ہی آپ پر رشک آتا ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی نئے لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے ایک روشنی ہے جو اندھیروں میں امید کی کرن ثابت ہوتی ہے۔ "ردائے جنت" سے ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ عروہ سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ ڈیئر ثناء کنول آپ کے خلوص اور محبت سے بھرے ایک جملے نے مجھے بہت خوش کیا اور آپ کی حوصلہ افزائی بہت اچھی لگی۔ بہت شکریہ۔ ابھی افسانے اور ناول نہیں پڑھے لیکن اتنا معلوم ہے کہ ہمارے نئے اور پرانے لکھنے والے زبردست لکھتے ہیں۔ تب ہی تو ان کے الفاظ ردا جیسے معیاری رسالے کی زینت بنتے ہیں۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ ہر ماہ سندیسے میں شامل ہوں مگر چاہنے کے باوجود لیٹ ہو جاتی ہوں۔ رابعہ افضال آپ کا بھی شکریہ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی ہی ہمیں مزید لکھنے پر اکسائے گی۔ میرے لیے یہی بات بہت ہے کہ میں ردا فیملی کا حصہ ہوں۔ جہاں خلوص و محبت کی بارش برستی رہتی ہے۔ بس ان ہی لفظوں کے ساتھ زاہدہ اجازت چاہے گی آپ سب اپنا بہت خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھنا۔ یکم محرم الحرام کو میری شادی کو 5 سال ہو گئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے پانچ صدیاں بیت گئی ہیں۔ میرے لیے خاص دعا کریں کہ اللہ مجھے اولاد عطا فرمائے، آمین ثمہ آمین۔

**رضوانہ آفتاب ——— کراچی**

ڈیئر صالحہ آپی اور نورین آپی کیسی ہیں آپ؟ یقیناً ٹھیک ٹھاک خوش باش ہوں گی۔ کافی دنوں کے بعد ایک عدد ناول کے ساتھ حاضر ہوں۔ تقریباً ڈیڑھ سال سے لکھنے کا سلسلہ موقوف کر رکھا تھا مگر اب دوبارہ سے لکھنے کا آغاز کیا ہے۔ امید نہیں یقین ہے ہر بار کی طرح اس بار بھی ردا میں جگہ ملے گی کیونکہ ردا ہمارا اپنا ردا جو ہے۔ لکھاری ساتھیوں کو بہت بہت سلام اور ان لوگوں کے لیے ڈھیروں دعائیں جو مجھے لکھنے کے لیے مسلسل اکساتے رہے۔ لکھنے کا سلسلہ موقوف تھا مگر ردا کو پڑھتی رہی ہوں۔ نئی لکھنے والی لڑکیاں بہت عمدہ لکھ رہی ہیں۔ قمروش شہک اور روشانے عبدالقیوم کو نئے سلسلے وار ناول لکھنے پر ڈھیروں مبارک باد اور باقی تمام لکھاری بہنوں کے لیے ڈھیروں

دعائیں، اجازت چاہوں گی۔"

**سفینہ خورشید ــــــــ کوٹری**

ڈھیر ساری دعاؤں، نیک تمناؤں اور محبت کی خوشبو سے مہکتا سلام الفت۔ سب سے پہلے تو اجازت چاہتی ہوں آپ کی محفل میں شرکت ہونے کی تھوڑی سی جگہ مل سکتی ہے کیا؟ "ہمیں مار گئی تیری چاہ پیا" فریدہ جی ناول کا بہت بہت اچھا اینڈ کیا۔ بہت مزا آیا۔ سچ فریدہ جی ایسے ہی لکھتے رہیے گا۔ ابھی مختصر لکھ رہی ہوں اگر آپ نے جگہ دی تو انشاء اللہ آگے ضرور حاضر ہوں گے۔

**ثوبیہ جواد ــــــــ گجرات**

میری طرف سے پیاری صالحہ آپی اور اسٹاف کو چاہت سے بھرپور سلام۔ ماہِ اکتوبر 2016ء کا ردا ڈائجسٹ ہنستا مسکراتا پھول جیسی تازگی لیے ہزاروں رنگ بکھیرتا 10 تاریخ کو ہمارے گھر کی دہلیز پر اپنا پیارا قدم رکھ چکا تھا۔ جلدی جلدی سے لفافہ کھولا۔ ردا ڈائجسٹ کو سینے سے لگا کر چوما۔ ٹائیٹل پر ماڈل رانیہ کی تصویر بہت پیاری لگ رہی تھی۔ "گوشۂ آگہی" کا ہر لفظ خوشبو کی طرح دل میں اتر گیا۔ "ردائے جنت" ہمیشہ کی طرح ایمان تازہ کر گیا۔ عروہ سے ملاقات کر کے بہت مزہ آیا۔ اب آتے ہیں سلسلے وار ناول کی طرف۔ سلسلہ وار ناول میں "دیدۂ عبرت نگاہ" کی دوسری قسط پڑھی۔ مجھے بہت پسند آئی۔ مکمل ناول میں "کوہ عشق" ثناء ناز بہت پسند آیا۔ ناولٹ دونوں بہت اچھے تھے۔ افسانوں میں فاطمہ خان، قرۃ العین، جویریہ بانو، صبا خان اور فرح ناز بازی لے گئیں۔ باقی سسٹرز نے اچھے افسانے لکھے۔ اب تشریف کا ٹوکرا لاتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف۔ "ردا کی ڈائری" میں ایم جے قریشی نے کیا خوب لکھا۔ باقی سب سسٹرز نے اچھا انتخاب کیا۔ اشعار میں امبرین حیدر، پلوشہ، بازی لے گئیں۔ "اس ماہ میں" "اس ماہ کے اقوال میں نے بہت خوب صورت لگا۔ اس ماہ کا شعر روشنی فاطمہ فیصل کے قلم سے بہت پسند آیا۔ اریشہ کے قلم سے اس ماہ کی نظم اور اس ماہ کا فلسفہ، ایس امتیاز احمد کے قلم سے بہت خوب صورت تھے۔ "خوشبو" میں تمام ردا فرینڈز نے بہت خوب صورت لکھا۔ "ذرا پھر سے کہنا" نظیر فاطمہ اور صابر حسین صابر بازی لے گئے۔ سب بہنوں کے سندیسے اچھے تھے۔ سب دوستوں کے پیغام بہت اچھے تھے۔ "کچن" میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ "سنگھار" سے بہت فائدہ حاصل کیا۔ اتنے لمبے تبصرے کے ساتھ اب اجازت چاہتی ہوں۔ ماہ نومبر تک کے لیے اجازت اللہ دی امان۔"

**گیتی آراء ــــــــ کراچی**

پیاری آپی اور ڈیئر نورین السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ اللہ آپ سب کو خوش آباد رکھے، آمین۔ 18 اکتوبر کو ردا ملا تو انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور مرجھائے ہوئے چہرے پر بہار سی آ گئی۔ سب سے پہلے تو سرورق کی ماڈل رانیہ خان کے حسن میں ایک لمحے کو کھو کر رہ گئے۔ آگے چل کر "گوشۂ آگہی" کی دلچسپ سبق آموز باتوں سے لطف اندوز ہو کر آگے بڑھے۔ "ردائے جنت" کی خوب صورت دینی باتیں ہماری منتظر تھیں۔ ادلے بدلے کی شادی، پڑوسی کے حقوق، جائیداد کی ملکیت وغیرہ سے متعلق دینی معلومات سے مستفید ہوتے آگے بڑھے تو خوب صورت آرٹسٹ عروہ سے ملاقات دلچسپ رہی۔ آگے چل کر "صحراؤں کی گلیوں میں عشق" کی دوسری قسط نے ہمیں اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ غنویٰ کے اندر تبدیلی اور شادی کے لیے تیار ہو جانا اور تجسس بڑھا گیا۔ ازبیلا کا کردار بھی خاصا دلچسپ جا رہا ہے۔ آگے چل کر عائشہ فاروق کی "اعتبار محبت" بھی ایک دلچسپ

تحریر تھی۔ فاطمہ خان کی ”ہے محبت کی گواہی کافی“ کے طرز تحریر اور انداز تحریر متاثر کن تھا۔ خوب صورت لفظوں کی جادوگری متاثر کر گئی۔ قرۃ العین کی اداسی ”پیراہن اپنا“ اپنے نام کی طرح دکھی کر دینے والی تحریر ہمیں بھی اداس کر گئی۔ عائشہ ذوالفقار کی ”زندگی کے رنگ“ کا فلسفہ دل کو بھا گیا۔ زندگی کو اپنے فلسفے کے حساب سے کھل کر جیو کیا پتا کب راستے میں کوئی محبت، مجبوری یا سمجھوتا آجائے اور فلسفہ تبدیل کرنا پڑے۔ مریم فاطمہ کی ”جسے چاہا تھا“ ایک دلچسپ تحریر تھی۔ شازیہ مصطفیٰ تو ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنے خوب صورت ناول ”زندگی، پھول، محبت اور خوشبو“ اپنے قارئین کے دل پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوتی نظر آرہی ہیں۔ حنا اصغر کی ”زرد پتوں کا موسم“ اپنے خوب صورت نام کی طرح ایک منفرد اور اچھی تحریر تھی۔ مریم شیراز کی ”رشتوں کی ڈور“ ایک خوب صورت سبق آموز تحریر تھی۔ جویریہ کی ”سوتیلی“ ٹاپک پرانا ہونے کے باوجود انداز نیا اور دلچسپ رہا۔ صبا کی ”قسمت“ بھی اچھی رہی۔ حورینہ کی ”خوشبو کا حصار“ لائف بوائے کی تحریر ہمیشہ کی طرح یہ بھی دلچسپ رہی۔ فرح ناز رفیق کی ”ذات نمو انسانیت“ فرسودہ روایات کے خلاف لکھی ایک زبردست بہترین تحریر تھی۔ پڑھ کر مزہ آگیا۔ روشانے کی ”دیدۂ عبرت نگاہ“ کی دوسری قسط بھی خاصی دلچسپ رہی۔ چچی زبیدہ بیگم کی حرم کے لیے نرم دلی اچھی لگی۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ ”ردا کی ڈائری“ میں نوشی گیلانی کا کلام اچھا رہا۔ نورین ملک کے انتخاب سے سجا ”اس ماہ میں“ کا جواب نہیں ہر تحریر اپنی مثال آپ رہی ہمیشہ کی طرح۔ اور یہی بات ”خوشبو“ کی ہے۔ احادیث سے لے کر لطائف تک اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ اور اب باری تھی ”ذرا پھر سے کہنا“ نظیر فاطمہ کی ”میں نے دیکھی تو نہیں کربلا“ کے ساتھ ساتھ بھی کلام شاعری بہترین تھے۔ خاص کر نظیر فاطمہ کے کلام کا تو جواب ہی نہیں۔ کیا خوب کلام ہے جو دل میں اترتا ہی چلا گیا اور اب باری تھی اپنے من پسند صفحے ”سندیسے“ کی تو جناب پیاری افشاں علی، ثناء کنول اور شہلا گل ہمیں سندیسے میں یاد رکھنے اور عزت افزائی کے لیے شکریہ۔ صدا خوش رہو اور پیاری سی گڑیا شہلا گل سحر میں نے تو یونہی مذاقاً تمہیں پیار سے چھیڑا تھا ایسی کوئی بات نہیں کیتی تو جی ہی تم لوگوں کی محبتوں چاہتوں کی چھاؤں میں رہی۔ تم لوگوں کا پیار ہے تو میں ہوں۔ ”دوستوں کے نام پیغام“ میں پیاری ثناء کنول ہمیں یاد رکھنے اور اتنے ڈھیر سارے پیار کے لیے بہت بہت شکریہ صدا خوش رہو مسکراتی رہو، آمین۔ ”کچن“ کے تمام پکوان بہترین تھے۔ ”سنگھار“ نے بھی اپنے فرائض خوب نبھائے۔ اب اجازت ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔

**نور بلنو ——— کوئٹہ**

پیاری آپی آداب اور تمام رائٹرز اور قارئین کو بھی سلام۔ اس ماہ 6 تاریخ کو ہی ردا مل گیا تھا۔ فہرست میں رائٹرز کی ایک بڑی تعداد کو دیکھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔ شازیہ مصطفیٰ اور قمر وش آپی دونوں اپنے مخصوص اسٹائل میں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ثناء ناز کا مکمل ناول بھی اچھا ہے۔ فریدہ فرید کے مکمل ناول کا اینڈ بہت شاندار تھا۔ روشانے کا سلسلہ وار بھی اچھا جا رہا ہے۔ ردا کے مستقل سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح بہت اچھے تھے جن سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

……☆……

# دوستوں کے نام پیغام

## میری سوئیٹ سی سسٹر انعم خان کے نام

میری سوئیٹ اینڈ کیوٹ سی سسٹر انعم کی برتھ ڈے ہے۔ میری طرف سے میری پیاری سی بہن کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ میری طرف سے میری بہن کے لیے اک چھوٹی سی دعا

تمہارے چاروں اور
ستاروں کی جھلملاہٹیں ہوں
تمہارے لبوں پر ہر دم ہی
مسکراہٹیں ہوں
تمہاری آنکھوں کی دہلیز پر رقص کرتی
آسودگی کی جگمگاہٹیں ہوں
تم ہر دم مہکو گلاب کی طرح
تمہیں کبھی کوئی غم نہ ستائے
تمہاری زیست کا ہر لمحہ مسکرائے
(آمین)

رابعہ افضال خان۔ کراچی

## میرے پیارے ابو جان کے نام

آہ اگر چہ چھوڑ کے چلے گئے ہمیں محمد ایاز
اور بظاہر کر لیا سبھی سے انہوں نے اغماض
مگر مہکتے رہیں گے وہ ہر محبت بھرے دل میں
خوشبو دے گی سدا ان کی زندگی کی بیاض
ان کے حسن سلوک کے تو معترف تھے سبھی
کر نہ سکے دشمن بھی کبھی ان پر اعتراض
وہ مقیم تھے ہر دل میں جو مقام تھا ان کا
یہ جانتا تھا اچھی طرح وقت کا نباض
وقت کہاں سے لائے گا اب ان جیسا خرم
مونس و مشفق و مہرباں و محترم اور فیاض
(سید شہزاد خرم)

میرے والد محترم ایاز احمد زرگر جن کو مجھ سے بچھڑے ہوئے جولائی 2016ء میں 20 سال ہو گئے۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، (آمین)۔

شائقہ ایاز۔ لیہ

## حکومت پاکستان کے نام

اب تیری یاد سے وحشت نہیں ہوتی مجھ کو
زخم کھلتے ہیں تو اذیت نہیں ہوتی مجھ کو
اب کوئی آئے چلا جائے میں خوش رہتا ہوں
اب کسی شخص کی عادت نہیں ہوتی مجھ کو
ایسا بدلا ہوں تیرے شہر کا پانی پی کر
جھوٹ بولوں تو ندامت نہیں ہوتی مجھ کو
ہے امانت میں خیانت سو کسی کی خاطر
کوئی مرتا ہے تو حیرت نہیں ہوتی مجھ کو
اتنا مصروف ہوں جینے کی ہوس میں محسن
سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ہوتی مجھ کو
(محسن نقوی)

ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان

## قرۃ العین چنا کے نام

السلام علیکم ڈیئر! آپ سے پہلی بار مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ سال سے کسی نہ کسی وجہ سے ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں ہونے کے باوجود ملاقات نہیں ہو پائی۔ میری خواہش ہے کہ آپ دوبارہ سے لکھنے کا آغاز کریں۔ آپ بہت مصروف زندگی گزار رہی ہیں۔ اس کے باوجود بھی لکھنے کے لیے تھوڑا سا وقت ضرور نکالیں۔ مجھے بالکل بھی نہیں پتا تھا افزاء چنا آپ کی بہن ہیں۔ ردا میں، میں نے انہیں بھی پڑھا ہے اقراء چنا کے لیے بھی ڈھیروں دعائیں۔ آپ دونوں سدا خوش رہیں، آمین۔

رضوانہ آفتاب۔ کراچی

## مسٹر اینڈ مسز رؤف عالم کے نام

سید محمد یحییٰ صاحب کے خاندان کے تمام افراد جنہوں نے حج اور عمرے کی ادائیگی کی ہے، ان تمام افراد کو میری اور میرے ہسبینڈ کی طرف سے حج اور عمرے کی دلی مبارک باد قبول ہو۔ اللہ آپ کو ایسی ہزاروں خوشیاں اور مبارک ساعتیں دیکھنا نصیب کرے، آمین۔

گیتی آراء۔ کراچی

## ملک جواد نواز کے نام

تجھے بھی یاد آئے گا مجھے بھی یاد آئے گا
دسمبر جاتے جاتے اپنی یادیں چھوڑ جائے گا
ہماری دوستی کو ضبط کی میزان میں رکھ کر
تمہیں بھی آزمائے گا مجھے بھی آزمائے گا
نہ اس کی دوستی اچھی نہ اس کی دشمنی اچھی
دسمبر دیکھ لے جاتے جاتے بھی ستائے گا
تمہیں پہلے بھی کہتا تھا یہ ہم دونوں کا دشمن ہے
دسمبر آتشِ فرقت میں دونوں کو جلائے گا
سکون جواد یہ برباد کر ڈالے گا دونوں کا
کبھی تم کو رلائے گا کبھی مجھ کو رلائے گا
دسمبر جاتے جاتے اپنی یادیں چھوڑ جائے گا

توبیہ جواد۔ گجرات

## شازیہ مصطفیٰ اور صالحہ آپی کے نام

شازیہ آپی اور صالحہ آپی! آپ دونوں میری بہت فیوریٹ ہیں۔ آپ کی تحاریر مجھے بہت پسند ہیں۔ شازیہ آپی آپ جتنا شوخ انداز میں لکھتی ہیں صالحہ آپی کا انداز تحریر اتنا ہی سنجیدہ اور زندگی کی الجھی ڈور کو سلجھاتا ہوا ہمیں سمجھاتا ہوا لگتا ہے۔ آپ اپنی کامیابیوں کا سفر یونہی جاری و ساری رکھیں۔

نوشین مدثر۔ لاہور

## پیاری سہیلیوں کے نام

### وہ پل

مل کے بیٹھتے تھے ہم سب ساتھ ساتھ
وہ پَل بھی آخر چلے گئے
جاتے تھے ہم سب کینٹین ساتھ ساتھ
وہ پَل بھی آخر چلے گئے
کرتے تھے مستیاں ہم لیکچر کے دوران
وہ پَل بھی آخر چلے گئے
کبھی دکھ سکھ بانٹا کرتے تھے
کبھی کوئی کھیل کھیلا کرتے تھے
وہ پَل بھی آخر چلے گئے
جو لوٹ کے نہ آئیں گے کبھی مسکان
یاد آئیں گے سدا بے حساب وہ لمحے دوست
جن میں تھے ہم سب ساتھ ساتھ
وہ پل بھی آخر چلے گئے

نمرہ نعیم۔ کراچی

ثریا اقبال

# کچن

## روسٹ چکن ود براؤن ساس

اجزاء

| | |
|---|---|
| مرغی کے ٹکڑے آٹھ عدد | : ایک کلو |
| پسا ہوا لہسن ادرک | : ایک چائے کا چمچہ |
| پیاز (باریک کٹی ہوئی) | : تین کھانے کے چمچے |
| پسی ہوئی لال مرچ | : ایک چائے کا چمچہ |
| کٹی ہوئی کالی مرچ | : آدھا چائے کا چمچہ |
| ٹماٹو کیچپ | : تین کھانے کے چمچے |
| مسٹرڈ پیسٹ | : آدھا چائے کا چمچہ |
| پانی | : ایک پیالی |
| نمک | : ایک چائے کا چمچہ |
| تیل | : دو کھانے کے چمچے |
| فرنچ فرائز اور ابلی ہوئی سبزیاں | : پیش کرنے کے لیے |

براؤن ساس کے اجزا:

| | |
|---|---|
| میدہ | : دو کھانے کے چمچے |
| مرغی کی یخنی | ایک پیالی |
| ٹماٹو کیچپ، ووسٹر شائر ساس | : ایک، ایک کھانے کا چمچہ |
| کٹی ہوئی کالی مرچ، نمک | : ڈیڑھ ڈیڑھ چائے کا چمچہ |
| مکھن | : ایک کھانے کا چمچہ |

ترکیب: دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاس سنہری کریں اور مرغی ڈالیں اور رنگ تبدیل ہونے تک بھونیں۔ اس میں لہسن ادرک، کالی مرچ، پانی اور نمک ڈال کر مرغی کے گلنے تک پکائیں۔ اس میں لال مرچ، مسٹرڈ پیسٹ اور ٹماٹو کیچپ ڈال کر پانی خشک کریں اور ڈش میں نکالیں۔ براؤن ساس بنانے کے لیے مکھن گرم کریں اور اس میں میدہ، کالی مرچ اور نمک ڈال کر بھونیں، پھر باقی اجزا ڈال کر چند منٹ تک پکائیں اور مرغی کے اوپر ڈال دیں۔ اسے سبزیوں اور فرنچ فرائز کے ہمراہ پیش کریں۔

## چکن تکہ ہانڈی

اجزاء:

| | |
|---|---|
| مرغی کی بوٹیاں (بغیر ہڈی) | : آدھا کلو |
| دہی (پھینٹی ہوئی) | : ایک پیالی |
| پیاز | : دو عدد |
| پسا ہوا لہسن ادرک | : ایک کھانے کا چمچہ |
| پسا ہوا گرم مصالحہ | : ایک چائے کا چمچہ |
| کھانے کا اورنج رنگ | : ایک چٹکی |
| پسی ہوئی لال مرچ | : ایک چائے کا چمچہ |
| کٹی ہوئی لال مرچ | : ایک چائے کا چمچہ |
| لیموں کا رس | : پون پیالی |
| ہری مرچیں (چوپ کی ہوئی) | : دو عدد |
| ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا) | : دو کھانے کے چمچے |
| نمک | : ایک چائے کا چمچہ |
| تیل | : پون پیالی |
| بڑی والی ہری مرچ، مولی | : سجانے کے لیے |

ترکیب: بلینڈر میں پیاز کو پون پیالی پانی ڈال کر

پیس کر نکال لیں۔ اس میں لہسن ادرک، کھانے کا رنگ، گرم مصالحہ، لیموں کا رس، پسی اور کٹی ہوئی لال مرچ، ہری مرچیں، دہی اور نمک ملا دیں۔ اس آمیزے کو مرغی کی بوٹیوں پر لگا کر آدھا گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ مٹی کی ہانڈی میں تیل گرم کر کے مصالحہ لگی مرغی کی بوٹیاں ڈالیں اور ہلکی آنچ پر گوشت گلنے تک پکائیں۔ تیل اوپر آجائے تو ہرا دھنیا چھڑکیں، اسے ہری مرچ اور مولی سے سجا کر پیش کریں۔ چاہیں تو کوئلے کا دھواں دے دیں۔

## مرچوں والے چائنیز آلو

اجزاء

| | |
|---|---|
| آلو | : چار عدد |
| میدہ | : ایک کھانے کا چمچہ |
| کارن فلور | : ایک کھانے کا چمچہ |
| لہسن (چوپ کیا ہوا) | : ایک چائے کا چمچہ |
| سویا ساس | : ایک کھانے کا چمچہ |
| سفید سرکہ | : ایک کھانے کا چمچہ |
| چینی | : 1/4 چائے کا چمچہ |
| شملہ مرچ (چوپ کی ہوئی) | : ایک عدد |
| پیاز (باریک کٹی ہوئی) | : ایک عدد |
| ہری مرچیں (لمبائی میں کٹی ہوئی) | : چھ عدد |
| کٹی ہوئی لال مرچ | : ایک چائے کا چمچہ |
| ٹماٹو کیچپ | دو چائے کے چمچے |
| کارن فلور (پانی میں گھلا ہوا) | ایک چائے کا چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| تیل (تلنے کے لیے) | دو کھانے کے چمچے |

ترکیب: آلوؤں کو اتنا ابالیں کہ ان میں تھوڑا سا کچا پن رہ جائے۔ ان کے لمبائی میں موٹے ٹکڑے کاٹیں، پھر میدہ اور کارن فلور چھڑک دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور آلو سنہری تل کر جاذب کاغذ پر نکال لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے لہسن بھونیں۔ اس میں شملہ مرچ، پیاز، سویا ساس، سرکہ، چینی، لال مرچ، ٹماٹو کیچپ اور نمک ڈال کر تیز آنچ پر بھونیں۔ اس میں پانی ڈال کر ابال آنے دیں، پھر چمچہ چلاتے ہوئے کارن فلور شامل کریں۔ چند منٹ پکا کر اس میں آلو اور ہری مرچیں ملا کر ڈش میں نکال لیں۔

## فرائیڈ پنیر

اجزاء

| | |
|---|---|
| پنیر (چوکور کٹا ہوا) | : سات سو گرام |
| بیسن (چھنا ہوا) | : ایک پیالی |
| میدہ (چھنا ہوا) | : حسب ضرورت |
| ہرا دھنیا | : پون گڈی |
| پودینہ | : پون گڈی |
| پسا ہوا سفید زیرہ | : ایک چائے کا چمچہ |
| کٹا ہوا سفید زیرہ | : پون چائے کا چمچہ |
| اجوائن | : آدھی چائے کا چمچہ |
| پسی ہوئی ہلدی | : ایک چائے کا چمچہ |
| کٹی ہوئی لال مرچ | : ایک کھانے کا چمچہ |
| نمک | : حسب ذائقہ |
| تیل | : تلنے کے لیے |
| پسی ہوئی لال مرچ | : چھڑکنے کے لیے |
| کھیرے، ٹماٹر (چوکور کٹے ہوئے) | : ہمراہ پیش کرنے کے لیے |
| سلاد پتے، کھیرے | : سجانے کے لیے |

ترکیب: ایک پیالے میں میدے اور پنیر کے علاوہ باقی تمام اجزا ملائیں اور پانی ڈال کر گاڑھا آمیزہ بنا لیں۔ پنیر کے ٹکڑوں کو پہلے آمیزے، پھر میدے میں لپیٹیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور انہیں سنہری تل کر نکال لیں۔ پنیر کے ایک ٹکڑے پر ٹوتھ پک لگائیں۔ اس پر ایک، ایک ٹکڑا کھیرا اور ٹماٹر لگا دیں۔ اس عمل کو دہراتے ہوئے باقی پنیر بھی تیار کر لیں۔ سرونگ پلیٹ کو سلاد پتے اور کھیرے سے سجائیں۔ اس پر پنیر رکھیں اور لال مرچ چھڑک کر پیش کریں۔

## کنٹری چائنیز مچھلی

اجزاء

| | |
|---|---|
| مچھلی کے بڑے ٹکڑے (قتلے) | دوکلو |
| شملہ مرچ (باریک کٹی ہوئی) | ایک عدد |
| گاجر (چھوٹی کٹی ہوئی) | ایک عدد |
| ہری مرچیں | چار عدد |
| ادرک (چوپ کیا ہوا) | ایک درمیانہ ٹکڑا |
| لہسن (چوپ کیا ہوا) | چار جوے |
| انڈہ | ایک عدد |
| ٹماٹو کیچپ | چار کھانے کے چمچے |
| میدہ | چار کھانے کے چمچے |
| کارن فلور (پانی میں گھلا ہوا) | دو کھانے کے چمچے |
| ووسٹر شائر سس | دو کھانے کے چمچے |
| اویسٹر سس | دو کھانے کے چمچے |
| سوکھی گول لال مرچیں | سات عدد |
| پسی ہوئی کالی مرچ | پون چائے کا چمچہ |
| پسی ہوئی سفید مرچ | پون چائے کا چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| تیل (تلنے کے لیے) | دو کھانے کے چمچے |

ترکیب: مچھلی کے چھوٹے چوکور ٹکڑے کاٹیں، ان پر کالی مرچ، انڈہ، میدہ اور نمک لگا کر 1/2 گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور مچھلی کے ٹکڑے سنہری تل کر نکال لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے ادرک اور لہسن سنہری ہونے تک بھونیں۔ اس میں تمام سبزیاں ڈال کر 2 منٹ تک پکائیں، پھر کارن فلور کے علاوہ باقی تمام اجزا ڈال کر چند منٹ تک پکائیں۔ چمچہ چلاتے ہوئے آہستہ آہستہ کارن فلور ڈال کر ساس کو گاڑھا کریں اور مچھلی ملا کر ڈش میں نکال لیں۔

## اسٹرابیری چیز کیک

اجزاء

| | |
|---|---|
| ڈائجسٹو بسکٹس (چورہ کیے ہوئے) | دوسوگرام |
| مکھن (پگھلا ہوا) | سوگرام |
| تازہ دودھ | ایک پیالی |
| انڈے | دوعدد |
| چینی | دس کھانے کے چمچے |
| کارن فلور | ایک چائے کا چمچہ |
| دہی | ایک پاؤ |
| جیلیٹن (پانی میں گھلا ہوا) | تین چائے کے چمچے |
| تازہ کریم (پھینٹی ہوئی) | دوسوگرام |
| اسٹرابیری ایسنس | ایک چائے کا چمچہ |
| اسٹرابیریز (پسی ہوئی) | ایک پیالی |
| اسٹرابیری جیلی کرسٹلز | 175 گرام |
| کریم، اسٹرابیریز (باریک کٹی ہوئی) | سجانے کے لیے |

ترکیب: جیلیٹن کو پون پیالی پانی میں بھگو کر رکھ دیں۔ جب پھول جائے تو ایک منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر پکالیں۔ دہی کو ململ کے کپڑے میں باندھ کر تھم سے چار گھنٹوں کے لیے بیسن کے اوپر لٹکا دیں، پھر ہاتھ سے دبا کر پانی نکال دیں۔ بسکٹس میں مکھن ملا کر ہاتھ سے یکجان کریں۔ نوانچ کے اسپرنگ فوم میں آمیزہ ڈالیں اور پہلے سے گرم اوون میں 180 ڈگری سینٹی گریڈ پر دس منٹ پکا کر نکال لیں۔ انڈوں کی سفیدی اور زردی علیحدہ کر لیں۔ ساس پین میں زردی، دودھ، کارن فلور اور آدھی چینی ڈالیں۔ اسے ہلکی آنچ پر مسلسل چلاتے ہوئے گاڑھا ہونے تک پکائیں، اس میں جیلیٹن ملا کر رکھ دیں۔ الیکٹرک بیٹر کی مدد سے سفیدیوں کو جھاگ بننے تک پھینٹیں، باقی چینی تھوڑی تھوڑی کر کے شامل کریں۔ الیکٹرک بیٹر کی مدد سے ایک پیالے میں پنیر، تیار کسٹرڈ، اسٹرابیریز اور ایسنس یکجان کر لیں۔ اس میں سفیدیاں چمچے سے ملا لیں۔ آمیزے کو سانچے میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں۔ تھوڑے سے گرم پانی میں جیلی کرسٹلز گھول کر کیک پر ڈالیں اور سیٹ ہونے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ جیلی جم جائے تو کریم اور اسٹابیریز سے سجا دیں اور خوب ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔☆

# سنگھار

آج ہم آپ کو ساڑھی پر ایسا میک اپ بتا رہے ہیں جو ہر خواتین آرام سے خود کر سکتی ہیں۔

چہرہ:

میک اپ کرنے سے پہلے کلینزنگ ٹوننگ اور موئسچرائزنگ کا عمل مکمل کریں۔

اب فاؤنڈیشن جو آپ کی رنگت کے مطابق ہو منتخب کریں کنسیلر لگا کر چہرے کے داغ دھبے چھپا لیں اس کے بعد لوز پاؤڈر لگا کر میک اپ بیس سیٹ کرلیں۔

آنکھیں:

سب سے پہلے بھنوؤں کی ہڈی پر ہلکا سا گلیٹر آئی شیڈ لگائیں اس کے بعد پپوٹوں پر خاکی گولڈ شیڈ اپلائی کریں لیش کرلر کی مدد سے پلکوں کو کرل کرلیں اور ان پر مسکارہ لگائیں اس کے بعد آنکھوں پر آئی لائنر لگائیں آئی لائنر کو بیرونی طرف سے تھوڑا آنکھوں کے باہر کی طرف نکال کر اسے آنکھوں کے نچلے والے حصے سے ملا دیں پھر اس کے بعد آنکھوں میں کاجل پنسل لگائیں۔

رخسار:

گالوں پر ہلکا سا گلابی بلش آن لگائیں جیسے (لائٹ پنک، ڈیپ پیچ شیڈز) بلش آن کو گول برش کی مدد سے کان کی لو سے ناک کی سمت میں لگائیں ناک کی کنٹورنگ کے لیے ناک کے دونوں حصوں پر براؤن شیڈز برش کی مدد سے لگائیں۔ ناک کے درمیانی حصے پر اور گالوں اور پیشانی پر ہائی لائٹر کی مدد سے نمایاں کریں۔

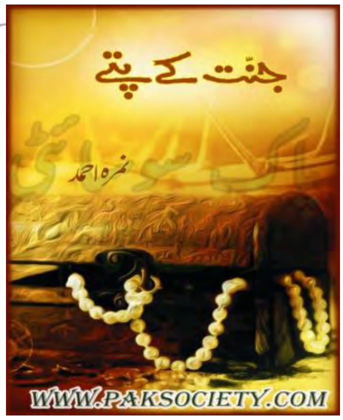
ہونٹ:

ہونٹوں پر ٹوتھ برش پھیر کر انہیں اسکرب کریں اس کے بعد لپ بام لگائیں۔ اس کے بعد لپ پرائمر لگائیں تاکہ آپ کی لپ اسٹک دیر تک قائم رہے لپ اسٹک لگانے سے پہلے لپ پنسل کی مدد سے آؤٹ لائن بنائیں تاکہ ہونٹ نمایاں ہوجائے پھر (Coral Pink) شیڈ کی لپ پنسل سے ہونٹوں پر آؤٹ لائن بنائیں اور لپ برش کے ذریعے اسی شیڈ کی لپ اسٹک لگا لیں اوپر ٹرانسپیرنٹ شمری لپ گلوس اپلائی کریں۔

ہیئر اسٹائل:

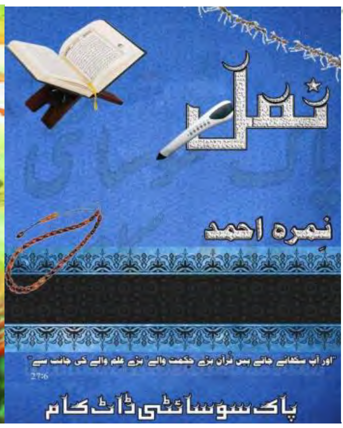
اگر ساڑھی کا بلاؤز کالر والا ہے تو اس پر اونچی پونی بنا کر سائیڈوں سے بال نکال لیں۔ اور اگر بغیر کالر والا بلاؤز ہے تو سادہ سا جوڑا بنا لیں اس کے علاوہ آگے کے آدھے بالوں کو اٹھا کر پونی بنا کر اس کو جوڑے کی شکل میں لپیٹ دیں باقی بالوں کو کھلا چھوڑ دیں اس کے علاوہ تمام بالوں میں برش کر کے سائیڈ سے مانگ نکال لیں پھر سارے بالوں کو ایک سائیڈ پر لا کر پونی بھی بنا سکتی ہیں یا جوڑے کی شکل بھی دے سکتی ہیں آخر

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





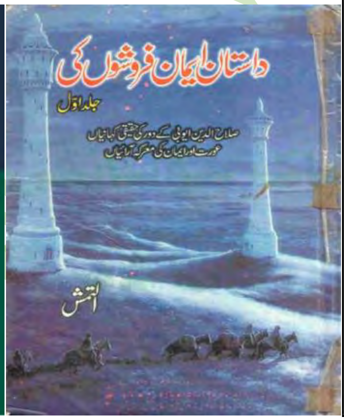






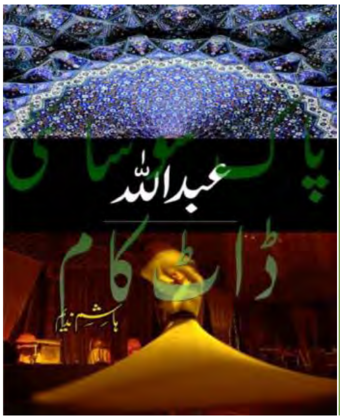


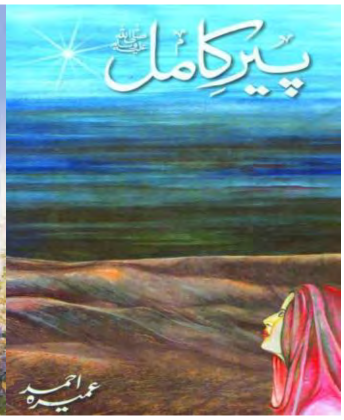




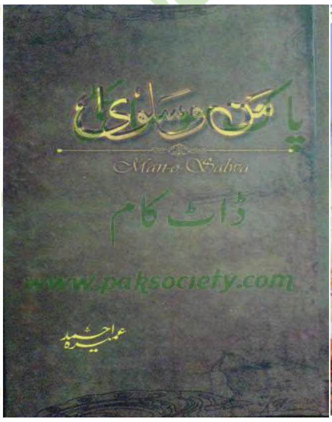




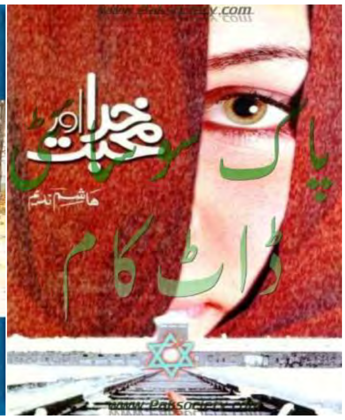


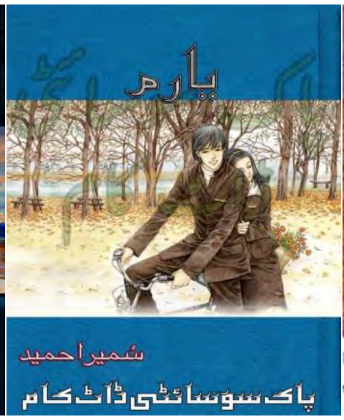






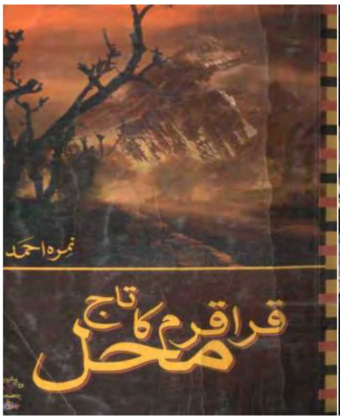










میں اسٹائل کو دیر تک قائم رکھنے کے لیے ہیئر اسپرے کریں۔

☆☆

## آلو، پیاز:

روزمرہ زندگی میں جو سبزی سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے وہ آلو، پیاز ٹماٹر ہیں، آلو پیاز ٹماٹر ہر گھر میں موجود ہوتے ہیں، پیاز کا استعمال جہاں خواتین کھانے میں کرتی ہیں، وہاں پیاز کے اور بھی فائدے ہیں اس سے آپ اپنے بال لمبے گھنے کرسکتی ہیں۔ اس کا پانی گنج پن کے لیے بھی مفید، آلو کا استعمال بھی بہت فائدہ مند ہے، آلو کے قتلے چہرے پر ملنے سے چہرہ تروتازہ نظر آتا ہے اور اس میں چھپا آئرن داغ دھبوں کو دور کرتا ہے۔ جلد کی حفاظت میں ٹماٹر اپنی ٹھنڈک سکڑنے والی خوبیوں کی بدولت بہت اہم ہے۔ یہ وٹامن سی سے بھرپور ہوتا ہے۔ جو کیل مہاسوں کو ختم کر کے جلد کو چمکدار اور پرکشش بناتا ہے۔

## نیچرل بلیچ آلو سے:

ایک چھوٹا آلو چھیل کر اس کا پیسٹ بنالیں اس میں ایک کھانے کا چمچہ بیسن ڈال کر مکس کردیں اس کے بعد اس میں آدھا لیموں نچوڑ لیں اور مکس کر کے چہرے ہاتھوں اور گردن پر تقریباً 15 منٹ کے لیے لگالیں اس کے بعد پانی سے دھولیں یہ عمل آپ ہفتے میں ایک بار ضرور کریں۔

## خشک جلد کے لیے آلو کا ماسک:

آلو کا پیسٹ ایک کھانے کا چمچہ، دہی ایک کھانے کا چمچہ دونوں کو مکس کر کے چہرے پر 15 سے 20 منٹ تک لگا رہنے دیں اس طرح آپ کی جلد نرم و ملائم اور رنگت نکھر جائے گی۔

اس کو آپ روزانہ استعمال کرسکتی ہیں۔

## آنکھوں کے حلقے کے لیے:

آلو کے قتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں اور چھیل کر اس کا رس آنکھوں کے چاروں اطراف لگائیں، اس طرح آپ کے حلقے ختم ہوجائیں گے۔

## آلو سے نیچرل کلر ڈائی:

2 عدد آلو کا جوس یا پیسٹ، کلونجی چند دانے، تھوڑا بھنگرا سیاہ (بوٹی) رتن جو ایک ایک کھانے کا چمچہ۔ سب سے پہلے ایک فرائی پین میں آلو کا پیسٹ ڈال لیں اس کے بعد بھنگرا سیاہ ڈال کر پکائیں اس کے بعد رتن جوڑال کر کر اتنا پکائیں کہ اُبال آجائے اس کے بعد اس کا پانی آپ اپنے بالوں پر لگائیں گی تو آپ کے بال سیاہ ہوجائیں گے۔

"جلد کو چمکدار کرنے کے لیے پیاز کا ماسک" ایک کھانے کا چمچہ پیاز کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچہ، بیسن، ایک چٹکی جائفل (چھلکا اتار کر اندر کے بیج پاؤڈر بنالیں) ایک کھانے کا چمچہ دودھ ان سب کو اچھی طرح مکس کر کے چہرے پر 20 منٹ کے لیے لگالیں اور پھر چہرے کی چمک دیکھیں۔

## گھنے بالوں کے لیے ماسک:

پیاز میں سلفر موجود ہوتا ہے جو بالوں کو لمبا گھنا اور مضبوط بناتا ہے، پیاز کا رس تین کھانے کے چمچے، شہد ایک کھانے کا چمچہ دونوں کو مکس کر کے سر پر لگائیں اور اس مکسچر سے سر کی مالش کریں اور ایک گھنٹے بعد سر کو دھولیں۔

......☆......